حکمتِ اختلاف

ضرورت، اہمیت اور دائرۂ کار

مولانا وحیدالدّین خاں

حکمتِ اختلاف

ضرورت، اہمیت اور دائرۂ کار

مولانا وحید الدّین خاں

Goodword Books

First published 2025
This book is copyright free

Hikmat-e-Ikhtilaf

Goodword Books
A-21, Sector 4, Noida-201301, Delhi NCR, India
Tel. +91 120 4131448, Mob. +91 8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

CPS International
Centre for Peace and Spirituality International
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013, India
Mob. +91-9999944119
e-mail: info@cpsglobal.org
www.cpsglobal.org

Center for Peace and Spirituality USA
2665 Byberry Road, Bensalem, PA 19020, USA
Cell: 617-960-7156
email: kkaleemuddin@gmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

مقدمہ

پہلا حصہ

اختلاف، تنوع 8

اختلاف کا معاملہ 9

اختلافِ رائے 10

تنقید کا عمل 11

ترکِ تعلق نہیں 12

اختلاف ایک مثبت ظاہرہ 13

ترقی کا راز 15

فکری تعدّد، فکری حریت 17

مخاصمت نہیں 18

اختلاف اور اتحاد 19

اختلاف، رواداری 20

آرٹ آف لائف 22

شکایت ختم کرنے کا طریقہ 23

تخلیق میں تنوع 24

پختگی کیا ہے 25

اختلاف ایک رحمت 26

اختلاف کو مینیج کرنا 27

ثالثی کا اُصول 28

آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ 30

اختلاف کا مسئلہ 31

رواداری کا اصول 33

اتحاد کی نفسیات 37

اختلاف کو حل کرنے کی تدبیر 38

آزادی کا دور 44

درست مشورہ 45

ایک مثال 46

حکمت کی بات 47

اختلاف نہیں 48

شکایت کا مزاج 49

اعتدال کا مطلب 51

معتصبانہ طرزِ فکر 52

اجتماعی کام کی اہمیت 53

اختلافِ کثیر 54

ایسی بحثیں نہ چھیڑو جو لوگوں کو 55

اللہ سے غافل کردے 55

نزاع کا مسئلہ 57

نزاع مینجمنٹ 58

مینجمنٹ نہ کہ ردعمل 59

منفی جذبات کی قربانی 60

اختلاف کے وقت 62

کامیابی کا راز 63
بلند فکری 64
امت میں اختلاف کا مسئلہ 65
تنقید و اختلاف 66
اختلاف ایک فطری معاملہ 68
اختلاف کا مسئلہ 69
وحدت، تنوع 71
علم کی دو قسمیں 72
اختلاف ایک صحت مند ظاہرہ 73
اختلاف ایک برکت 74
تفریق کا سبب 75
کلیات کے بجائے جزئیات 76
پانچ فقہی اسکول 79
فقہی مسائل میں اختلاف 85
موافقت، مخالفت 89
غیر فطری اختلاف 90
اختلاف کو نظر انداز کیجیے 92

دوسرا حصہ

مینج کرنا سیکھیے 98
اختلاف کے باوجود 99
آخرت رخی سوچ 100
اختلاف کے باوجود اعتراف 101
اختلاف کو مسئلہ نہ بنانا 102
وسیع تر مفاد 103
تنقید کو سن کر 104
ذہنی ارتقا کا ذریعہ 106
اختلاف، نفرت 107
اختلاف کے ساتھ اعتراف 108
اتحاد کی طاقت 109
اختلاف کو بھلا دیا 112
حل رخی پالیسی 113
ایک تقابل 114
عربوں کا مزاج 115
انگلینڈ، آئرلینڈ 116
اختلاف کے باوجود قدردانی 117
تم قیمتی آدمی ہو 119
استاد، شاگرد 120
اسکائی از دی لمٹ 121
چلو یہ بھی ٹھیک ہے 123
وسعت ظرفی 123
مغربی دنیا، مسلم ادارے 124
امریکا کی مثال 126

تیسرا حصہ

مشاہداتِ دنیا 128

چوتھا حصہ

تاثرات و تجربات 157

پانچواں حصہ

سوال و جواب 234

خاتمۂ کلام

اختلاف ایک آزمائش 279

مقدمہ

اختلاف، زندگی کی ایک ایسی ناقابلِ انکار حقیقت ہے جس سے راہِ فرار ممکن نہیں۔ اختلاف کا مطلب ہے: الگ رائے رکھنا، نظریاتی فرق رکھنا، جدا سوچنا۔ یہ انسان کی انفرادیت، شعور اور آزادیِ فکر کی علامت ہے۔ اگر سب انسان ایک ہی طرز پر سوچنے لگیں تو انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقائی سفر رک جائے۔ یہی اختلاف ہے جو تحقیق کو جنم دیتا ہے، نئے نظریات کو پروان چڑھاتا ہے، اور سچائی تک رسائی کے نئے دروازے کھولتا ہے۔

مشہور فقیہ و محدث امام سفیان ثوریؒ (161-97 ہجری) کا ایک قول اس حوالے سے نہایت بصیرت افروز ہے: "مَا اخْتَلَفَ فِيهِ الْفُقَهَاءُ، فَلَا أَنْهَى أَحَدًا مِنْ إِخْوَانِي أَنْ يَأْخُذَ بِهِ" (الفقیہ والمتفقہ، خطیب بغدادی، جلد 2، ص 135) یعنی "جس مسئلہ میں فقہا کا اختلاف ہو چکا ہو، اس میں میں اپنے ساتھیوں کو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ وہ دوسری رائے کو اختیار کریں۔"

اسی طرح میں وہ اپنے شاگردوں کو یہ نصیحت کیا کرتے تھے: "إِذَا رَأَيْتَ الرَّجُلَ يَعْمَلُ الْعَمَلَ الَّذِي قَدِ اخْتُلِفَ فِيهِ، وَأَنْتَ تَرَى غَيْرَهُ، فَلَا تَنْهَه" (الفقیہ والمتفقہ، خطیب بغدادی، جلد 2، ص 136)۔ یعنی "جب تم کسی شخص کو ایسے عمل پر کاربند دیکھو جس میں اختلاف واقع ہو چکا ہو اور تمہاری رائے اس کے خلاف ہو، تو اُسے منع مت کرو۔"

یہ اقوال اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اختلاف بذاتِ خود کوئی برائی نہیں۔ اختلاف اس وقت فساد بن جاتا ہے جب اس کے اظہار کا طریقہ غیر اخلاقی ہو— مثلاً الزام تراشی، نفرت، تعصب، اور طعن و تشنیع۔ ایسا رویہ نہ صرف دینی اصولوں کے خلاف ہے بلکہ عقل و دانش کے بھی منافی ہے۔ اس کے برعکس، اگر اختلاف کو نرمی، ادب، دلیل اور

وسعتِ نظر کے ساتھ برتا جائے تو یہ عمل معاشرتی ڈیولپمنٹ ،فکری ترقی اور سچائی کی تلاش میں مددگار بن جاتا ہے۔

علم کی دنیا میں جتنی بھی پیش رفت ہوئی ہے، وہ اسی فکری تنوع اور اختلافِ رائے کی بنیاد پر ممکن ہوئی۔ اختلاف ہمیں نئی جہات سکھاتا ہے، تعصّبات کو توڑتا ہے اور حقیقت کی گہرائی تک پہنچنے کے لیے بصیرت عطا کرتا ہے۔

زیرِنظر کتاب "حکمتِ اختلاف: ضرورت، اہمیت اور دائرہ کار" دراصل مولانا وحیدالدین خاں صاحب کے ان مضامین، سوال و جواب اور اقتباسات کا مجموعہ ہے، جو انہوں نے ماہنامہ الرسالہ میں شائع کیے یا اپنے سفرناموں اور ڈائریوں میں قلم بند کیے۔ مولانا نے اس اہم اور نازک موضوع پر نہایت متوازن، دلائل سے بھرپور اور حقیقت پسندانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ اس کتاب کو اختلاف جیسے حساس موضوع کو صحیح زاویے سے سمجھنے، اور اس کے مثبت و تعمیری پہلو کو عام کرنے میں ایک مشعلِ راہ بنائے۔ آمین

ڈاکٹر فریدہ خانم (چیف ایڈیٹر)
مولانا فرہاد احمد (ایڈیٹر)
ڈاکٹر ثانی اثنین خان (ناشر)

پہلا حصہ

اختلاف، تنوع

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے: إِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتَّى (92:4)۔ یعنی، تمہاری کوششیں الگ الگ ہیں۔ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے مختلف اجزا میں بہت زیادہ تنوع (diversity) پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود کائنات میں کامل توافق (harmony) موجود ہے۔ اس اعتبار سے کائنات ایک ماڈل ہے کہ کس طرح یہ ممکن ہے کہ کامل اختلاف کے باوجود آپس میں کامل اتحاد پایا جائے۔

انسانوں کے درمیان بھی اسی طرح اختلاف یا تنوع موجود ہے۔ مگر یہاں عملاً برعکس صورت حال پائی جاتی ہے۔ انسانوں کے درمیان اختلاف کی بنیاد پر ٹکراؤ ہے۔ اس کے نتیجہ میں انسانی سماج میں نفرت اور تشدد، یہاں تک کہ جنگ کی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔ کائنات کے دو حصوں میں یہ فرق کیوں۔ غیر انسانی حصۂ کائنات میں اختلاف کے باوجود اتحاد پایا جاتا ہے۔ جب کہ انسانی دنیا میں اختلاف لوگوں کے درمیان ٹکراؤ کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان اپنی خواہش پر چلتا ہے، کائنات کے ماڈل کو وہ نہیں اپناتا۔

کائنات کا ماڈل خالق کے تخلیقی منصوبہ پر مبنی ہے۔ خالق کی منشا کے مطابق مادی دنیا میں مختلف اجزا کے متحد اور متوافق عمل سے اعلیٰ نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ماڈل گویا ایک مظاہرہ ہے، جو بتاتا ہے کہ انسان بھی اسی یونیورسل ماڈل کو اختیار کرے۔ فطرت کے ماڈل کو اختیار کرنے ہی میں انسان کی اعلیٰ ترقی کا راز چھپا ہوا ہے۔

خالق نے انسان کو تنوع کے اصول پر پیدا کیا ہے۔ ہر عورت اور ہر مرد کے اندر الگ الگ صفات (qualities) پائی جاتی ہیں۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ اس تنوع سے ٹکرانے کے بجائے اویل (avail) کرنے کا آرٹ سیکھیں۔ اس طرح انسان کے تمام معاملات اسی

طرح درست طور پر قائم ہو جائیں گے، جیسا کہ بقیہ کائنات کے معاملات قائم ہیں۔ (سورۃ اللیل آیت 4 کا سبق)

اختلاف کا معاملہ

قرآن میں ایک حکم ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَنْ تُصِيبُوا قَوْماً بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ (49:6)۔ یعنی اے ایمان والو، اگر کوئی فاسق تمھارے پاس خبر لائے تو تم اچھی طرح تحقیق کرلیا کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی گروہ کو نادانی سے کوئی نقصان پہنچا دو، پھر تم کو اپنے کیے پر پچھتانا پڑے۔

قرآن کی اس آیت میں اجتماعی زندگی کا ایک اصول بتایا گیا ہے۔ وہ یہ کہ جب کوئی شخص کوئی اختلافی بات کہے تو سننے والے کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ اس کو بدنیتی کا معاملہ سمجھ لے، اور کہنے والے کو برا آدمی سمجھنے لگے۔ اس کے بجائے صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے معاملے کو تحقیق کا معاملہ سمجھا جائے، نہ کہ کسی شخص کے بارے میں رائے قائم کرنے کا معاملہ۔ کسی کے بارے میں رائے قائم کرنا صرف اتمام حجت کے بعد جائز ہے، اس سے پہلے نہیں۔

اصل یہ ہے کہ شکایت یا اختلاف کا سبب اکثر حالات میں بے خبری اور غلط فہمی ہوتا ہے۔ پیش آنے والے معاملہ کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہونے کی بنا پر لوگ مخالفانہ رائے قائم کر لیتے ہیں۔ کسی کے بارے میں اس طرح رائے قائم کرنا درست نہیں۔ اسلامی تعلیم کے مطابق، اتمام حجت سے پہلے تحقیق ہے، اور اتمام حجت کے بعد رائے قائم کرنا۔

اجتماعی زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف شکایت ہو جاتی ہے۔ یہ شکایت بڑھتے بڑھتے نفرت بن جاتی ہے، اور نفرت کے بعد مزید برائیاں

پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک دوسرے کو بدنام کرنا، ایک دوسرے کے خلاف الزام تراشی کرنا، ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ لینا۔ اس قسم کی اجتماعی خرابیوں کا سبب ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ لوگ تحقیق کے بغیر رائے قائم کرلیتے ہیں، وہ جو کچھ سنتے ہیں، اس کو درست سمجھ لیتے ہیں۔ اس طریقے کا نتیجہ بے حد سنگین ہے — دنیا میں ندامت اور آخرت میں مواخذہ۔

اختلافِ رائے

ایک بار میری ملاقات ایک مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ اہلِ مغرب کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: اختلافِ رائے (dissent) کو انسان کا مقدس حق قرار دینا۔ یہ بلاشبہ ایک درست بات ہے۔ لیکن وہ مغربی فکر کی بات نہیں، وہ فطرت کا ایک قانون ہے۔ اِس قانون کو ایک حدیث میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (کنز العمال، حدیث نمبر 28686)۔ یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اختلاف رائے کا اظہار ہمیشہ تنقید (criticism) کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر تنقید خواہ وہ کسی شخص کے حوالے سے کی گئی ہو، وہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے مطالعے کی ایک صورت ہوتی ہے۔ تنقید کا اصل مقصد کسی موضوع پر کھلے تبادلۂ خیال (open discussion) کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ تنقید کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ذہن (mind) دیانت دارانہ طور پر (honestly) اپنے نتیجۂ تحقیق کو بتائیں، اور پھر دوسرے لوگ دیانت داری کے ساتھ اُس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اِس طرح کا آزادانہ تبادلۂ خیال ذہنی ارتقا (intellectual development) کا لازمی تقاضا ہے۔

علم اپنی نوعیت کے اعتبار ایک لامحدود موضوع ہے۔ یہ بات مذہبی موضوع پر بھی اُسی طرح صادق آتی ہے، جس طرح سیکولر موضوع پر۔ اختلافِ رائے بلاشبہ ایک رحمت ہے۔

اختلاف رائے ہر حال میں مفید ہے۔ اِس معاملے میں اگر کوئی شرط ہے تو وہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اختلاف کرنے والا مسلّم دلیل کی بنیاد پر اختلاف کرے، وہ الزام تراشی کا طریقہ اختیار نہ کرے۔

اختلافِ رائے کے فائدے بے شمار ہیں۔ اِس سے زیر بحث مسئلہ کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اِس سے تخلیقی فکر (creative thinking) میں اضافہ ہوتا ہے۔ اِس کے ذریعے لوگوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ دوسرے کے نتیجۂ فکر سے فائدہ اٹھائیں۔ اِس سے زیرِ بحث مسئلہ کے ایسے گوشے سامنے آتے ہیں جو پہلے سے ظاہر نہیں ہوتے، وغیرہ۔

تنقید کا عمل

کبیر پندرہویں صدی کا ایک صوفی شاعر اور سنت تھا۔ اس نے اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو حکمت ونصیحت کا پیغام دیا ہے۔ اس کا ایک حکیمانہ دوہا ان الفاظ میں آیا ہے:

نندک نیرے راکھیے آنگن کٹی چھوائے　　　بِن صابن، پانی بنا، نرمل کرتا سبھائے

جو ہماری نندا کرتا ہے، اس کو سب سے قریب رکھنا چاہیے وہ تو بغیر صابن اور بغیر پانی ہماری کمیوں کو بتا کر ہمارے سبھاؤ کو درست کرتا ہے۔

نندا کرنا، یعنی تنقید کرنا۔ تنقید ایک مسلسل احتساب کا عمل ہے۔ تنقید زندہ معاشرے کی علامت ہے۔ جس سماج میں تنقید اور اختلاف کو سننے کا مزاج ہو وہ معاشرہ ذہنی اور فکری ترقی کرتا رہتا ہے۔ ایک بار میں نے ایک مغربی اسکالر سے پوچھا کہ اہلِ مغرب کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا— اختلافِ رائے (dissent) کو انسان کا مقدس حق قرار دینا۔

اختلافِ رائے کا اظہار ہمیشہ تنقید (criticism) کی صورت میں ہوتا ہے۔ تنقید کا

اصل مقصد کسی موضوع پر کھلے تبادلۂ خیال (open discussion) کا آغاز کرنا ہوتا ہے۔ تنقید کا مقصد یہ ہے کہ مختلف ذہن (mind) دیانت دارانہ طور پر (honestly) اپنے نتیجۂ تحقیق کو بتائیں اور پھر دوسرے لوگ دیانت داری کے ساتھ اُس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ اِس طرح کا آزادانہ تبادلۂ خیال ذہنی ارتقا (intellectual development) کا لازمی تقاضا ہے۔

اس حقیقت کو صحابی رسول ابوہریرہ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ایک مومن اپنے بھائی کے لیے آئینہ ہے۔ اگر وہ اس میں کوئی عیب دیکھے تو وہ اس کی اصلاح کرے — الْمُؤْمِنُ مَرْآةُ أَخِيهِ، إِذَا رَأَى فِيهَا عَيْبًا أَصْلَحَهُ (الادب المفرد للبخاری، حدیث نمبر 238)۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کا گروہ ایک دوسرے کو خیر خواہی کے ساتھ برائیوں سے روکے اور اچھائی کی نصیحت کرتا رہے۔ اس کی وجہ سے ہر مومن کے لیے یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمیوں کو پہچان کر درست راستے پر قائم رہ سکے۔

ترکِ تعلق نہیں

ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے:

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَبَاغَضُوا، وَلَا تَحَاسَدُوا، وَلَا تَدَابَرُوا، وَكُونُوا عِبَادَ اللَّهِ إِخْوَانًا، وَلَا يَحِلُّ لِمُسْلِمٍ أَنْ يَهْجُرَ أَخَاهُ فَوْقَ ثَلَاثِ لَيَالٍ، يَلْتَقِيَانِ فَيَصُدُّ هَذَا وَيَصُدُّ هَذَا، وَخَيْرُهُمَا الَّذِي يَبْدَأُ بِالسَّلَامِ (مسند احمد، حدیث نمبر 13354)۔ یعنی انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو، ایک دوسرے سے حسد نہ رکھو، ایک دوسرے کی برائی نہ کرو، اللہ کے بندو!

بھائی بھائی بن جاؤ، اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے بھائی سے تین رات سے زیادہ ترک تعلق کرے، دونوں ملیں تو یہ ایک طرف ہو جائے، اور وہ دوسری طرف۔ دونوں میں بہتر وہ ہے، جو سلام میں پہل کرے۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں تعلق ختم کرنا پسندیدہ عمل نہیں۔ اختلاف والے شخص سے سلام وکلام بند کرنا یا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا کسی بھی حال میں درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اختلاف (difference) انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ متعدد اسباب سے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اختلاف کے ہونے کو روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود آدمی اپنے آپ کو صحیح رویے پر قائم رکھے۔ ایسے لوگوں کے لیے اسلام میں بہت بڑا ثواب (reward) ہے۔

بہترین انسان وہ ہے، جو اختلاف کو ڈسکشن اور ڈائیلاگ کا ذریعہ بنائے، نہ یہ کہ اختلاف کو باہمی بگاڑ کا ذریعہ بنایا جائے۔ اختلاف کو تبادلۂ خیال (discussion) کا ذریعہ بنانا چاہیے، نہ کہ ترک تعلق کا ذریعہ۔ اختلاف کو دشمنی کے طور پر نہیں دیکھنا چاہیے، بلکہ اس کو ڈسنٹ (dissent) کے طور پر لینا چاہیے۔ یعنی رائے (opinion) کی سطح پر اختلاف، مگر سماجی تعلق (social relationship) کی سطح پر اتفاق۔

اختلاف ایک مثبت ظاہرہ

ایک قول بطور حدیثِ رسول مختلف کتابوں میں نقل کیا گیا ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: اخْتِلَافُ أُمتِي رَحْمَة (کنز العمال، حدیث نمبر 28686)۔ یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔ محدثین عام طور پر اس قول کو بے اصل (لَا أصل لَهُ) مانتے ہیں (المقاصد

الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ محدثانہ اصول کے مطابق یہ قول ایک بے اصل قول ہوسکتا ہے۔ لیکن قانونِ فطرت کے اعتبار سے بلاشبہ وہ ایک درست قول ہے۔

اختلاف (difference) فطرت کے قانون کے مطابق ایک مثبت ظاہرہ ہے۔ وہ کوئی غیر مطلوب ظاہرہ نہیں۔ اختلاف اگر سنجیدہ اختلاف ہو تو وہ ڈسکشن کا دروازہ کھولتا ہے۔ لوگ اس پر سنجیدہ اظہارِ رائے کرتے ہیں، جس سے زیر بحث مسئلے کے نئے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ بیسویں صدی کے امریکی رائٹر اور صحافی والٹر لپ مین (Walter Lippmann,1889-1974) نے نہایت درست طور پر کہا ہے کہ جہاں تمام لوگ یکساں طور پر سوچیں، وہاں کوئی بھی زیادہ نہیں سوچتا:

Where all think alike, no one thinks very much.

جب دو پتھر آپس میں ٹکرائیں تو اس سے ایک تیسری چیز ایمرج کرتی ہے، اور وہ چنگاری ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ جب دو دماغ کسی اختلافی موضوع پر آپس میں گفتگو کریں تو اس سے ایک تیسرا خیال وجود میں آتا ہے، جو کہ دونوں کے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بنتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ اختلاف کو اگر سنجیدگی کے ساتھ لیا جائے تو اس سے غور وفکر کا نیا دروازہ کھلتا ہے، معاملے کے نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ البتہ اس کی یہ شرط ہے کہ گفتگو کو ہار جیت کے معنی میں نہ لیا جائے، بلکہ موضوع کی تحقیق کے معنی میں لیا جائے۔ بحث کے دونوں فریق اپنی ذات کو الگ کرکے زیرِ بحث مسئلے پر تبادلۂ خیال کریں۔

ترقی کا راز

مغرب کے سفر میں میری ملاقات ایک بڑے مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مغرب (West) کی ترقی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا —اختلافِ رائے کو انسان کا ناقابل تنسیخ حق سمجھنا:

To accept dissent as an absolute human right.

مغربی اسکالر کے اس جواب کو سننے کے بعد میں نے اس موضوع کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اس موضوع پر کثرت سے کتابیں لکھی گئی ہیں، مثلاً:

1. *Dissent: The History of an American Idea* by Ralph Young, 2015, NYU Press
2. *On Liberty* by John Stuart Mill,1859
3. *The Constitution of Liberty* by F. A. Hayek,1960

اس موضوع پر اپنے مطالعے کے نتیجے میں مَیں اس رائے کی صداقت پر مطمئن ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب سے پہلے انسانی تاریخ میں اختلاف رائے کو انسانی حق (human right) کا درجہ حاصل نہ تھا۔ یہ صرف مغربی تہذیب کے بعد ہوا ہے کہ اختلاف رائے کو متفقہ طور پر ایک یونیورسل نارم کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔

اختلاف رائے کو ڈسنٹ (dissent) کا نام دینا مغربی تہذیب کا ظاہرہ ہے۔ مغربی تہذیب سے پہلے یہ لفظ موجود نہ تھا۔ ڈسنٹ ایک نیوٹرل لفظ ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف کے لیے یہ ایک صحیح ترین لفظ ہے۔ مثبت اختلاف صرف اختلاف ہوتا ہے، وہ نہ موافق ہوتا ہے، اور نہ مخالف۔ میں سمجھتا ہوں کہ مثبت اختلاف اجتماعی ترقی کے لیے شرط لازم ہے۔

اختلاف اگر صرف اختلاف ہو تو وہ نہایت آسانی سے مخالفت کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اور مخالفت صرف ایک منفی سرگرمی ہے۔ مخالفت کو مثبت سرگرمی بنانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس کو مثبت معنی دے دیا جائے۔ یعنی اختلاف کو ڈسنٹ (dissent) کا معنی قرار دینا۔ مثبت اختلاف طرفین کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے، جب کہ منفی اختلاف کا دونوں میں سے کسی کے لیے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

میں ذاتی طور پر اختلاف رائے کو یہی درجہ دیتا ہوں۔ میں نے اپنے ذاتی تجربے سے یہ سمجھا ہے کہ اختلافِ رائے کو نہ ماننا خود اپنے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔ اس لیے کہ اختلاف رائے کے ذریعہ زیرِ بحث مسئلے کے مختلف پہلو کھلتے ہیں۔ اس کے مختلف گوشے سامنے آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کسی انسان کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ جو آدمی اختلاف رائے کو برداشت نہ کرے، وہ یقینی طور پر ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہوگیا، اور وہ نعمت ہے ذہنی ارتقا۔

کسی نے درست طور پر کہا ہے: مَن هُوَ نَاصِحُكَ، خَيْرٌ لَكَ مِمَّنْ هُوَ مَادِحُكَ (جو شخص تمھیں نصیحت کرے، وہ اس سے بہتر ہے جو تمھاری تعریف کرے)۔ جو آدمی حقیقت پسند ہو، وہ یقیناً تنقید یا اختلاف رائے کو اپنے لیے ایک نعمت سمجھے گا۔ کیوں کہ تنقید اور اختلاف رائے ہمیشہ فکر کے نئے دروازے کھولنے والا ہے۔

تنقید یا اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا میرے نزدیک کوئی تقویٰ کی بات نہیں ہے، بلکہ وہ خالص علمی بات ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی کے اندر سائنٹفک ٹمپر (scientific temper) موجود ہے۔ سائنٹفک ٹمپر اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ہے کہ آدمی کے اندر اعترافِ حقیقت (acceptance of reality) کا

مزاج ہو۔ جب آپ اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ آپ آزادانہ طور پر سوچیں، اور آزادانہ رائے قائم کریں تو فطرت کے قانون کے مطابق آپ کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ دوسرے شخص کو بھی یکساں طور پر اپنی رائے رکھنے اور اس کے اظہار کا حق حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اختلاف رائے کو کھلے ذہن کے ساتھ سننا، گویا حقیقتِ واقعہ کا اعتراف کرنا ہے۔ اسی اعتراف کا دوسرا نام سائنٹفک اسپرٹ ہے۔

فکری تعدّد، فکری حریت

اسلام میں فکری آزادی (intellectual freedom) کامل درجے میں پائی جاتی ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ فکری آزادی کے بغیر خدا کا تخلیقی منصوبہ (creation plan) پورا نہیں ہوسکتا۔ انسان کو موجودہ دنیا میں ابتلا (test) کے لیے رکھا گیا ہے اور یہ مقصد صرف اُسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب کہ انسان کو اپنے قول وعمل کی پوری آزادی حاصل ہو۔

اسلام فکری آزادی کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے، لیکن فکری تعدد (intellectual diversity) کا تصور اسلام میں نہیں۔ اسلام کے مطابق، ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ جس رائے کو چاہے، اختیار کرے۔ لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ ہر رائے باعتبار حقیقت بھی درست ہے۔ اِس معاملے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ باعتبارِ حقیقت تو صرف ایک ہی رائے درست ہے، لیکن باعتبارِ آزادی ہر انسان کو یہ حق ہے کہ وہ اپنے لیے اِس دنیا میں جس رائے کو چاہے اختیار کرے۔

ابتلا کے سوا اِس اصول کی ایک اور اہمیت یہ ہے کہ فکری آزادی کے ماحول میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان آزادانہ ڈسکشن ہو اور آزادانہ ڈسکشن سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ سماج کے اندر ذہنی ارتقا کا عمل (process) جاری رہے۔

فکری آزادی کا تصور انسان کی ذہنی ترقی کے لیے بے حد اہم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ

فکری آزادی کے بغیر ذہنی ترقی ممکن نہیں۔ کسی سماج میں فکری آزادی کو ممنوع (taboo) قرار دینا صرف اِس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ سماج فکری جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہوجائے۔ لیکن فکری تعدد کے نظریے کو اگر اصولاً درست مان لیا جائے تو اس کے نتیجے میں جو چیز پیدا ہوگی، وہ فکری انتشار (intellectual anarchy) ہے، اور فکری انتشار ایک غیر صحت مند (unhealthy) حالت ہے، فکری انتشار کسی آدمی کو کنفیوژن (confusion) کے سوا کہیں اور نہیں پہنچاتا۔

مخاصمت نہیں

مخاصمت (opposition) اور اختلاف (difference) دونوں میں ایک چیز مشترک ہے، وہ یہ کہ دونوں کا آغاز ڈسپیوٹ (dispute) سے ہوتا ہے، لیکن عملی اعتبار سے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ فرق اتنا زیادہ ہے کہ اپنے نتیجے کے اعتبار سے، اختلاف پوری طرح ایک جائز فعل ہے اور مخاصمت پوری طرح ایک ناجائز فعل۔ درست اختلاف وہ ہے جو تمام تر علمی حقائق پر مبنی ہو، جس میں شروع سے آخر تک معلوم حقائق (objective facts) کی بنیاد پر گفتگو کی جائے۔

اِس کے برعکس، مخاصمت میں ساری بحث داخلی نیت پر حملہ اور الزام تراشی پر ہوتی ہے۔ اختلاف میں رایوں کا بدلنا ممکن ہوتا ہے۔ ایک فریق کی رائے اگر علمی تجزیے میں درست ثابت ہوتو دوسرا فریق کسی تاخیر کے بغیر اس کو تسلیم کرلیتا ہے۔

اختلاف کی حیثیت ایک علمی تبادلۂ خیال (scientific discussion) کی ہوتی ہے۔ اِس سے دونوں فریق کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے، وہ دونوں فریق کے لیے ذہنی ارتقا کا ذریعہ بنتا ہے۔ اختلاف اپنی حقیقت کے اعتبار سے، بحث وتکرار کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ

ایک اعلیٰ درجے کی علمی تلاش (scientific pursuit) کا نام ہے۔ اِس میں دونوں فریق ہار اور جیت کے تصور سے اوپر اٹھ کر مشترک طور پر امرِ حق کو دریافت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اِس کے برعکس، مخاصمت ایک منفی سرگرمی کا نام ہے۔ مخاصمت ایک ایسا فعل ہے جو ہمیشہ علمی بد دیانتی پر قائم ہوتا ہے۔ مخاصمت ایک ایسا فعل ہے جو غیر علمی بھی ہے اور غیر اخلاقی بھی۔ مخاصمت کا کوئی بھی مثبت فائدہ نہیں، نہ ایک فریق کے لیے، نہ دوسرے فریق کے لیے۔

مخاصمت یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی سے دشمنی ہوجائے تو وہ اس کی توہین، اُس پر عیب زنی اور اس کے خلاف الزام تراشی میں لگا رہے — اختلاف رائے ایک ملکوتی فعل (البقرۃ، 2:30) ہے اور مخاصمت تمام تر ایک شیطانی فعل۔

اختلاف اور اتحاد

ہر ایک اتحاد چاہتا ہے، لیکن عملاً اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ اِس کا سبب کیا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ اتحاد کو قائم کرنے کے لیے جو تدبیر اختیار کی جاتی ہے، وہ غیر فطری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اتحاد کے نام پر بڑے بڑے جلسے ہوتے ہیں، لیکن عملاً اتحاد قائم نہیں ہوتا۔

اتحاد کے علم برداروں کی مشترک غلطی یہ ہے کہ وہ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اختلاف (difference) کی موجودگی ہی اتحاد قائم نہ ہونے کا اصل سبب ہے۔ ہر ایک کی کوشش یہ ہے کہ اختلافات کو مٹا دیا جائے۔ اُن کا خیال ہے کہ حقیقی اتحاد اُسی وقت قائم ہوسکتا ہے، جب کہ لوگوں کے درمیان آپس کے اختلافات کا خاتمہ کر دیا جائے۔ مگر اِس قسم کا اتحاد اِس عالم امتحان میں کبھی واقعہ بننے والا نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اختلاف (difference) خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے، اور جو

چیز فطرت کا حصہ ہو، اس کو ختم کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد قائم کرنے کا ایک ہی ممکن طریقہ ہے، اور وہ ہے — اختلاف کو برداشت کرنا۔ اِس دنیا میں جب بھی اتحاد قائم ہوگا، وہ اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے قائم ہوگا۔ اختلاف کو مٹا کر اتحاد قائم کرنا اس دنیا میں عملاً ممکن ہی نہیں۔

خالق نے انسان کو اِس طرح پیدا کیا ہے کہ ان کے درمیان ہمیشہ اختلاف پایا جائے۔ یہ اختلاف انسان کے لیے ایک عظیم رحمت ہے۔ اختلاف کی بنا پر دو شخصوں یا دو گروہ کے درمیان ڈائیلاگ ہوتا ہے، اور ڈائیلاگ دونوں فریقوں کے لیے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بنتا ہے۔ اختلاف کی حیثیت ایک فکری چیلنج کی ہے۔

فکری چیلنج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بند ذہن کے دروازے کھلتے ہیں، انسان کے اندر چھپے ہوئے امکانات ظاہر ہوتے ہیں، جو چیز بالقوہ (potential) طور پر ذہن میں موجود تھی، وہ بالفعل (actual) وقوع میں آجاتی ہے۔

اختلاف، رواداری

رواداری (ٹالرنس) ایک اعلیٰ انسانی اور اسلامی صفت ہے۔ رواداری کا مطلب دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اس کے مقابلہ میں عدم رواداری یہ ہے کہ آدمی صرف اپنے آپ کو جانے، وہ دوسروں کے تقاضے سے بے خبر ہو جائے۔ رواداری ایک اعلیٰ انسانی اسپرٹ ہے۔ اس کو شریعت میں مختلف الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً — رفق، تالیفِ قلب، شفقت علی الخلق، وغیرہ۔

آدمی کے اندر جب خدا پرستی اور سچی دین داری آتی ہے تو وہ خود غرضی کے تحت پیش آنے والی تمام برائیوں سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں جینے کے بجائے حقائق میں جینے لگتا

ہے۔ ایسا انسان عین اپنے مزاج کے مطابق دوسروں کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگتا ہے۔ وہ دوسروں سے کسی چیز کا امیدوار نہیں ہوتا اس لیے دوسرے اگر اس سے اختلاف رکھیں یا اس کے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں تب بھی وہ دوسروں کا خیر خواہ بنا رہتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کی رعایت کرتا ہے۔ تب بھی وہ دوسروں کے ساتھ اپنے روادارانہ سلوک کو باقی رکھتا ہے۔

رواداری یہ ہے کہ آدمی ہر حال میں دوسرے کی عزت کرے خواہ وہ اس کے موافق ہو یا اس کے خلاف۔ وہ ہر حال میں دوسرے کو اعلیٰ انسانی درجہ دے خواہ وہ اس کا اپنا ہو یا غیر۔ وہ دوسرے کے معاملہ کو ہر حال میں ہمدردی کا معاملہ سمجھے۔ خواہ دوسرے کی طرف سے بظاہر غیر ہمدردانہ سلوک کا اظہار کیوں نہ ہوا ہو۔

رواداری کا مطلب دراصل دوسروں کی رعایت کرنا ہے۔ اجتماعی زندگی میں لازمی طور پر ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیش آتے ہیں۔ مذہب، کلچر، رواج اور ذاتی ذوق کا فرق ہر سماج میں باقی رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اعلیٰ انسانی طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے اصول پر قائم رہتے ہوئے دوسرے کے ساتھ رعایت اور توسع کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ اپنی ذات کے معاملہ میں اصول پسند ہو مگر دوسرے کے معاملہ میں روادار۔ وہ اپنے آپ کو اپنے اصولوں کے معیار کی روشنی میں جانچے۔ مگر جب دوسروں کا معاملہ ہو تو وہ رواداری اور وسعتِ ظرفی کا طریقہ اختیار کرے۔ یہ رواداری انسانی شرافت کا لازمی تقاضا ہے۔ اسلام آدمی کے اندر یہی اعلیٰ شرافت پیدا کرتا ہے۔

آرٹ آف لائف

ایک فوجی جنرل نے بتایا کہ آرٹ آف وار (art of war) کیا ہے۔ اُس نے کہا کہ — سب سے زیادہ مؤثر مسلّح فوج وہ ہے جو غصہ اور نفرت کے بغیر لڑائی کرے:

The most effective armed forces are those who fight without anger or hate.

ایسا کیوں ہے کہ غصہ اور نفرت کے بغیر لڑی جانے والی جنگ زیادہ کامیاب جنگ ہوتی ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ جب فوج غصہ اور نفرت سے خالی ہو تو وہ زیادہ بہتر انداز میں مقابلے کی منصوبہ بندی کرسکتی ہے۔ غصہ اور نفرت، انسان کی عقل کو ماؤف کردیتے ہیں۔ ایسی حالت میں اُس کے لیے زیادہ بہتر تدبیر کار اختیار کرنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہ اصول صرف آرٹ آف وار کا اصول نہیں ہے، بلکہ وہ آرٹ آف لائف کا اصول بھی ہے۔ میدانِ جنگ سے باہر جو انسانی زندگی ہے، وہاں بھی مسلسل طور پر افراد اور گروہوں کے درمیان پُرامن مقابلہ جاری رہتا ہے۔ اِس پُرامن مقابلے میں ضرورت ہوتی ہے کہ فرد یا گروہ اپنے معاملے کی کامیاب منصوبہ بندی کریں۔ یہ کامیاب منصوبہ بندی دوبارہ وہی ذہن کرسکتا ہے جو غصہ اور نفرت سے خالی ہو، جو غیر متاثر ذہن کے تحت حالات کا اندازہ کرے، جو واقعات کا منفی اثر لیے بغیر اپنی تدبیر کا نقشہ بنائے۔ ایسا انسان معاملات کو بے لاگ انداز میں دیکھتا ہے، وہ خالص حقائق کی روشنی میں اپنے عمل کا نقشہ بناتا ہے۔ ایسے ہی لوگ اپنے حریف کی پوزیشن کا صحیح اندازہ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا کریں، وہی کامیابی کی منزل تک پہنچتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ آرٹ آف لائف کا اصول بھی وہی ہے جو آرٹ آف وار کا اصول ہے۔ دونوں ہی میں کامیابی وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو معاملات پر مثبت ذہن کے تحت غور

کریں۔ اِس کے برعکس، جولوگ منفی ذہن کے تحت سوچیں، وہ ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، جنگی مقابلے کے میدان میں بھی اور پُرامن مقابلے کے میدان میں بھی۔

شکایت ختم کرنے کا طریقہ

سماجی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو دوسرے سے شکایت اوراختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ بات خاندان کے اندر بھی ہوتی ہے اور خاندان کے باہر بھی۔ جب ایسا ہوتا ہے تولوگ عام طور پر یہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگتے ہیں۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ اپنے رویے کو درست ثابت کریں۔ شکایت اوراختلاف پیدا ہونے کے بعد ہر ایک ایسا ہی کرتا ہے۔ لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح شکایتیں ختم نہیں ہوتیں۔ لوگ بظاہر چپ ہوجاتے ہیں لیکن جو شکایت تھی وہ بدستور دل میں باقی رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا سماج پورا کا پورا شکایت سے بھرا ہوا سماج بن گیا ہے۔ ہر ایک منفی نفسیات میں جیتا ہے۔ مثبت نفسیات میں جینے والا انسان کہیں نظر نہیں آتا۔

اس معاملے کا حل صرف یہ ہے کہ موجودہ طریقے کو ختم کردیا جائے۔ شکایت پیش آنے کی صورت میں اس کی صفائی کی کوشش نہ کی جائے، بلکہ سیدھے طور پر اپنی غلطی مان لی جائے۔ اپنے کو درست ثابت کرنے کے بجائے یہ کہہ دیا جائے کہ — میں غلطی پر تھا، مجھے معاف کردو۔ یہ طریقہ عظیم اخلاقی قدر (moral value) کا حامل ہے۔ اپنی غلطی نہ ماننا، ہمیشہ کبر کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن بحث کے بغیر اپنی غلطی کو مان لینا، آدمی کے اندر وہ عظیم صفت پیدا کرتا ہے جس کو تواضع (modesty) کہا گیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اختلافی معاملے کی دوصورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ معاملہ ذاتی شکایت کا معاملہ ہو۔ اور دوسرا یہ کہ وہ معاملہ علمی اور دینی معاملہ ہو۔ اگر معاملہ ذاتی شکایت کا ہوتو اس کو

ختم کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ حقیقی معنوں میں کس کی غلطی تھی، بلکہ تواضع کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے فوراً خود اپنے کو غلط مان لیا جائے۔ اِس طرح معاملہ فی الفور ختم ہوجائے گا۔ البتہ اگر معاملہ علمی یا دینی ہو، یعنی اس کا تعلق اصولی نوعیت کا ہوتو دلائل کے ذریعے اس کی وضاحت کی کوشش کرنا چاہیے۔ مگر یہاں بھی ضروری ہے کہ بات کو صرف دلائل تک محدود رکھا جائے، اُس کو ضد تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ دلیل کے ذریعے جو بات ثابت ہوجائے اُس کو دونوں فریق مان لیں۔ اِس طرح نہ صرف یہ کہ معاملہ ختم ہوگا، بلکہ وہ دونوں کے لیے ذہنی اور روحانی ارتقا کا ذریعہ بن جائے گا۔

تخلیق میں تنوع

قرآن میں مختلف مقامات پر انسان کی تخلیق کا قصہ بیان ہوا ہے۔ ان میں سے ایک جزء کا ترجمہ یہ ہے — جب تمھارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔ پھر جب میں اس کو درست کرلوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ پس تمام فرشتوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس کہ اس نے گھمنڈ کیا اور وہ انکار کرنے والوں میں سے ہوگیا۔ اللہ نے فرمایا کہ اے ابلیس، کس چیز نے تجھ کو روک دیا کہ تو اس کو سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ یہ تو نے تکبر کیا یا تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے۔ اس نے کہا کہ میں آدم سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے پیدا کیا ہے، اور اس کو مٹی سے۔ (38:71-76)

یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ابلیس نے اپنی افضلیت کا دعویٰ خود اپنی زبان سے کیا تھا۔ اس کے برعکس، انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اس کی افضلیت کا بیان خود خالق نے اپنی زبان سے کیا ہے۔ ابلیس کی بات خود ساختہ دعویٰ کی ہے۔ جب کہ انسان کی افضلیت کا

اعلان خود خالق کائنات نے کیا ہے۔ اللہ اور ابلیس کے درمیان اس مکالمے سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اللہ کا جو منصوبہ ترقی کے بارے میں ہے، وہ اختلاف (diversity) سے تعلق رکھتا ہے، نہ کہ یکسانیت سے۔ جہاں یکسانیت ہوگی، وہاں ارتقا رک جائے گا، اور جہاں اختلاف پایا جائے، وہاں ارتقا جاری رہے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو تنوع پسند ہے۔ اگر یکسانیت اللہ کا مطلوب ہوتا تو فرشتے، جنات اور انسان سب کو اللہ یکساں بنا دیتا۔ سب کی سوچ، سب کا ذوق، سب کا عمل، بالکل ایک طرح کا ہوجاتا۔ مگر اس دنیا کے خالق کو تنوع پسند ہے، نہ کہ یکسانیت۔ یہ فطرت کا قانون ہے، اور فطرت کے قانون میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسی فطری حقیقت کو اردو کے مشہور شاعر ذوق نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن　　اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

پختگی کیا ہے

انسانوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں: ناپختہ ذہن والے، اور پختہ ذہن والے۔ ناپختہ ذہن وہ ہے جو جذباتی طور پر سوچے، جو رومانی خیالات میں جیے، جو اپنی خواہشات کی پیروی کرے، نہ کہ حقائقِ حیات کی۔ اِس کے مقابلے میں پختہ ذہن والا انسان وہ ہے جو اپنے جذبات سے اوپر اٹھ کر حقیقتوں کو سمجھے، جو اپنے ذہنی خول سے باہر آ کر چیزوں کو دیکھے اور حقیقت پسندانہ انداز میں اپنی رائے قائم کرے۔ پختگی (maturity) اِس صلاحیت کا نام ہے کہ آدمی اُن چیزوں کے ساتھ نارمل طریقے سے رہ سکے جن کو وہ بدل نہیں سکتا:

Maturity is the ability to live with things you cannot change.

ہر آدمی اپنی سوچ اور اپنے جذبات کے لحاظ سے ایک مستقل ہستی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک کائنات ہے۔ ہر آدمی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ جیسے چاہتا ہے، ویسے دنیا میں رہے۔ وہ اپنے خوابوں کے مطابق ایک پسندیدہ دنیا کی تعمیر کرسکے۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ انسان کو ایک ایسی دنیا میں رہنا پڑتا ہے جس کو اس نے خود نہیں بنایا ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں جینے پر مجبور ہے جس کی تشکیل اس نے خود نہیں کی۔ ایسی حالت میں کسی عورت یا مرد کے لیے صرف دو میں سے ایک کا انتخاب ہے — یا تو وہ دنیا سے عدم موافقت کی پالیسی اختیار کرکے خودکشی کرلے، ذہنی خودکشی یا جسمانی خودکشی۔ اس کے لیے دوسرا انتخاب یہ ہے کہ وہ بظاہر غیر مطلوب دنیا کے ساتھ موافقت کرنے کا آرٹ سیکھے، وہ ناممکن سے نہ ٹکرائے اور صرف ممکن کے دائرے میں رہتے ہوئے زندگی گزارے۔

اختلاف ایک رحمت

ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔ یہ حدیث سند کے اعتبار سے ضعیف سمجھی جاتی ہے۔ لیکن معنی کے اعتبار سے وہ قوی ہے۔ اس حدیث میں ایک فطری حقیقت کو بتایا گیا ہے۔

اختلاف (difference) کسی گروہ کا مسئلہ نہیں، اختلاف ایک فطری امر ہے۔ انسانوں کے درمیان ہمیشہ اختلافات ہوتے ہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی اور سیکولر اعتبار سے بھی۔ کوئی سماج کبھی رائے کے اختلاف سے خالی نہیں ہوتا۔

رائے کے اختلاف کو اگر فطری درجہ میں رکھا جائے تو وہ لوگوں کے لیے ایک رحمت (blessing) ثابت ہوگا۔ صحیح یہ ہے کہ اختلاف پیش آنے پر تحمل کا طریقہ اختیار کیا

جائے۔ اختلاف کو ڈسکشن کا موضوع بنایا جائے۔ ایسا کرنے سے اختلاف لوگوں کے اندر ذہنی ارتقا (intellectual development) کا ذریعہ بن جائے گا۔ اس سے لوگوں کی تخلیقیت (creativity) میں اضافہ ہوگا۔ درست طور پر کہا جاتا ہے کہ جہاں لوگ ایک ہی انداز میں سوچیں، وہاں لوگوں کے اندر بلند فکری نہیں ہوگی:

Where everyone thinks alike, no one thinks very much

رائے کا اختلاف ہر زمانے میں امت کے اندر موجود رہا ہے۔ رائے کا اختلاف اس وقت مسئلہ بنتا ہے جب کہ کوئی گروہ اختلاف میں غلو کا طریقہ اختیار کرے۔ غلو کے بغیر اختلاف ایک رحمت ہے۔ جب کہ غلو کے ساتھ اختلاف ایک فتنہ بن جاتا ہے۔ مثلاً امت میں ہمیشہ عقائد کے معاملے میں اختلاف پایا جاتا رہا، اسی طرح فقہی مسائل میں بھی ہمیشہ اختلاف موجود رہا ہے۔ یہ اختلاف کبھی مسئلہ نہیں بنا۔ البتہ بعض اوقات جب کسی گروہ نے اختلاف کو غلو کے درجے تک پہنچایا تو اختلاف مسئلہ بن گیا۔

اختلاف کو مینج کرنا

قدیم زمانہ ٹرائبل ایج کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں ایسا تھا کہ اختلاف بہت جلد ٹکراؤ بن جاتا تھا، اور ٹکراؤ بہت جلد لڑائی کی صورت اختیار کرلیتا تھا۔ ٹرائبل ایج (قبائلی دور) میں لوگ مسائل کو حل کرنے کے لیے ایک ہی طریقہ جانتے تھے۔ وہ تھا ٹکراؤ کا طریقہ۔ لیکن ٹکراؤ کا طریقہ مسائل کو حل نہیں کرتا تھا، بلکہ ہر ٹکراؤ کے بعد ایک اور ٹکراؤ وجود میں آتا تھا۔ یعنی ایکشن کے بعد ری ایکشن۔ اس کو ایک لفظ میں چین ری ایکشن کہا جاسکتا ہے۔

اس کے مقابلے میں موجودہ زمانے میں ایک اور طریقہ وجود میں آیا ہے۔ اس کو ایک لفظ میں ''مسائل کو مینج کرنا'' کہا جاسکتا ہے۔ موجودہ زمانہ آزادیِ رائے کا زمانہ ہے۔ آپ

کسی بھی شخص سے کسی بھی مسئلے پر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہو گیا ہے کہ آپ سامنے والے فریق کی سنیں، اور سامنے والا فریق آپ کی سنے۔ اس طرح وہ دور ختم ہو گیا، جب کہ اختلاف بہت جلد ٹکراؤ بن جاتا تھا۔

یہ طریقہ سب سے پہلے پیغمبر اسلام ﷺ نے اختیار کیا۔ آپ جب تشریف لائے تو دنیا میں ٹرائبل ایج تھا۔ ٹرائبل ایج میں ہمیشہ اختلافات پیش آتے ہیں۔ رسول اللہ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ اختلاف کو ٹکراؤ تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ بلکہ اس کو مینیج کر کے حل کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے زمانے میں فریقِ ثانی نے بار بار ٹکراؤ کرنا چاہا، لیکن آپ نے ہمیشہ ٹکراؤ کو مینیج کر کے اس کو بڑھنے نہیں دیا۔ ہجرتِ مدینہ اور صلح حدیبیہ اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اختلاف کو ٹکراؤ کی طرف لے جانا یہ ہے کہ اس میں مسلز پاور (muscle power) کو استعمال کیا جائے۔ اختلاف کو مینیج کرنا یہ ہے کہ دونوں فریق ڈائلاگ کے ذریعے اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ اختلاف کو ختم کرنا یہ ہے کہ دونوں فریق ایک دوسرے کو گفتگو کے ذریعہ مخاطب بنائیں۔ اپنے اختلاف کو ذہن کی سطح پر ختم کرنے کی کوشش کریں — اس دنیا میں اختلاف کبھی ختم نہیں ہوتے، اختلاف کو مینیج کرنا سیکھیے۔

ثالثی کا اُصول

خاندانی زندگی میں نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے حل کا ایک فطری اصول قرآن میں بتایا گیا ہے۔ قرآن کا یہ اصول اس آیت میں ملتا ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَماً مِنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِنْ أَهْلِهَا إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحاً يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً (4:35)۔ یعنی، اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان تعلقات بگڑنے کا اندیشہ ہو تو ایک حَکَم مرد کے

رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو اور ایک حَکَم عورت کے رشتہ داروں میں سے کھڑا کرو۔ اگر دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا خبر دار ہے۔

حَکَم (ثالثی) کا یہ اُصول نزاعات کے حل کے لیے بے حد مفید ہے۔ دو آدمیوں میں جب باہمی اختلاف ہو تو دونوں کا ذہن ایک دوسرے کے بارے میں متاثر ذہن بن جاتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں خالص واقعاتی انداز سے سوچ نہیں پاتے۔ ایسی حالت میں معاملہ کو طے کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ دونوں اپنے سوا کسی دوسرے کو حَکَم (arbiter) بنانے پر راضی ہو جائیں۔ دوسرا شخص معاملہ سے ذاتی طور پر وابستہ نہ ہونے کی وجہ سے غیر متاثر ذہن کے تحت سوچے گا اور ایسے فیصلہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گا جو حقیقتِ واقعہ کے مطابق ہو۔

خالق نے اپنے تخلیقی منصوبہ کے مطابق، ہر دو انسان کے درمیان فرق رکھا ہے۔ اس مسئلہ کا حل فرق کو مٹانا نہیں ہے بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ انسان اس ہنر کو جانے جس کو آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ (art of difference management) کہا جا سکتا ہے۔ ڈیفرنس کو مٹانے کی کوشش نہ کیجیے بلکہ ڈیفرنس کے ساتھ جینا سیکھیے اور پھر آپ کی زندگی کامیاب ازدواجی زندگی بن جائے گی۔ خاندانی زندگی ہو یا سماجی زندگی، دونوں میں اختلافات پیدا ہونا فطری ہے۔ اس مسئلہ کا حل صرف ایک ہے، اور وہ ہے — اختلاف کے باوجود متحد ہو کر رہنا۔

آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ

طلاق کے بارے میں ایک حدیثِ رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أَبْغَضُ الْحَلَالِ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى الطَّلَاقُ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 2178)۔ یعنی اللہ کے نزدیک حلال میں سب سے ناپسندیدہ عمل طلاق ہے۔ طلاق ایک ابغض (سب سے ناپسندیدہ) عمل کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ نکاح کا طریقہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ انسان نکاح کے ذریعے اپنی تربیت کا کورس مکمل کرے۔ وہ کورس یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے بارے میں خالق کا نقشۂ تخلیق یہ ہے کہ آدمی اس راز کو جانے کہ اختلاف کو مینج کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ زندگی میں لازمی طور پر اختلافات پیش آتے ہیں۔ یہ اختلافات اس لیے نہیں ہیں کہ آدمی لڑنا بھڑنا شروع کردے۔ بلکہ اس لیے ہیں کہ آدمی پرامن انداز میں ان کو مینج (manage) کرے۔

یہ اختلافات کسی کی سازش کی وجہ سے نہیں ہیں، بلکہ وہ نظامِ فطرت کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ان اختلافات کے بارے میں یہ مطلوب نہیں ہے کہ آدمی ان سے لڑنا شروع کردے یا ان کو برائی (evil) سمجھ کر شادی کے بارے میں منفی رائے قائم کرلے۔ بلکہ آدمی کی ساری پلاننگ اس بنیاد پر ہونا چاہیے کہ جو شادی ہوگئی، اس کے ساتھ اس کو نباہ کرنا ہے۔ کوئی دوسرا آپشن اس کے لیے ممکن نہیں۔

شادی کا مقصد زندگی کی خوشی حاصل کرنا نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ زندگی کو سمجھ کر انسان مثبت انداز میں اس کی تعمیر کرے۔ ایسی تعمیر جو پوری انسانیت کے لیے مفید ہو۔ شادی دو انسانوں کے درمیان اجتماع کا نام نہیں ہے، بلکہ شادی ایک سماجی ذمے داری ہے۔ شادی سماج کے عمومی عمل کا ایک حصہ ہے۔ شادی مستقبل کی منصوبہ بندی ہے، نہ کہ وقتی طور پر

خوشیوں کی ایک دنیا بنانا۔خوشیوں کی دنیا بنانے کا نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے:

Prima facie it stands rejected.

چنانچہ دنیا میں کوئی شادی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ ہر شادی اس معیار پر قابلِ رد قرار پاتی ہے۔موجودہ دنیا میں ایڈجسٹ مینٹ کی پالیسی ہی واحد قابلِ عمل پالیسی ہے۔ ایڈجسٹ مینٹ کے ذریعے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اپنی توانائی کو ضائع ہونے سے بچائے۔ وہ غیر ضروری ٹنشن (tension) سے محفوظ رہ کر اپنا مطلوب عمل انجام دے سکے۔ وہ درمیان میں رکے بغیر اپنے سفر کو جاری رکھے، یہاں تک کہ اپنی آخری منزل پر پہنچ جائے۔

اختلاف کا مسئلہ

دورِ جدید میں جن مثبت باتوں کا آغاز ہوا ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اب بذریعہ تلوار اختلاف کو دور کرنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے، اور رائے کے اختلاف (dissent) کو رائے تک محدود رکھ کر نزاع (conflict) کو ختم کرنے کے دور کا آغاز ہوا ہے۔قدیم زمانے میں جب اختلاف پیدا ہوتا تھا تو اس کا خاتمہ صرف تلوار کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ قدیم عرب کا یہ محاورہ اسی حقیقت کی ترجمانی ہے— القَتْلُ اَنْفَی لِلْقَتْلِ (قتل، قتل کے لیے سب سے بڑا روک ہے)۔مگر اب یہ فریم ورک (framework) بدل چکا ہے۔

موجودہ دور میں اختلاف کے خاتمہ کا سپورٹنگ اسٹرکچر (supporting structure) بدل گیا ہے۔اب عمومی تباہی کے ہتھیاروں (weapons of mass destruction) نے دونوں فریقوں کو اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ دونوں فریق اختلاف کا خاتمہ گفتگو کی میز پر

کریں۔دو عالمی جنگ خصوصاً جاپان کی تباہی نے تمام دنیا کو اس سے روک دیا ہے کہ وہ اختلاف کا خاتمہ بذریعہ جنگ کریں:

Weapons of Mass Destruction (WMD) do serve as a deterrent to a global conflict. The destructive capabilities of the WMD were on full display over Japan at the end of World War II, and no one wants to go through something like that again.

اختلاف بذریعہ جنگ کا دور اب ختم ہو گیا ہے، اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو "تلوار" کی بنیاد پر فیصلے کا بدل مل گیا ہے، اور وہ ہے ڈسنٹ (dissent)، یعنی اختلافِ رائے کو اعتدال کے دائرے میں رکھنا، اس کو نفرت اور نزاع تک نہ پہنچنے دینا۔ انسان کی عقل نے یہ ریلائز (realize) کرلیا ہے کہ اختلافِ رائے کی بنیاد پر پیدا ہونے والے نزاع کو ریزن کی سطح پر مینج کیا جاسکتا ہے۔ پہلے زمانے میں حالت یہ تھی کہ اختلاف کو بزور طاقت سختی کے ساتھ دبایا جاتا تھا۔ یورپ کے حوالے سے اس کی تفصیل ڈریپر (وفات 1882ء) کی کتاب "معرکہ مذہب وسائنس" میں دیکھی جاسکتی ہے:

History of the Conflict Between Religion and Science, 1875, London, pp. 373

مگر یہ صرف یورپ کا مسئلہ نہیں تھا، ساری دنیا میں یہی طریقہ رائج تھا۔ اس کے برعکس، موجودہ دور میں بات چیت کی سطح پر اختلاف کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ یہ وہی دور ہے، جس کو ایک حدیثِ رسول میں "لا الہ الا اللہ کے ذریعہ قلعہ فتح کرنا" کہا گیا ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2920)۔ یعنی پیس فل انداز میں ڈائلاگ کے ذریعہ اختلاف کو مینج کرکے مقصد حاصل کرنا۔

رواداری کا اصول

جنوری 1995 کی پہلی تاریخ کو تمام اخباروں میں یہ خبر تھی کہ اقوام متحدہ نے 1995 کے سال کو رواداری کا سال (Year of Tolerance) قرار دینے کا اعلان کیا ہے۔ اقوام متحدہ کے ہیڈ کوارٹر نیویارک سے جاری ہونے والے اعلانیہ میں کہا گیا تھا کہ اپنے عمل، اپنے عقیدہ اور اپنی رائے میں روادار ہونا وہ سب سے بڑا عامل ہے جس کے ذریعہ پر امن دنیا تعمیر کی جاسکتی ہے۔

موجودہ زمانہ میں جگہ جگہ نسلی ٹکراؤ، اقلیتوں کے خلاف امتیاز اور پناہ گزینوں کے خلاف نفرت کا اظہار ہورہا ہے۔ اس کا واحد حل رواداری ہی ہے۔ نسل پرستی اور مذہبی انتہا پسندی بہت سے ملکوں میں امتیازی سلوک تک پہنچ گئی ہے۔ ان لوگوں کو ڈرایا دھمکایا جارہا ہے جو مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں اور صحافیوں کے خلاف تشدد کے واقعات ہورہے ہیں جو اظہارِ خیال کی آزادی کے حق کو استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

اکیسویں صدی کی آمد کے موقع پر یہ زبردست چیلنج ہمارے سامنے ہے اور اس کا واحد حل رواداری ہے۔ نارواداری صرف مسائل میں اضافہ کرتی ہے۔ وہ مسائل کو ختم نہیں کرتی۔ نارواداری اگر زیادہ بڑھ جائے تو وہ عالمی امن کے لیے ایک زبردست خطرہ بن جائے گی (ہندستان ٹائمس)۔

1995 As Year of Tolerance

The United Nations has proclaimed 1995 as the Year of Tolerance,saying the ability to be tolerant of the actions, beliefs and opinions of others is a major factor in promoting world peace. Amid the resurgence of ethnic conflicts, discrimination against minorities and

xenophobia directed against refugees and asylum-seekers, tolerance is the only way forward, said the statement of the United Nations Educational, Scientific and Cultural Organisation (UNESCO). It said, racism and religious fanaticism in many countries had led to many forms of discrimination and the intimidation of those who hold contrary views. Violence and intimidation against authors, journalists and others who exercise their freedom of expression, were also on the increase along with political movements which seek to make particular groups responsible for social ills such as crime and unemployment. Intolerance is one of the greatest challenges we face on the threshold to the 21st century, said the UNESCO statement. Intolerance is both an ethnic and a political problem. It is a rejection of the differences between individuals and between cultures. When intolerance becomes organised or institutionalised it destorys democratic principles and poses a threat to world peace. (The Hindustan Times, January 1, 1995)

اقوام متحدہ کا یہ اعلان نہایت صحیح اور بروقت ہے۔ آج دنیا کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہی رواداری یا ٹالرنس ہے۔

زندگی کی حقیقتوں میں سے ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان اور انسان کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہ فرق ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ خواہ کوئی خاندان ہو یا کوئی سماج ہو یا کوئی ملک ہو، ہر جگہ ایک اور دوسرے میں فرق اور اختلاف ضرور پایا جائے گا۔ اب سوال یہ ہے کہ اس فرق اور اختلاف کی موجودگی میں اتحاد اور میل ملاپ کس طرح پیدا کیا جائے۔

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اتحاد کا ماحول اگر بنانا ہے تو اختلافات کو مٹا دینا ہوگا۔ مگر یہ رائے

غلط ہے، کیوں کہ وہ قابل عمل نہیں۔ اگر آپ پھول کے ساتھ کانٹے کو پسند نہ کرتے ہوں تو آپ ایسا نہیں کر سکتے کہ کانٹوں کو توڑ کر کانٹوں کا خاتمہ کر دیں۔ کیوں کہ آپ ڈالی کا ایک کانٹا توڑیں گے تو اس کی جگہ دوسرا کانٹا نکل آئے گا۔ حتیٰ کہ اگر آپ تمام پھولوں پر بلڈوزر چلا دیں تب بھی جو نیا درخت اُگے گا اس میں دوبارہ پھول کے ساتھ کانٹے بھی ضرور موجود ہوں گے۔

اس دنیا میں کانٹوں کو گوارا کر کے ہی پھول کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اختلافات کو برداشت کر کے ہی پر امن سماج بنایا جا سکتا ہے۔ اس دنیا میں اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد حاصل ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کو مٹا کر متحد ہونے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ امن کی زندگی کو حاصل کرنے کا واحد راز ہے — بے امنی کو گوارا کرنا۔

دنیا میں فرق اور اختلاف ہونا کوئی برائی کی بات نہیں۔ یہ ایک مثبت خصوصیت ہے اور اس کے بہت سے بڑے بڑے فائدے ہیں۔ باغ حیات کی خوشنمائی کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اتحاد کے پھول کے ساتھ اختلاف کا کانٹا بھی پایا جائے۔

اس کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ انسانوں میں اعلیٰ اخلاقیات کی تربیت ہوتی ہے۔ اپنے ہم خیال لوگوں کے درمیان اگر آپ خوش اخلاق ہوں تو آپ نے محض ابتدائی اخلاق کا ثبوت دیا۔ لیکن اگر آپ ان لوگوں کے درمیان خوش اخلاقی کا رویہ اختیار کریں جو آپ سے الگ خیال رکھتے ہیں یا آپ کے ناقد ہیں تو آپ نے یہ استحقاق حاصل کیا کہ آپ کو اعلیٰ اخلاقی سلوک کا کریڈٹ دیا جائے۔

اسی طرح اگر سماج میں تمام لوگ بالکل ایک رائے کے ہوں۔ ان میں کوئی اختلافی بحث نہ پیدا ہوتی ہو تو ایسا سماج پتھر کے اسٹیچو کا سماج بن جائے گا۔ اس کے درمیان رہنے والوں کی فکری ترقی رک جائے گی۔ فکری ترقی ہمیشہ افکار کے ٹکراؤ کے درمیان ہوتی ہے۔ پھر جہاں افکار کا ٹکراؤ ہی نہ ہو وہاں فکری ترقی کس طرح ہو سکتی ہے۔

نزاع اور اختلاف کے مقابلہ میں رواداری کا طریقہ اختیار کرنا کوئی انفعالی (passive) صفت نہیں۔ یہ عین ایجابی (positive) صفت ہے۔ زندگی کی تعمیر میں اختلافات کا نہایت اہم رول ہے۔ اختلافات کے عمل کے دوران ہی اعلیٰ انسانی شخصیت بن کر تیار ہوتی ہے۔ اگر انسانی سماج سے اختلاف کی حالت کو ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد اعلیٰ شخصیتوں کا بننا بھی یقینی طور پر رک جائے گا۔

اس دنیا میں کوئی بھی انسان کامل نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس میں ایک صفت ہوتی ہے تو دوسری صفت اس کے اندر نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک سبب ہے جس کی وجہ سے لوگوں کے درمیان فرق اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مگر اجتماعی زندگی کے لیے یہ اختلاف ایک رحمت ہے۔ کیوں کہ اسی اختلاف کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی کمی کو دوسرا آدمی پورا کرے۔ ایک کی خصوصیت دوسرے کے کام آئے۔ اگر لوگوں کے اندر ایک دوسرے کے اختلاف کو گوارا کرنے کا مزاج ہو تو یہ اختلاف مجموعی انسانی ترقی کا ایک طاقتور وسیلہ بن جائے گا۔

1947 کے بعد جب انڈیا میں پہلی آزاد حکومت بنی تو اس میں دو اہم لیڈر شامل تھے۔ ایک پنڈت جواہر لال نہرو (وفات 1964)، دوسرے سردار ولبھ بھائی پٹیل (وفات 1950)۔ پنڈت نہرو کے اندر مغربیت تھی اور سردار پٹیل کے اندر مشرقیت۔ اس بنا پر دونوں لیڈروں میں اکثر رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا۔ مگر یہ اختلاف قوم کے لیے نہایت مفید ثابت ہوا۔ کیوں کہ پنڈت نہرو کی صلاحیت سے سردار پٹیل کی کمی پوری ہوئی، اور سردار پٹیل کی صلاحیت پنڈت نہرو کی کمی کو پورا کرنے کا ذریعہ بن گئی۔

یہ ایک قریبی مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رائے اور طبیعت کا اختلاف انسانیت کی عمومی ترقی کے لیے کتنا زیادہ ضروری ہے۔

رواداری کی خصلت آدمی کو اس سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو

غیر ضروری چیز میں ضائع کرنے لگے۔ جب آپ کسی دوسرے کی خلافِ مزاج بات سے منفی اثر قبول کرلیں تو آپ کا ذہنی اعتدال بگڑ جائے گا۔ اس کے برعکس، جب اس طرح کی صورت پیش آنے پر آپ اس کا منفی اثر نہ لیں تو آپ کا ذہنی اعتدال پوری طرح برقرار رہے گا۔ آپ اپنا ایک لمحہ کھوئے بغیر ایک نارمل انسان کی طرح ہمیشہ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ رواداری اور تحمل کی پالیسی آپ کی کارکردگی کی عمر کو بڑھاتی ہے اور نارواداری اور عدمِ تحمل کا رویہ آپ کی کارکردگی کی عمر کو گھٹا دیتا ہے۔

رواداری یا ٹالرنس کوئی مجبورانہ فعل نہیں، وہ زندگی کا ایک مثبت اصول ہے۔ یہ ایک اعلیٰ انسانی کردار ہے۔ کسی سماج میں روادار انسانوں کا ہونا ایسا ہی ہے جیسے کسی باغ میں پھولوں کا ہونا۔ پھول کے بغیر باغ نہیں، اسی طرح روادار انسانوں کے بغیر ترقی یافتہ سماج نہیں۔ (آل انڈیا ریڈیو ممبئی سے 3 مارچ 1995 کو نشر کیا گیا)

اتحاد کی نفسیات

اتحاد و اتفاق کسی بڑے کام کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے۔ مگر اتحاد کبھی مطلق معنوں میں پیدا نہیں ہوتا۔ یعنی ٹیم یا گروپ کے تمام افراد کی سوچ ایک ہو، اور اس بنا پر ان کے اندر اتحاد قائم ہوجائے۔ فطرت کے قانون کے مطابق ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اتحاد ہمیشہ پریکٹکل وزڈم (practical wisdom) کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، نہ کہ مطلق وزڈم (absolute wisdom) کی بنیاد پر۔

اصل یہ ہے کہ اتحاد کبھی اتفاق رائے کی بنیاد پر قائم نہیں ہوتا، بلکہ اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے، جب کہ لوگوں کے سامنے ایک مشترک نشانہ (goal) ہو، اور اس مشترک نشانے کے حصول کے لیے مختلف لوگ اپنی ذاتی رایوں کو الگ رکھ کر مشترک نشانے کی بنیاد پر عملاً

متحد ہوجائیں۔ یعنی اختلاف رائے کے باوجود مشترک نشانے کی خاطر لوگوں کا عملاً متحد ہوجانا۔

ہر انسان ایک مستقل شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ ہر انسان کا زاویہ نظر (angle of vision) الگ الگ ہوتا ہے۔ اس لیے اجتماعی جدوجہد میں کبھی ایسا نہیں ہوسکتا کہ افراد کے درمیان کلی طور پر رایوں کا اتحاد ہوجائے۔ بلکہ لوگوں کے درمیان اتحاد اس سوچ کی بنیاد پر ہوتا ہے کہ کسی عظیم مقصد کے لیے اجتماعی کوشش کی جائے۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ لوگ انفرادی سطح پر اپنی رایوں کو اپنی ذات کی حد تک محدود رکھیں، اور اجتماعی جدوجہد کے معاملے میں سب مل کر ایک نشانے کے لیے کوشش کریں۔ عملی معنوں میں اسی کا نام اتحاد ہے۔ یہی طریقہ ممکن ہے، اور یہی طریقہ فطرت کے قانون کے مطابق ہے۔

ایک روایتی قصہ میں بتایا جاتا ہے کہ ایک شخص کے کئی بیٹے تھے۔ جب اس کی موت کا وقت آیا تو اس نے اپنے بیٹوں کو بلایا، اور ان کو ایک بٹی ہوئی رسی دی کہ اس کو توڑو۔ لڑکے اس رسی کو توڑ نہیں پائے۔ پھر اس نے رسی کو کھول دیا، اور ہر بیٹے کو رسی کی ایک ایک لڑی دی۔ اب ہر ایک نے آسانی سے اس کو توڑ دیا۔ اس کے بعد باپ نے کہا کہ دیکھو، اگر تم متحد رہو گے تو کوئی تم کو توڑ نہیں پائے گا، لیکن اگر تم الگ ہوجاؤ تو کوئی بھی شخص تم کو آسانی سے توڑ ڈالے گا۔

اختلاف کو حل کرنے کی تدبیر

قدیم زمانہ میں کہا جاتا تھا کہا: الحَرْبُ أنفَی لِلحَرْبِ (جنگ کا توڑ جنگ ہے)۔ یہ فکر ہزاروں برس سے انسان کے اندر چلا آرہا تھا۔ بدقسمتی سے یہی فکر تاریخی تسلسل کے نتیجہ میں خود مسلمانوں میں کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ حضرت عثمان کی شہادت سے لے کر

اب تک کی مسلم تاریخ میں اس کے نمونے پھیلے ہوئے ہیں۔ 1948 میں فلسطین کا مسئلہ پیدا ہوا، جو عملاً پوری مسلم دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ بن گیا۔ اس وقت بھی تمام مسلم ذہن اسی ڈھنگ پر سوچنے لگے۔ اس سوچ کی نمائندگی ایک عرب شاعر خیر الدین زرکلی (1893-1976) کے شعر میں ان الفاظ میں ملتی ہے:

هَاتِي صَلَاحَ الدِّينِ ثَانِيَةً فِينَا　　وَجَدِّدِي حِطِّينَ أَوْ شِبْهَ حِطِّينَا

یعنی صلاح الدین ایوبی کو ایک بار پھر ہمارے درمیان لاؤ اور حطین یا اس جیسا کوئی اور معرکہ دوبارہ برپا کرو۔ اقبال اپنے علم اور ذہانت کے باوجود اس فکر سے اوپر نہ اُٹھ سکے۔ ان کا پورا کلام کسی نہ کسی طور پر اسی فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ شعر پڑھیے:

گفتند جہان ما آیا بتومی سازد　　گفتم کہ نمی سازد گفتند کہ برہم زن

یعنی پوچھا گیا کہ میری دنیا کا نظام تمہیں پسند آیا؟ میں نے کہا: نہیں۔ کہا گیا: اسے درہم برہم کرڈالو۔ مگر اسلام نے اختلاف کے معاملہ میں زمانی رجحان کے برعکس فطری اصول رائج کیا۔ جنگ کیوں ہوتی ہے۔ جنگ ہمیشہ اختلافات کے نتیجہ میں ہوتی ہے۔ لوگ اختلاف کو صرف مٹانا جانتے تھے، اس لیے وہ فوراً فریقِ ثانی سے لڑ جاتے تھے۔ اسلام نے اس معاملہ میں ایک نئے اُصول کو رواج دیا۔ قرآن میں یہ اُصول ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: الصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔ یعنی، صلح بہتر ہے۔

صلح کیا ہے۔ صلح یہ ہے کہ اختلاف کو مٹانے پر زور نہ دیا جائے بلکہ اختلاف کو گوارہ کرتے ہوئے تعلقات کو بہتر بنانے کی کوشش کی جائے (الصُّلْحُ يَختَصُّ بِإِزَالَةِ النِّفَارِ بَيْنَ النَّاسِ) مفردات القرآن للاصفہانی، صفحہ 489۔ گویا اس کا مطلب ہے، اختلاف کے باوجود اتحاد۔ اس فارمولے کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

Art of difference management

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی اسی تدبیر کا عملی نمونہ ہے۔ مثال کے طور پر آپ نے قدیم مکہ میں 610ء میں لوگوں کو توحید کا پیغام دینا شروع کیا تھا۔ اس وقت توحید کے نقطۂ نظر سے مکہ میں سب سے زیادہ سنگین مسئلہ یہ تھا کہ توحید کے گھر (کعبہ) میں 360 بت رکھے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت قرآن میں اس مفہوم کی کوئی آیت نہیں اتری: طَهِّرِ الْكَعْبَةَ مِنَ الْأَصْنَامِ (کعبہ کو بتوں سے پاک کرو)۔ بلکہ اس کے بجائے قرآن میں یہ آیت اتری: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ (74:4)۔ یعنی، اپنے اخلاق کو درست کرو۔

اس قرآنی اُصول پر عمل کرتے ہوئے پیغمبر اسلام نے یہ کیا کہ آپ نے مکہ کے تیرہ سالہ قیام کے زمانہ میں کبھی بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے آپ نے یہ کیا کہ لوگوں کو توحید کا پیغام دینے کی پر امن جدو جہد شروع کردی۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ ان میں ایک نمایاں مثال صلح حدیبیہ 628ء کا واقعہ ہے۔ یہ صلح گویا ڈیفرنس مینجمنٹ (difference management) کی ایک کامیاب مثال تھی جو انسانی تاریخ میں غالباً پہلی بار نہایت کامیابی کے ساتھ قائم کی گئی۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو سخت انتباہ دیا تھا کہ اختلاف خواہ کتنا ہی بڑا ہو وہ ہر حال میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو حل کرے۔ کسی بھی حال میں وہ ایسا نہ کرے کہ اتحاد کے نام پر اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرے۔ حدیث کے مجموعوں میں کتاب الفتن کے تحت کثرت سے اس قسم کی روایتیں آئی ہیں جن میں یہ کہا گیا ہے کہ میرے بعد امرا اور حکام کے اندر بگاڑ آئے گا مگر تم ہر گز ان سے ٹکراؤ نہ کرنا۔ تم ظلم کے باوجود ان کا حق ادا کرنا اور اپنے حق کے لیے اللہ سے دعا کرنا (أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ وَسَلُوا اللَّهَ حَقَّكُمْ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052۔

اس معاملہ میں ایک حدیث وہ ہے جو ابوداؤد، الترمذی، ابن ماجہ اور مسند احمد میں آئی

ہے۔ یہ ایک لمبی روایت ہے، اس کا آخری حصہ یہ ہے: وَإِنِّي لَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي إِلَّا الْأَئِمَّةَ الْمُضِلِّينَ، فَإِذَا وُضِعَ السَّيْفُ فِي أُمَّتِي لَمْ يُرْفَعْ عَنْهُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (مسند احمد، حدیث نمبر 17115)۔ یعنی مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے زیادہ اندیشہ گمراہ کن لیڈروں سے ہے اور جب تلوار میری امت میں داخل ہوگی تو پھر وہ اس سے قیامت تک نہیں اٹھائی جائے گی۔

اس حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ امت میں جب اختلافات پیدا ہوں گے تو نااہل لیڈر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول پر اس کو رفع نہ کرسکیں گے بلکہ وہ اختلاف کو دور کرنے کے نام پر لڑائی چھیڑ دیں گے اور جب ایک بار امت میں دین کے نام پر لڑائی کی روایت قائم ہوگئی تو اجتماعی نفسیات کی بنا پر وہ قیامت تک جاری رہے گی۔

حدیث کی یہ پیشین گوئی بدقسمتی سے امت کی بعد کی تاریخ کے بارے میں درست ثابت ہوئی۔ امت کے اندر وضعِ سیف (بذریعہ تلوار فیصلہ) کا طریقہ خلیفہ ثالث حضرت عثمان بن عفان کی شہادت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس کے بعد وہ اس طرح مسلسل جاری ہوگیا کہ امت کی ہزار سالہ تاریخ میں وہ کبھی ختم نہیں ہو پایا۔ خلیفہ چہارم اور دمِ عثمان کے نام پر اُٹھنے والوں کے درمیان جنگ، حضرت حسین اور یزید کے درمیان جنگ، بنوامیہ اور بنو عباس کے درمیان جنگ، سنی اور شیعہ کے درمیان جنگ، مغلوں اور غیر مغلوں کے درمیان جنگ، اسی طرح موجودہ زمانہ میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان جنگ، وغیرہ سب اسی کی مثالیں ہیں۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اخْتِلَافُ أُمتِي رَحْمَة (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39)۔ یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف (difference) خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے۔

وہ فطرت کا ایک لازمی جزء ہے اس لیے اختلاف کبھی زندگی سے ختم نہیں ہوتا۔ امت کے اصحابِ علم ومعرفت کو چاہیے کہ وہ اس راز کو سمجھیں اور اختلاف کو مٹانے کی کوشش کرنے کے بجائے اختلاف کے ساتھ جینے کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ ڈیفرنس مینجمنٹ کے اصول پر اس مسئلہ کو حل کریں۔ اس طرح سنت کی پیروی کی صورت میں اختلاف امت محمدی کے لیے رحمت بن جائے گا۔ اختلاف کے ہوتے ہوئے وہ ترقی کا پرامن سفر کامیابی کے ساتھ طے کرسکیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دوسری بہت سی سنتیں ہیں اسی طرح وہ چیز بھی ایک سنت رسول ہے جس کو ہم نے آرٹ آف ڈیفرنس مینجمنٹ کا نام دیا ہے۔ اس اُصول کا تعلق اسلام کے تمام پہلوؤں سے ہے، کوئی بھی پہلو اس سے خالی نہیں۔

مثال کے طور پر فقہی اختلافات جو ہزار سال سے اب تک ٹکراؤ کا سبب بنے ہوئے ہیں ان کے معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا سادہ اُصول یہ ہے کہ یہ مان لیا جائے کہ یہ اختلافات توسع پر مبنی ہیں، نہ کہ تعدد پر۔ ان میں سے جس طریقہ کی بھی پیروی کی جائے وہ درست ہوگا (بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ) جامع بیان العلم لابن عبدالبر، حدیث نمبر 1760۔

اسی طرح حضرت علی اور حضرت معاویہ کا معاملہ یا یہ سوال کہ چاروں خلفاء کے درمیان تفضیل کی بحث۔ اس قسم کے معاملات میں ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق (application) یہ ہے کہ اس کو خدا کے حوالہ کر دیا جائے اور ہر فرقہ اپنی آج کی تعمیری ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں مشغول ہو جائے۔

موجودہ زمانہ میں اکثر مسلم ملکوں میں سیکولر حکمرانوں اور اسلام پسند جماعتوں کے درمیان تباہ کن ٹکراؤ جاری ہے۔ اس معاملہ میں ڈیفرنس مینجمنٹ کا انطباق یہ ہے کہ اسلام پسند جماعتیں حکومت کے دائرہ میں براہ راست مداخلت کا طریقہ چھوڑ دیں۔ وہ غیر حکومتی دائرہ،

مثلاً تعلیم اور حکیمانہ طور پر سماجی اصلاح کے شعبوں میں اپنی کوششیں صرف کریں۔

موجودہ زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان لیڈر یا مسلم گروہ مختلف ملکوں میں کسی نہ کسی قومی یا ملّی مقصد کے حوالہ سے غیر مسلم حکومتوں سے متشددانہ ٹکراؤ کا سلسلہ جاری کیے ہوئے ہیں۔ مثلاً فلسطین اور کشمیر اور چیچنیا اور فلپائن، وغیرہ میں۔ ان مقامات پر ڈیفرنس مینجمنٹ کے اُصول کا انطباق یہ ہے کہ ہر قسم کے تشدد کو مکمل طور پر ترک کر دیا جائے اور صرف مسلّمہ پر امن طریق کار کی پابندی کرتے ہوئے اپنی تحریک چلائی جائے۔

قرآن کی آیت: الصُّلۡحُ خَيۡرٌ (4:128) بتاتی ہے کہ ڈیفرنس مینجمنٹ کا مذکورہ طریقہ مطلق طور پر خیر کا سبب ہے۔ وہ ہر حال میں قابلِ عمل ہے۔ یہ طریقہ صرف اس وقت ناقابل عمل بن جاتا ہے جب کہ مسلمان تشدد کا آغاز کر کے فضا کو بگاڑ دیں۔ تشدد کا آغاز لازمی طور پر جوابی تشدد پیدا کرے گا اور پر امن طریق کار کو اختیار کرنا ممکن نہ رہے گا۔ اگر مسلمان یہ غلطی کریں کہ تشدد کا آغاز کر کے وہ صورت حال کو بگاڑ دیں تو خود انہیں کو دوبارہ صورت حال کو نارمل بنانے کی ذمہ داری لینی پڑے گی۔ اور وہ ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنے تشدد کو یک طرفہ طور پر ختم کر دیں تا کہ وہ موافق فضا پیدا ہو جس میں ڈیفرنس مینجمنٹ پر عمل کرنا ممکن ہو جائے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ مذکورہ اصول فطرت ہی کا ایک اصول ہے جس کو اسلام میں اختیار کیا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ موجودہ دنیا کا نظام خدا نے اس طرح بنایا ہے کہ یہاں لازماً ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات پیدا ہوں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان مختلف اعتبار سے اتنا زیادہ فرق پایا جاتا ہے کہ ہر انسان کو مسٹر ڈیفرنس کہنا صحیح ہوگا۔ اس دنیا میں ہر سماج فرق و اختلاف والا سماج ہے۔ یہ فرق و اختلاف چونکہ خود فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے اس لیے اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔

ایسی حالت میں قابل عمل صورت صرف یہ ہے کہ فرق کے ساتھ نبھانے کا اصول اختیار کیا جائے، نہ کہ فرق کو مٹانے کا۔

It requires difference management rather than eliminating the difference.

فطرت کے اس اصول کا تعلق مذہبی معاملہ سے بھی ہے اور سیکولر معاملہ سے بھی۔ اس دنیا میں کوئی بھی نظام مذہبی ہو یا غیر مذہبی، کامیاب طور پر وہی لوگ بنا سکتے ہیں جو ڈیفرنس مینجمنٹ کا آرٹ جانتے ہوں۔ فرق واختلاف کو مٹانا تشدد پیدا کرتا ہے اور فرق واختلاف کو مینج کرنا امن اور ہم آہنگی کا سبب بنتا ہے۔

فرق واختلاف کوئی بُرائی نہیں، وہ ترقی کا زینہ ہے۔ فرق واختلاف سے اجتماعی زندگی میں چیلنج پیدا ہوتا ہے۔ اور چیلنج کا سامنا کرنا ہی اس دنیا میں ہر قسم کی ترقی کا واحد راز ہے۔

آزادی کا دور

ایک مرتبہ مغرب کے ایک سفر کے دوران میری ملاقات ایک مغربی اسکالر سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ دنیا میں تہذیب کا دور جو آیا ہے، وہ کیسے آیا۔ اس نے کہا کہ فرانس میں جمہوریت کا دور آنے کے بعد اس انقلاب کے بعد پہلی بار یہ ہوا کہ اختلاف رائے (dissent) کو ایک ناقابل تنسیخ حق کا درجہ مل گیا۔ جب ایسا ہوا تو دنیا میں آزادیِ فکر کا دور آ گیا۔ اس آزادیِ فکر سے تمام ترقیاں وجود میں آئیں۔ اس آزادیِ فکر سے لوگوں کو موقع ملا کہ وہ ہر شعبے میں آزادانہ طور پر تلاش وجستجو کریں، اس طرح علم کے بند دروازے کھل گئے، اور ہر قسم کی ترقیاں بلا روک ٹوک ہونے لگیں۔

ترقی ایک فکری عمل ہے۔ فکری عمل کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو آزادانہ

طور پر اپنا عمل کرنے کا موقع ملے۔ آزادیِ فکر کے بغیر علم کے تمام دروازے بند رہتے ہیں، جب کہ آزادیِ فکر کے ماحول میں علم کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں۔ قدیم زمانے میں لمبی مدت تک علم کو ترقی نہیں ہوئی۔ اس کا سبب یہی تھا کہ اہل علم کے لیے آزادانہ جستجو کے مواقع حاصل نہ تھے۔ جدید دور میں جب آزادانہ فکر کے مواقع کھلے تو ہر شخص مسابقت کی دوڑ میں مشغول ہوگیا۔ اس طرح تدریجی پراسس کے تحت علم کی دنیا میں ترقیاں ممکن ہوگئیں۔

علمی ترقی دراصل انسان کے پوٹنشل (potential) کو بروئے کار لانے کا نام ہے، اور پوٹنشل کو بروئے کار لانے کا یہ معاملہ صرف آزادانہ ماحول میں ممکن ہوتا ہے۔ جہاں آزادی نہ ہو، وہاں علمی اور فکری ترقی بھی رک جائے گی۔ اس معاملے میں کسی کے خلاف جارحیت ایک ایسی چیز ہے، جس پر پابندی لگائی جائے۔ اس معاملے میں صحیح اصول یہ ہے کہ جب تک آپ پرامن انداز میں اپنا کام کررہے ہیں، تو آپ کو کامل آزادی حاصل رہے گی، آپ کی آزادی پر پابندی صرف اس وقت لگ سکتی ہے، جب کہ آپ کسی دوسرے شخص کے خلاف جارحیت کا انداز اختیار کریں۔ مثلاً مارنا، پیٹنا، یا تشدد کرنا، وغیرہ۔

درست مشورہ

مسٹر نرسمہا راؤ (P. V. Narasimha Rao,1921-2004) نے 15 اگست 1992 کو بحیثیتِ وزیر اعظم 46 ویں یوم آزادی کی اپنی تقریر میں ایک اہم بات کہی۔ اکثر اخباروں نے اس کو اپنی سرخیوں میں نمایاں کیا ہے۔ ہندوستان ٹائمس (16 اگست 1992) نے اس تقریر کی جو رپورٹ چھاپی اس کی سرخی یہ تھی — وزیر اعظم کی اپیل کہ نزاعی امور کو تین سال کے لیے التوا میں ڈال دیں:

PM (calls) for three-year moratorium on contentious issues.

انھوں نے کہا کہ ہمارے درمیان بہت سے اختلافات ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے کہ اختلافات ہوں۔ مگر زیادہ اہم بات یہ ہے کہ آزادی کے تقریباً آدھی صدی بعد بھی ہم گمبھیر مسائل سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے یکسوئی کی ضرورت ہے۔ ہم کو چاہیے کہ کم از کم اگلے تین سال کے لیے ہم اپنی نزاعی بحثوں کو طاق پر رکھ دیں اور اپنی ساری طاقت ملک کو ترقی کے راستہ پر اٹھانے میں لگا دیں۔

یہی اصول دنیا میں ترقی اور کامیابی کا واحد اصول ہے۔ موجودہ دنیا میں لازماً ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص اور دوسرے شخص، اسی طرح ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان اختلاف اور نزاع پیدا ہو۔ اس دنیا میں بے اختلاف زندگی ممکن نہیں۔ اب اگر ہر شخص اور ہر گروہ اپنی اختلافی باتوں کو لے کر دوسروں سے الجھ جائے تو ترقی کا سفر ناممکن ہو جائے گا۔ اس لیے درست طریقہ یہ ہے کہ اختلافی یا نزاعی باتوں کو اعراض کے خانہ میں ڈال دیا جائے اور اپنی ساری طاقت عملی تعمیر کے کام میں لگائی جائے۔ اگر بالفرض مستقل اعراض ممکن نہ ہو تو کم از کم کچھ مدت کے لیے تو اعراض کے اصول کو اختیار کیے بغیر چارہ ہی نہیں۔

انسان بیک وقت دو محاذ پر اپنی قوت صرف نہیں کر سکتا۔ اگر وہ نزاع میں الجھے گا تو تعمیری کام رک جائیں گے۔ اور اگر تعمیری کاموں میں مصروف ہو گا تو نزاع کے میدان کو خالی چھوڑنا پڑے گا۔ ایسی حالت میں عقل مندی کیا ہے۔ عقل مندی یہ ہے کہ نزاع کو ترک یا ملتوی کر کے اپنی تمام ممکن قوت کو تعمیر و ترقی کی راہ میں لگا دیا جائے۔

ایک مثال

بون (Bonn) جرمنی کی انتہائی قدیم بستی ہے۔ جس کی تاریخ پہلی صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ اس سے بہت سی تاریخیں وابستہ ہیں۔ مثلاً مسیحیت کے دو مذہبی ادارے اینگلیکن چرچ اور اولڈ چرچ کے درمیان زبردست اختلافات تھے جو تقریباً سو سال تک شدت کے ساتھ

جاری رہے۔ آخر کار دونوں کے درمیان گفت وشنید سے ایک معاہدہ ہوا۔ اس معاہدہ کا اعلان بون میں کیا گیا۔ اس لیے اس کو بون اعلان (Declaration of Bonn) کہا جاتا ہے۔ یہ اعلان 1931 میں کیا گیا۔ اس کے تحت دونوں نے ایک دوسرے کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرلیا۔

جب اختلافات نظری اور اعتقادی سطح پر ختم نہ ہورہے ہوں تو بہترین دانش مندی یہ ہے کہ نظری سطح پر اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے عملی سطح پر اس کا خاتمہ کردیا جائے۔

حکمت کی بات

کانگرس کے (سابق) صدر نرسمہاراؤ کا ایک انٹرویو ٹائمس آف انڈیا (یکم جون 1991) میں چھپا ہے۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ہندستانی سماج مختلف قومیتوں کا مشترک سماج ہے، اور اس سماج کے ہر جزء کو آزادی اور برابری کے ساتھ رہنا چاہیے۔ ہندوستان میں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ مل جل کر رہا جائے:

We have a plural society and all segments of the society should exist in freedom and equality. The only way to exist in India is to co-exist.

یہ نہایت صحیح اور درست بات ہے۔ مگر اس کا تعلق صرف ہندستانی سماج سے نہیں ہے، بلکہ دنیا کے ہر سماج سے ہے۔ یہی طریقہ پاکستان اور افغانستان کے لیے بھی صحیح ہے اور یہی طریقہ یورپ اور امریکا کے لیے بھی۔ چاہے ایک خاندان کا معاملہ ہو یا پوری زمین کا معاملہ، اس دنیا میں زندہ رہنے کی یہی واحد صورت ہے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے زندگی گزاری جائے۔ اگر برداشت اور رواداری (ٹالرنس) کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو اس زمین پر نہ ایک خاندان بن سکتا اور نہ ایک ملک۔

اس دنیا میں اختلاف کا موجود ہونا اتنا ہی فطری ہے جتنا خود انسان کا موجود ہونا۔ جہاں انسان ہوں گے وہاں اختلاف ہوگا، خواہ یہ انسان ایک مذہب اور کلچر کے ہوں یا کئی مذہب اور کلچر کے۔ ایسی حالت میں انسان کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے۔ یا تو وہ اختلاف کو برداشت کرے یا اختلاف کو برداشت نہ کرکے دوسروں سے ہمیشہ لڑتا جھگڑتا رہے۔

ہمارے لیے انتخاب کا موقع اختلاف اور بے اختلاف میں نہیں ہے بلکہ اختلاف کو برداشت کرنے یا اختلاف کو برداشت نہ کرکے مر جانے میں ہے۔ اگر ہم زندگی چاہتے ہیں تو وہ صرف اختلاف کو برداشت کرنے ہی میں مل سکتی ہے۔ اس کے بعد دوسرا جو امکان ہے وہ لڑ کر اپنے کو برباد کر لینے کا ہے۔ اس کے سوا کسی تیسرے انتخاب کا ہمارے لیے موقع نہیں۔

اختلاف نہیں

سب سے اچھا انسان نو پرابلم انسان ہے۔ انسانی زندگی میں نزاع اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ ہر آدمی اپنا ایک ذہن بنا لیتا ہے۔ وہ اسی ذہن کو اچھا سمجھتا ہے۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ اسی کی بات چلے۔ اسی سے تمام جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر آدمی بے مسئلہ انسان بن جائے تو ہر مسئلہ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔

اجتماعی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک ہی بات سب سے زیادہ صحیح بات ہو۔ عام طور پر چیزوں کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ ایک پہلو سے اگر آپ دیکھیں تو وہ صحیح دکھائی دے گا، لیکن اگر اینگل بدل دیا جائے تو دوسری بات صحیح نظر آنے لگے گی۔

اس کے لیے ضروری ہے کہ آپس میں مشورہ کا ماحول ہو۔ مشورہ دراصل اپنی عقل میں دوسروں کی عقل کو شامل کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں محدود طور پر چیزوں کو

دیکھ پاتا ہے، یا سوچ پاتا ہے۔ اس کی یہ محدودیت اس وقت ختم ہوسکتی ہے، جب کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ کوآپریشن (cooperation) کرنا سیکھے۔

آپسی اختلاف کو ختم کرنے کی سب سے آسان صورت یہ ہے کہ کوئی فریق مسئلے کو ایگو کا مسئلہ نہ بنائے۔ ہر ایک اس کے لیے تیار رہے کہ وہ نزاع کے بغیر دوسرے کی بات مان لے گا۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ اگر دوسرے کی بات چلی تو میری ہار ہوجائے گی۔ ہر آدمی دوسرے کی بات ماننے کے لیے تیار رہے۔ وہ مسئلے کو اس نظر سے دیکھے کہ زیادہ بہتر طریقے سے کام کو کیسے آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

سارا معاملہ تنگ نظری اور وسعتِ نظری کا ہے۔ اگر تنگ نظری کی نگاہ سے دیکھا جائے تو دوسرے کی بات ماننا، دوسرے کے آگے جھکنا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر وسعت نظری کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوگا کہ یہ بات اپنی ہی بات ہے۔ ہر جیت خود اپنی ہی جیت ہے۔

سب سے بری چیز خود غرضی (selfishness) ہے۔ اگر آدمی خود غرضی میں جیے تو ہر بات اس کو مسئلہ معلوم ہوگی، اور اگر آدمی خود غرضی سے اوپر اٹھ جائے تو اپنے اور غیر کا فرق ختم ہوجاتا ہے۔ پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا اپنی ہے، اور سارے انسان اپنے انسان ہیں۔

شکایت کا مزاج

مولانا آپ شکایت کو شکر کا قاتل سمجھتے ہیں آخر کیوں شکایت اتنی بری چیز ہے، کیا شکایت والا ذہن کفر تک پہنچا دیتا ہے؟ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

میں یہ نہیں کہتا کہ شکایت کفر ہے۔ شکایت صرف ایک برائی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ برائیوں کی جڑ ہے۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری برائیوں کا نام شکایت

ہے۔یعنی شکایت اپنے ساتھ بہت سی دیگر برائیاں بھی لاتی ہے۔ اس طرح سے شکایت برائیوں کا منبع بن جاتی ہے۔ اگر آپ پتھر کا ایک ٹکڑا اپنی جیب میں رکھ لیں تو وہ جیسا آج ہے، ویسا ہی سو سال تک رہے گا۔لیکن شکایت کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ شکایت ہمیشہ گرو (grow) کرتی ہے،یعنی وہ برابر بڑھتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ انسان کی پوری شخصیت پر چھاجاتی ہے۔شکایت کوئی پازیٹیو (positive) چیز نہیں۔وہ انسان کی شخصیت کو منفی شخصیت بنادیتی ہے۔جو انسان شکایت کی نفسیات میں جیتا ہو، وہ شکر کی نفسیات سے خالی ہوگا۔

کسی انسان کے اندر شکایت کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ انسان منصوبۂ تخلیق سے بے خبر ہے۔ اللہ رب العالمین کے منصوبۂ تخلیق کے مطابق، اس دنیا میں انسان کو مصیبت سے چھٹکارا نہیں۔ انسان مصیبت کی وجہ سے شکایت میں مبتلا ہوتا ہے۔اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ۔ أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (2:155-157) ۔یعنی ہم ضرور تم کو آزمائیں گے کچھ ڈر اور بھوک سے اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے، اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری دے دو۔جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اوپر ان کے رب کی شاباشیاں ہیں اور رحمت ہے، اور یہی لوگ ہیں جو راہ پر ہیں۔

اس آیت سے یہ سبق ملتا ہے کہ شکایت انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے ایک قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان اپنے اندر صبر یعنی پازیٹیو سوچ کی صفت پیدا کرے۔ یہ اس کی شخصیت کی تعمیر کرے گی۔

اعتدال کا مطلب

ایک روایت کافی مشہور ہے۔ یہ روایت صحاح ستہ میں موجود نہیں، البتہ وہ دوسری کتب حدیث میں پائی جاتی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: خَيْرُ الْأُمُورِ أَوْسَاطُهَا (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 7176)۔ دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں: خيرُ الأمورِ أوسَطُها (جامع الأصول، جلد، 10، صفحہ 130)۔ یعنی، معاملات میں بہتر طریقہ درمیانی طریقہ (middle path) ہے۔

اس روایت میں خیر الامور کا لفظ ہے، لیکن اکثر لوگوں نے اس کی توسیع کرکے اس کو خیر الافکار کے معنی میں لے لیا ہے۔ مگر یہ درست نہیں۔ یہ روایت عملی معاملات کے لیے ہے، وہ فکری معاملات کے لیے نہیں۔ مثلاً نفل نمازوں یا نفل روزوں کے بارے میں کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو اس سے کہا جائے کہ تم درمیانی طریقہ یا اعتدال کا طریقہ اختیار کرو، نہ بہت کم نہ بہت زیادہ۔ اسی طرح انفاق کے معاملے میں کوئی شخص مسئلہ پوچھے تو اس سے بھی یہی کہا جائے گا کہ اعتدال کے ساتھ انفاق کرو۔ جیسا کہ قرآن میں آیا ہے: وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا (17:29)۔ یعنی، اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن سے باندھ لو اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو کہ تم ملامت زدہ اور عاجز بن کر رہ جاؤ۔

مگر افکار کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ افکار کے معاملے میں یہ دیکھا جائے گا کہ قرآن وسنت کی روشنی میں کون سا فکری موقف صحیح ہے اور کون سا فکری موقف غلط۔ مثلاً متطرفین (extremists) اور غیر متطرفین کے درمیان کوئی بیچ کا راستہ یا مسلک اعتدال نہیں ہوتا۔ یہاں یہ بتانا پڑتا ہے کہ دونوں میں سے کون سا گروہ صحیح ہے اور کون سا گروہ غلط۔ فکری معاملے میں قرآن کا اصول یہ ہے کہ حق کے بعد جو چیز ہے وہ ضلالت ہے: فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ (10:32)۔

اصل یہ ہے کہ عملی معاملات میں اعتدال کا طریقہ حکمت کا طریقہ ہے۔ اس کے برعکس، فکری معاملات میں اعتدال کا طریقہ شبہ نفاق کی حیثیت رکھتا ہے۔ فکری معاملات میں وضوح (clarity)، اور یقین (conviction) مطلوب ہوتا ہے۔ اگر اعتدال کے طریقے کو فکر تک وسیع کیا جائے تو لوگوں کے ذہنوں میں یقین بھی ختم ہو جائے گا، اور وضوح بھی۔

متعصبانہ طرزِ فکر

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث ان الفاظ میں آئی ہے: حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 5130)۔ یعنی کسی چیز کی محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔

اس حدیث میں حُبّ سے مراد سادہ طور پر صرف محبت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد غلو آمیز محبت ہے۔ اس حدیث میں حُبّ کے جس غیر مطلوب نتیجے کا ذکر ہے، اس کا تعلق غلو آمیز محبت سے ہے، نہ کہ صرف محبت سے۔ غلو آمیز محبت آدمی کے اندر جو غیر مطلوب صفت پیدا کرتی ہے، وہ وہی چیز ہے جس کو متعصّبانہ فکر (biased thinking) کہا جاتا ہے۔ یہی متعصّبانہ فکر ہے جو آدمی کو کسی چیز کے بارے میں اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ مثلاً موجودہ زمانے میں قوم پرستی اس کا ایک ظاہرہ ہے۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب اپنی کمیونٹی اور دوسری کمیونٹی کا کوئی معاملہ پیش آجائے تو وہ اپنی کمیونٹی کی غلطی سمجھ نہیں پاتے۔ ان کا ذہن یہ بن جاتا ہے کہ میں ہر حال میں اپنی کمیونٹی کے ساتھ دوں گا، خواہ وہ صحیح ہو یا غلط:

My community, right or wrong

اس متعصّبانہ طرز فکر کا بیک وقت دو نقصان ہے۔ ایک یہ کہ خود آدمی کے اندر ابدی طور پر منفی سوچ (negative thinking) پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس صلاحیت سے محروم

ہوجاتا ہے کہ وہ چیزوں کو غیر جانبدارانہ انداز (impartial way) میں دیکھ سکے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ وہ خود اپنی کمیونٹی کے لیے ایک برا قائد بن جاتا ہے۔ اختلافی معاملات میں وہ اپنی کمیونٹی کو صحیح رہنمائی نہیں دے پاتا۔

متعصّبانہ طرزِ فکر ہر حال میں ایک تباہ کن طرزِ فکر ہے۔ ایسا آدمی اس سے محروم ہوجاتا ہے کہ وہ دنیا میں اس صالح غذا کو لے سکے جو اس کے خالق نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اور جس کو قرآن میں رزقِ رب کہا گیا ہے۔ رزقِ رب کا حصول اس دنیا میں ربانی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے، لیکن اپنے اندر ربانی شخصیت کی تعمیر کی سعادت صرف اس شخص کو ملتی ہے جس کے اندر مثبت سوچ پائی جائے۔

اجتماعی کام کی اہمیت

حدیث میں آیا ہے کہ: يَدُ اللّٰهِ مَعَ الجَمَاعَةِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2166)۔ یعنی اللہ کی مدد جماعت کے ساتھ ہے۔

اس حدیثِ رسول میں 'جماعت' سے مراد وہی چیز ہے جس کو ٹیم (team) کہا جاتا ہے۔ اللہ کا ہاتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب کچھ لوگ ایک ٹیم بنا کر کام کرتے ہیں تو اللہ کے قائم کردہ فطرت کے قوانین ان کے مددگار بن جاتے ہیں۔ کسی گروہ میں ٹیم اسپرٹ اس بات کی ضامن ہوتی ہے کہ اس کا شروع کیا ہوا کام کسی غیر ضروری مسئلہ (problem) کا شکار نہ ہو۔ ہر فرد کی صلاحیت مقرر نشانے کے لیے بھرپور طور پر استعمال ہوتی رہے۔ جس گروہ کے افراد میں حقیقی طور پر ٹیم اسپرٹ موجود ہو، اس کے افراد اپنی نفسیات کے اعتبار سے، اس سے بلند ہوجاتے ہیں کہ وہ شکایت اور اختلاف کو عذر (excuse) بنا لیں۔ ایسے لوگوں کی اجتماعی جدوجہد کا یہ انجام کبھی نہیں ہوتا کہ اس کے افراد اختلاف و انتشار کا شکار ہوکر

بکھر جائیں، اور مطلوب مشن اپنی تکمیل تک پہنچنے سے پہلے ختم ہو جائے۔

کوئی بڑا کام صرف اجتماعی کوشش سے انجام پاتا ہے۔ اجتماعی کوشش کی کامیابی کی دو بنیادی شرطیں ہیں۔ یہ شرطیں قرآن کی ایک آیت سے معلوم ہوتی ہیں۔ وہ آیت یہ ہے: وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعاً وَلَا تَفَرَّقُوا (3:103)۔ یعنی تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور متفرق نہ ہو۔

قرآن کی اس آیت میں "حبلُ اللہ" سے مراد مشترک نظریاتی بنیاد ہے۔ متفرق نہ ہونے کا تعلق عملی جدوجہد سے ہے۔ کامیاب عملی جدوجہد کی شرط یہ ہے کہ ہر حال میں باہمی اتحاد کو برقرار رکھا جائے۔ اور عذر، خواہ وہ کتنا ہی قوی ہو، اس کو ٹیم سے علاحدگی کا جواز (justification) نہ بنایا جائے۔ ان دو بنیادی شرطوں کے ساتھ جو اجتماعی جدوجہد کی جائے، اس کو ضرور اللہ کی نصرت حاصل ہوتی ہے، اور جس جدوجہد کو اللہ کی نصرت حاصل ہو جائے، اس کی کامیابی کو روکنے والا کوئی نہیں۔

اختلافِ کثیر

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت میں جو فتنے پیدا ہونے والے تھے، اس کے بارے میں بہت سی روایتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں۔ مثلاً ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: فَإِنَّهُ مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِي فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيرًا (سنن أبی داؤد، حدیث نمبر 4607)۔ یعنی، میرے بعد تم میں سے جو لوگ زندہ رہیں گے، وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھیں گے۔

اس دورِ اختلاف میں امت کے افراد کو کیا کرنا ہے، اس کے بارے میں روایتوں میں امت کے لیے آپ کی مختلف ہدایات آئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے: مَنْ كَانَ لَهُ إِبِلٌ فَلْيَلْحَقْ بِإِبِلِهِ، وَمَنْ كَانَتْ لَهُ غَنَمٌ فَلْيَلْحَقْ بِغَنَمِهِ، وَمَنْ كَانَتْ لَهُ أَرْضٌ فَلْيَلْحَقْ بِأَرْضِهِ

(صحیح مسلم، حدیث نمبر 2887)۔ یعنی، جس شخص کے پاس اونٹ ہو، وہ اپنے اونٹ سے ملحق ہوجائے اور جس شخص کے پاس بکری ہو، وہ اپنی بکری سے ملحق ہوجائے اور جس شخص کے پاس کھیت ہو، وہ اپنے کھیت کے ساتھ ملحق ہوجائے۔

اس کا مطلب یہ ہے، کہ جب امت میں اختلاف وانتشار پیدا ہوجائے تو اس وقت ایک خداترس مومن کو یہ کرنا ہے کہ وہ خود اپنے آپ میں مشغول ہوجائے، اس کو چاہیے کہ وہ دوسروں کے اوپر احتسابی نظر ڈالنے کے بجائے خود اپنے آپ پر فوکس کرے، اصلاح غیر کا جھنڈا اٹھانے کے بجائے وہ اصلاحِ خویش کو اپنا کنسرن (concern) بنالے۔ وہ محدود دائرے میں اپنی ذاتی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے دوسروں کے لیے دعائے خیر کرے۔

اختلاف و انتشار کی صورتِ حال دراصل اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ امت دورِزوال میں پہنچ جائے۔ ایسے حالات میں اصلاحِ غیر کی مہم چلانا عملی نتیجے کے اعتبار سے صرف اختلاف وانتشار کو بڑھاوا دینے کے ہم معنی ہوتا ہے؟ اس لیے ایسے حالات میں نتیجہ کو دیکھتے ہوئے اپنے عمل کا منصوبہ بنانا چاہیے، نہ کہ صرف اپنے ذہنی معیار کو سامنے رکھ کر۔

ایسی بحثیں نہ چھیڑو جو لوگوں کو اللہ سے غافل کردے

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْتَرِي لَهْوَ الْحَدِيثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِ اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّخِذَهَا هُزُواً أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ ۔ وَإِذَا تُتْلَى عَلَيْهِ آيَاتُنَا وَلَّى مُسْتَكْبِراً كَأَنْ لَمْ يَسْمَعْهَا كَأَنَّ فِي أُذُنَيْهِ وَقْراً فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (31:6-7)۔ یعنی، اور لوگوں میں کوئی ایسا ہے کہ مول لیتا ہے غافل کرنے والی بات (لَهْوَ الْحَدِيث) کو تاکہ اللہ کی راہ سے بے سمجھے بھٹکا دے اور اس کی ہنسی

اڑائے۔ ایسے لوگوں کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے۔ اور جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ گھمنڈ کے ساتھ اس طرح منھ موڑ لیتا ہے جیسے اس کو سنا ہی نہیں۔ جیسے اس کے کان بہرے ہیں۔ اس کو خبر دے دو دکھ والے عذاب کی۔

اس آیت میں لَھْوَ الْحَدِیثِ سے کیا مراد ہے۔ اس سلسلے میں مفسرین کی رائے مختلف ہیں۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے اس کی تفسیر غناء سے کی ہے، اور ضحاک نے شرک سے (تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 109)۔ مگر مفسرین کے (entertainment song and music) اصول کے مطابق، اس کا شان نزول اگرچہ خاص ہو تب بھی عموم الفاظ کی وجہ سے اس کا حکم عام رہے گا۔ جو لہو یا شغل بھی سبیل اللہ سے ہٹانے کا سبب بنے وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل ہوگا۔ ابن جریر نے کہا ہے کہ ہر وہ کلام لہو الحدیث ہے جو اللہ کی آیتوں سے روکے اور اس کے راستہ کے اتباع سے ہٹائے (كُلُّ كَلَامٍ يَصُدُّ عَنْ آيَاتِ اللّٰهِ وَاتِّبَاعِ سَبِيلِهِ) تفسیر ابن کثیر، جلد 6، صفحہ 109۔ حسن بصری نے کہا کہ ہر وہ چیز لہو الحدیث ہے جو اللہ کی عبادت اور اس کی یاد سے ہٹانے والی ہو مثلاً فضول قصہ گوئی، ہنسی مذاق کی باتیں، بے کار مشغلے، گانا بجانا وغیرہ (كُلُّ مَا شَغَلَكَ عَنْ عِبَادَةِ اللّٰهِ تَعَالَى وَذِكْرِهِ مِنَ السَّمَرِ وَالأَضَاحِيكِ وَالخُرَافَاتِ وَالغِنَاءِ وَنَحْوِهَا) روح المعانی، جلد 11، صفحہ 66۔

موجودہ زمانہ میں کون سی چیزیں ہیں جو لہو الحدیث کا مصداق ہیں — وہ تمام تفریحی تماشے اور وہ سستا لٹریچر اس میں شامل ہے جو اپنی سنسنی خیزی اور رومانیت کی وجہ سے لوگوں کے لیے ذہنی شراب بنا ہوا ہے۔ اس میں وہ مقدس حلقے بھی شامل ہیں جنھوں نے بناوٹی قصے کہانیوں کی ایک مذہبی طلسم ہوش ربا تیار کر رکھی ہے اور اس کو سنا سنا کر لوگوں کو مدہوش رکھتے ہیں۔ وہ شعر و شاعری اور خطابت بھی اس میں شامل ہے جو لفظ بازی کے کرتب دکھا کر لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

اسی طرح اس میں وہ سیاسی تحریکیں بھی شامل ہیں جو سیاست کی چاشنی تقسیم کرکے لوگوں کو اپنی طرف مائل کیے ہوئے ہیں۔ پھر اس میں وہ تمام مذہبی مناظرے (مسلکی اختلافات) بھی شامل ہیں جو لوگوں کے ذہنوں کو غیر متعلق بحثوں میں الجھا کر مثلِ صحابہ ایمان سے دور کر دیتے ہیں۔ غرض وہ تمام آوازیں جو جو تفریحی دل چسپی کا سامان پیدا کر کے لوگوں کو حق کے راستے سے غافل کریں اور اللہ کے سیدھے سادے دین سے بے رغبت کریں۔ وہ سب درجہ بدرجہ اس میں شامل رہیں گی۔ خواہ اپنے اس مشغلہ کو انھوں نے ارادۃً حق سے روکنے کے لیے جاری کیا ہو یا ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے بطور واقعہ یہ نتیجہ برآمد ہو رہا ہو۔

نزاع کا مسئلہ

دو فریقوں کے درمیان اگر نزاع پیدا ہو جائے تو اس وقت یہ موقع نہیں ہوتا ہے کہ کون صحیح ہے، اور کون غلط۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ آپ یہ تلاش کریں کہ نزاع کو فوری طور پر ختم کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ کیوں کہ نزاع کو ختم کرنے سے آپ کو نیا اسٹارٹنگ پوائنٹ (starting point) مل جاتا ہے، اور اگر آپ نزاع کو ختم نہ کریں تو آپ کو کوئی اسٹارٹنگ پوائنٹ نہیں ملے گا۔ آپ ہمیشہ منفی ذہن میں جیتے رہیں گے، اور نئے آغاز کے لیے کوئی سرا کبھی نہ پا سکیں گے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے 610 عیسوی میں اپنے مشن کا آغاز کیا۔ اس وجہ سے قدیم مکہ کے قریش آپ کی مخالف ہوگئے۔ یہاں تک کہ تیرہ سال بعد آپ کو مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جانا پڑا۔ اس کے باوجود اہل قریش آپ کے خلاف نزاع کے طریقے پر باقی رہے۔ چنانچہ 628 عیسوی میں آپ نے قریش کے ساتھ حدیبیہ کے مقام پر ایک معاہدہ کیا۔ یہ معاہدہ یک طرفہ طور پر قریش کے حق میں تھا۔ اس کے باوجود آپ نے یہ معاہدہ کیا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی معاملے میں جب دو نزاعی فریق بن جائیں تو دونوں میں سے کوئی فریق جج کی سیٹ پر نہیں ہوتا ہے۔ جو انصاف کی بنیاد پر اگلے فریق کو اس کا حق عطا کرے۔ اس لیے آئڈیل کی بنیاد پر نزاع کو ختم کرنا عملی طور پر لاحاصل ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر عقل مند وہ ہے، جو تاخیر کے بغیر پریکٹکل کی بنیاد پر نزاع کو ختم کردے۔ تاکہ نیا آغاز شروع ہو سکے۔

نزاع کیوں پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سبب ایگو (ego) کا ہرٹ ہونا ہے، اور جب ایگو ہرٹ ہوجائے تو معاملہ عقلی بنیاد پر حل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ پریکٹکل وزڈم کی بنیاد پر حل ہوتا ہے۔ پیغمبر اسلام نے حدیبیہ کے موقع پر یہ دیکھا کہ جب آئڈیل کو بنیاد بنایا جائے تو معاہدہ نہیں ہوسکتا ہے، اور نزاع بدستور جاری رہے گا۔ چنانچہ آپ نے یک طرفہ طور پر قریش مکہ کی تمام شرائط کو مان کر نزاع کو ختم کردیا۔ یہاں تک کہ انھوں نے جب یہ مطالبہ کیا کہ ”رسول اللہ“ کا لفظ مٹایا جائے تو آپ نے یہ مطالبہ بھی مان لیا۔ آپ کا یہ عمل پریکٹکل وزڈم کی بنیاد پر نزاع کو ختم کرنے کی روشن مثال ہے۔

نزاع مینجمنٹ

نزاع پیدا ہونے کے وقت کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے، وہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے: فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ (22:67)۔ اس آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے: پس وہ امر میں ہرگز تم سے نزاع نہ کریں۔ لفظی طور پر دیکھیے تو بظاہر اس آیت میں فریقِ ثانی کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ ہرگز تم سے نزاع نہ کرے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ بلکہ عربی اسلوب کے مطابق، اس کا مطلب یہ ہے کہ فریق ثانی کو تم یہ موقع نہ دو کہ وہ تم سے نزاع کرے۔

اس آیت کی تفسیر میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی (وفات 1810ء) نے زجاج کا قول نقل کیا ہے: قَالَ الزَّجَّاجُ: مَعْنَى قَوْلِهِ ”فَلَا يُنَازِعُنَّكَ“ لَا تُنَازِعْهُمْ أَنْتَ، كَمَا يُقَالُ: ”لَا يُخَاصِمَنَّكَ فُلَانٌ“ أَيْ لَا تُخَاصِمْهُ، وَهَذَا جَائِزٌ فِيمَا يَكُونُ بَيْنَ اثْنَيْنِ، فَلَا يَجُوزُ ”لَا

يَضْرِبَنَّكَ زَيْدٌ "تُرِيدُ لَا تَضْرِبْهُ، وَجَازَ "لَا يُضَارِبَنَّكَ زَيْدٌ" بِمَعْنَى لَا تَضْرِبْهُ، وَذَلِكَ لِأَنَّ الْمُنَازَعَةَ وَالْمُخَاصَمَةَ لَا تَتِمُّ إِلَّا بِاثْنَيْنِ، فَإِذَا تَرَكَ أَحَدُهُمَا ذَهَبَتِ الْمُخَاصَمَةُ (تفسیر المظہری، جلد6، صفحہ346)۔ یعنی زجاج نے کہا بظاہر نزاع کی ممانعت مشرکوں کو ہے، لیکن حقیقت میں ممانعت کا رخ رسول اللہ کی طرف ہے۔ عرب کہتے ہیں فلاں شخص تم سے جھگڑا نہ کرے، یعنی تم اس سے جھگڑا نہ کرو۔ لیکن ایسا ان افعال میں ہوتا ہے جو طرفین سے صادر ہوں۔ پس... لاَ يُضَارِ بَنّکَ زَیْدٌ (زید تم سے مار پیٹ نہ کرے) کا مطلب یہ ہے کہ تم زید کو نہ مارو۔ کیوں کہ مخاصمت اور نزاع دو آدمیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جب ایک فریق نزاع ترک کردے تو مخاصمت اپنے آپ باقی نہیں رہتا۔

اس اصول کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ نزاع (controversy) پیدا ہو تو اس کو جوابی نزاع تک پہنچنے نہ دو۔ بلکہ اس پر نزاع مینجمنٹ کے حکیمانہ اصول کو اپلائی کرتے ہوئے پہلے ہی مرحلے میں ختم کردیا جائے۔ نزاع عملاً ایک فریق کی طرف سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن اگر فریقِ ثانی نزاع کو یک طرفہ طور پر ختم کردے تو نزاع عملاً باقی نہیں رہے گا۔ نزاع اگرچہ دوطرفہ عمل ہے، لیکن نزاع کو ختم کرنا، ہمیشہ ایک فریق کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

مینجمنٹ نہ کہ ردعمل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ سنتیں ایسی ہیں، جو آپ کے قول سے نکلتی ہے، اور کچھ سنتیں ایسی ہیں، جو آپ کے عمل سے اخذ ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا، قَالَتْ: مَا خُيِّرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَمْرَيْنِ إِلَّا اخْتَارَ أَيْسَرَهُمَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6786)۔ یعنی، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب بھی دو معاملات کے درمیان اختیار دیا گیا، تو آپ نے ان

دونوں میں سے آسان تر کا انتخاب کیا۔ اس حدیث رسول کی شرح ایک اور حدیث سے ہوتی ہے۔ اس دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2317)۔ یعنی آدمی کے اچھے اسلام میں سے یہ ہے کہ وہ اس کو چھوڑ دے، جو اس کے لیے بے نتیجہ ہو۔

یہ حدیث اجتماعی زندگی کے بارے میں ہے۔ اجتماعی زندگی، خواہ وہ گھریلو معاملات ہو یا وہ سوشل معاملات ہو، اس میں کام کے دو طریقے ہیں۔ اجتماعی معاملات میں جب کوئی مسئلہ پیش آئے، تو ایک طریقہ وہ ہے، جو مجرد ری ایکشن (reaction) ہو۔ مثلاً کسی نے آپ کی طرف پتھر مارا، تو آپ بھی اس کی طرف پتھر پھینکنا شروع کر دیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ آپ ٹھہر کر سوچیں، اور پلاننگ کے بعد نتیجہ خیز اقدام کا طریقہ اختیار کریں۔ اس طرح کے معاملے میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ طریقہ اختیار کیا جائے، جو نتیجہ خیز (result oriented) ہو۔

مثلاً مکہ میں آپ نے توحید کا مشن شروع کیا، تو اس وقت قدیم کعبہ میں بہت سے بت رکھے ہوئے تھے، یعنی بظاہر یہ صورتِ حال تھی کہ توحید کے مرکز کو بت پرستی کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔ لیکن رسول اللہ نے ردعمل (reaction) کا طریقہ نہیں اختیار کیا، بلکہ سوچ سمجھ کر کے پرامن تدبیر کا طریقہ اختیار کیا۔ اگر آپ ردعمل کا طریقہ اختیار کرتے تو قدیم مکہ کے مشرکین سے ٹکراؤ شروع ہو جاتا۔ لیکن آپ نے خاموش منصوبہ بندی کے ذریعے غیر نزاعی پلاننگ کا طریقہ اختیار کیا۔ یہ ایک نتیجہ خیز طریقہ تھا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں کعبہ کی عمارت بتوں سے خالی ہو گئی، اور بتدریج دوبارہ توحید کا مرکز بن گئی۔

منفی جذبات کی قربانی

دین کی راہ میں قربانی کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ قربانی کے بغیر دین کا کوئی بڑا کام نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف دین کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ سماج کا کوئی بھی تعمیری

کام قربانی کے بغیر ممکن نہیں۔ جتنی بڑی قربانی اتنا ہی بڑا کام۔ قربانی سے عام طور پر عید الاضحیٰ کے موقع پر جانوروں کا ذبح کرنا مراد لیا جاتا ہے۔ قربانی کی ایک قسم وہ ہے، جب کہ آدمی کو اللہ کے راستے میں مال دینا پڑے۔ اسی طرح قربانی کی ایک قسم وہ ہے، جب کہ آدمی کو اللہ کے راستے میں جسمانی مصیبت اٹھانی پڑے۔ یہ قربانی کی صورتیں ہیں۔ لیکن دین میں سب سے اعلیٰ قربانی وہ ہے، جب کہ آدمی کو اپنے منفی جذبات پر روک لگانا پڑے۔

بعض اوقات اس کا تقاضا ہوتا ہے کہ اپنے منفی جذبات پر روک لگا کر اس کی قربانی پیش کی جائے۔ سماج میں رہتے ہوئے کسی کے ساتھ کوئی اختلاف ہوجائے، کسی بات سے اس کی انا کو چوٹ لگے، اس کے باوجود اللہ کی راہ میں اس کی استقامت پر فرق نہ آئے۔ اس کی بڑائی کا جذبہ مجروح ہو مگر وہ کسی شکایت کے بغیر اس کو بخوشی برداشت کرلے۔ اللہ کی راہ میں اس کو اپنی خواہشات کو دبانا پڑے مگر وہ اس کو رضامندی کے ساتھ گوارا کرلے۔

قربانی کی یہ قسم ایک غیر معمولی قربانی ہے۔ ایسی قربانی کو جھیلنا، بلاشبہ ایک سخت مشکل کام ہے۔ لیکن کوئی بندہ اللہ کی راہ میں جب اپنی رضامندی سے ایسی قربانی کو برداشت کرے، تو اس پر اس کو بلاشبہ اجر عظیم عطا ہوگا۔ اس حقیقت کو ایک حدیثِ رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک کسی گھونٹ کا ثواب اس غصہ کے گھونٹ سے زیادہ نہیں، جسے بندہ اللہ کی رضا کے لیے پی جائے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4189)۔

ایسی قربانی کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے، جب کہ اللہ کی راہ میں آدمی کو اپنا ایک رول ادا کرنا ہو۔ لیکن یہ قربانی دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی صبر اور ماڈسٹی کا طریقہ اختیار کرے۔ وہ سادہ زندگی پر راضی ہوجائے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے لوگ موجود ہیں، اور ایسے لوگوں نے اپنے عمل سے اسلام کی عظیم تاریخ بنائی ہے۔

اختلاف کے وقت

اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔مختلف اسباب سے لوگوں کے درمیان اختلاف ہوتا رہتا ہے۔جس طرح عام لوگوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے، اسی طرح مخلص اور مومن کے درمیان بھی اختلاف پیش آتا ہے۔ اختلاف کے ہونے کو روکا نہیں جا سکتا۔ البتہ یہ ہوسکتا ہے کہ اختلاف کے باوجود آدمی اپنے آپ کو صحیح رویہ پر قائم رکھے۔

مومن وہ ہے جو اختلاف کو نیت کا مسئلہ نہ بنائے۔ اختلاف کو اسی دائرہ تک محدود رکھے جہاں اختلاف پیدا ہوا ہے۔ ایک معاملہ میں اختلاف کی وجہ سے کسی کو ہر معاملہ میں غلط سمجھ لینا، ایک معاملہ میں اختلاف پیش آنے کے بعد اس کو منافق، بدنیت اور غیر مخلص کہنے لگنا، یہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔

اختلاف پیش آنے کے وقت تعلقات ختم کرنا صحیح نہیں۔ اختلافی مسئلہ پر سنجیدہ بحث جاری رکھتے ہوئے باہمی تعلقات کو بدستور قائم رکھنا چاہیے۔ اختلاف والے شخص سے سلام وکلام بند کرنا یا اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دینا کسی بھی حال میں درست نہیں۔

موجودہ دنیا میں ہر چیز برائے امتحان ہوتی ہے۔ اسی طرح اختلاف بھی امتحان کے لیے ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اختلاف کے وقت سخت محتاط رہے۔ وہ مسلسل کوشش کرے کہ اس سے کوئی ایسا غلط ردعمل ظاہر نہ ہو جو اللہ کو پسند نہیں۔

اختلاف کے وقت انصاف پر قائم رہنا بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔مگر اس کا ثواب بھی بہت زیادہ ہے۔ اسلام میں ہر درست کام عبادت ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک اعلیٰ عبادت ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورت پیش آنے کے باوجود آدمی اپنے دل کو دشمنی اور انتقام کی نفسیات سے بچائے، اختلاف کے باوجود وہ انصاف کی روش پر قائم رہے۔

اختلاف پیش آنا برا نہیں، برا یہ ہے کہ اختلاف پیش آنے کے بعد آدمی امتحان میں پورا نہ اترے۔ اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد میں رہنا عظیم اسلامی عمل ہے، اور اختلاف کے وقت تقویٰ کی حد سے نکل جانا انتہائی سنگین قسم کا غیر اسلامی عمل۔

کامیابی کا راز

ایک امام صاحب کا واقعہ ہے۔ وہ اپنی مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیتے تھے۔ خطبے سے پہلے وہ اردو میں تقریر کرتے تھے۔ اِس تقریر میں وہ اکثر یہ کرتے کہ اختلافی مسائل میں شدید رویّہ اختیار کرتے۔ وہ اپنی سمجھ کے مطابق، جس مسلک کو درست سمجھتے تھے، اس کے مخالف مسلک پر وہ شدید تنقید کرتے۔

اس پر نمازیوں کی بڑی تعداد امام صاحب کے خلاف ہوگئی۔ لوگ کہنے لگے کہ ان کو خطیب کے مقام سے ہٹا دینا چاہیے۔ میری ملاقات امام صاحب سے ہوئی تو گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ آپ اِس طرح کی تنقیدی تقریریں کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ تو حق اور ناحق کا معاملہ ہے۔ اگر میں اِس معاملے میں نہ بولوں تو میں گناہ گار ہو جاؤں گا۔

میں نے کہا کہ آپ کی سوچ درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ اجتماعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حق اور ناحق کو نہیں دیکھا جاتا، بلکہ ممکن اور ناممکن کو دیکھا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی آپ کا طریقہ تھا۔ میں نے مثالیں دے کر امام صاحب کو سمجھایا تو وہ میری بات مان گئے۔ اس کے بعد انھوں نے تنقیدی طریقہ چھوڑ دیا اور حکیمانہ انداز میں اپنی بات بیان کرنے لگے۔

یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے۔ اجتماعی زندگی میں ہمیشہ حکمت کی اہمیت ہوتی ہے۔

جو آدمی حکمت کا طریقہ اختیار نہ کرے، وہ صرف مسائل کو بڑھائے گا، وہ مسائل کو حل نہیں کرسکتا۔ زندگی میں کوئی حقیقی کامیابی صرف صبر کا طریقہ اختیار کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔ صبر کا طریقہ چھوڑنے کے بعد کسی کو کوئی حقیقی کامیابی ملنے والی نہیں۔

اجتماعی معاملات کو ہمیشہ حق اور ناحق کے نظریے سے دیکھنا صرف جوش کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر صبر وتحمل ہو، وہ معاملے میں سنجیدگی کے ساتھ غور کریں گے اور پھر وہی طریقہ اختیار کریں گے جو صورتِ حال کی روشنی میں نتیجہ خیز ثابت ہونے والا ہو۔

بلند فکری

موجودہ دنیا میں آدمی ہر وقت اپنے قریبی حالات میں گھرا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں صحیح سوچ کا مالک صرف وہ شخص بنے گا جو اپنے اندر بلند فکری (high thinking) کی صفت پیدا کرے، وہ اپنے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے، وہ غیر متاثر ذہن کے تحت معاملات پر رائے قائم کرے۔ اِس طرزِ فکر کا فارمولا صرف ایک ہے — اپنی سطح سے اوپر اٹھ کر سوچنا:

To think beyond the limit

آدمی ہمیشہ کچھ لوگوں کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے اس کو بار بار ناخوش گوار قسم کے تجربات پیش آتے ہیں۔ اِن ناخوش گوار تجربات کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کے اندر بطور ردّ عمل طرح طرح کے غیر حقیقی جذبات پیدا ہوجاتے ہیں۔ مثلاً غصہ، حسد، نفرت، انتقام، احساسِ برتری، یا احساسِ کم تری، وغیرہ۔ ہر آدمی اِسی قسم کے منفی احساسات کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ یہ احساسات جو ہمیشہ رد عمل کی نفسیات کے تحت پیدا ہوتے ہیں، وہ انسان کو غیر حقیقت پسندانہ سوچ میں مبتلا کردیتے ہیں۔ وہ فطرت کے مقرر راستے سے ہٹ کر غیر فطری راستے پر چلنے لگتا ہے۔

اِس دنیا میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے حالات سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے، وہ متاثر ذہن کے تحت کوئی فیصلہ نہ کرے۔ وہ اپنے اندر وہ چیز پیدا کرے جس کو غیر متعصّبانہ ذہن، یا تخلیقی فکر (creative thinking) کہا جاتا ہے۔ ایسا ہی انسان اِس دنیا میں درست انداز میں سوچے گا اور اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی کرے گا اور آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچے گا۔

بلند فکری کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ بلند فکری میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ ہے، وہ ڈسٹریکشن (distraction) ہے، یعنی ذہن کا مختلف سمتوں میں منتشر ہوجانا۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو ہر قسم کے ذہنی انتشار سے بچائے، تاکہ وہ اپنے اندر صحتِ فکر کو قائم رکھ سکے۔ یہ دراصل صحتِ فکر ہی ہے جو انسان کو حیوان سے ممیز کرتی ہے۔

امت میں اختلاف کا مسئلہ

امت کے افراد میں دینی مسائل کے بارے میں ہمیشہ اختلاف پایا گیا ہے۔ اِس طرح کے اختلافات کے بارے میں کچھ لوگوں نے شدت اختیار کی اور اس کو حق اور ناحق کا مسئلہ بنا دیا۔ لیکن علمائے اسلام کی اکثریت یہ مانتی ہے کہ غیر اساسی امور میں اختلاف فطری چیز ہے۔ ایسے اختلافات کو حق اور ناحق کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ مثال کے طور پر آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم شمس الدین ابن مفلح (وفات 1326ء) نے اپنی کتاب ''الفروع'' میں اِس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ علمائے امت کا اختلاف ایک رحمتِ واسعہ ہے: اختلافُھُم رَحمَۃٌ واسِعَۃٌ (الفروع مع شرحہ تصحیح الفروع، جلد 11، صفحہ 103)۔

اختلاف کے معاملے کا یہی ایک پہلو نہیں ہے کہ اس میں شدت نہ اختیار کی جائے،

بلکہ رایوں کے کثرت کو توسّع پر محمول کرتے ہوئے ہر ایک کا احترام کیا جائے۔ اِس کے علاوہ، اِس کا ایک مزید مثبت پہلو بھی ہے۔ اِس معاملے کی طرف ایک روایت میں اشارہ کیا گیا ہے: اخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39)۔ یعنی میری امت کا اختلاف ایک رحمت ہے۔

اختلاف سادہ طور پر صرف اختلاف نہیں، وہ رائے میں فرق کا نام ہے۔ اختلاف بند ذہن کو کھولتا ہے۔ رایوں کا فرق (difference of opinions) لوگوں کے اندر ڈسکشن اور ڈائیلاگ کا ماحول پیدا کرتا ہے، وہ فکری ارتقا کا ذریعہ ہے۔ یہ اختلاف کا صحت مند پہلو ہے۔ اگر لوگوں میں رائے کا اختلاف نہ ہو تو ایسے گروہ کے اندر ذہنی جمود پیدا ہوجائے گا۔ اِس کے برعکس، جہاں رائے میں فرق پایا جائے، وہاں ذہنی ارتقا کا سلسلہ جاری رہے گا۔

اِس معاملے میں اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ لوگوں کے اندر علمی ذوق ہو۔ اُن کے اندر طلب پائی جائے۔ وہ کسی تعصب کے بغیر تبادلۂ خیال کرنا جانتے ہوں۔ جن لوگوں کے اندر یہ مزاج ہو، اُن کے لیے اختلاف فکری ارتقا کا ذریعہ بن جائے گا، وہ لوگوں کے اندر تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کا باعث بنے گا، نہ کہ ذہنی جمود اور انتشار پیدا کرنے کا سبب۔

تنقید و اختلاف

تنقید کو بند کرو، اختلافِ رائے کو ختم کرو، تا کہ اُمت میں اتحاد ہو سکے — یہ جملہ گرامر کے اعتبار سے درست ہے، مگر وہ حقیقت کے اعتبار سے بالکل بے معنی ہے۔ کیوں کہ تنقید و اختلاف انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ زیادہ صحیح اور قابلِ

عمل بات یہ ہے کہ تنقید کو گوارا کرو، اختلافِ رائے کو برداشت کرو تا کہ امت میں اتحاد ہو سکے۔ کسی قوم میں اتحاد ہمیشہ اسی دوسرے اصول کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور امتِ مسلمہ میں بھی اتحاد اسی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے سوا اتحاد کی دوسری کوئی صورت نہیں۔

صحابہ و تابعین کے درمیان اختلافات تھے۔ اسی طرح محدثین، فقہا، علما اور صوفیا، ان سب کے درمیان کثرت سے اختلافات تھے۔ حتی کہ قرآن سے ثابت ہے کہ دنیا میں بیک وقت دو پیغمبر ہوں تو ان کے درمیان بھی کبھی اختلاف ہو جاتا ہے (20:92-94)۔ ایسی حالت میں اختلاف کو ختم کر کے اتحاد قائم کرنے کی شرط نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ وہ غیر شرعی بھی ہے۔

تنقید و اختلاف میں کوئی برائی نہیں۔ وہ فکری ارتقا کا ذریعہ بنتی ہے۔ مثال کے طور پر غزوۂ بدر کے موقع پر ایک صحابی حباب بن منذر نے پیغمبر سے اختلاف کیا۔ اس کے نتیجہ میں زیادہ بہتر میدانِ جنگ کا انتخاب ممکن ہو گیا، وغیرہ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 620)۔

اصل یہ ہے کہ انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک طالبِ خویش اور دوسرا طالبِ حق۔ طالبِ خویش اپنی ذات میں جیتا ہے۔ اس کی ساری دلچسپی اس میں ہوتی ہے کہ اس کی اپنی شخصیت نمایاں ہو۔ اس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ یہی وہ آدمی ہے جو تنقید و اختلاف سے بھڑکتا ہے۔ کیوں کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ تنقید اس کی شخصی عظمت کو گھٹا رہی ہے۔

طالبِ حق کی نفسیات اس سے بالکل جدا ہوتی ہے۔ وہ صرف حق کا طالب ہوتا ہے۔ وہ تنقید کو اپنی ذات پر حملہ نہیں سمجھتا۔ وہ تنقید کو صرف اس نظر سے دیکھتا ہے کہ وہ حق ہے یا ناحق۔ تنقید اگر غلط ہے تو وہ سادہ طور پر اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن تنقید اگر برحق ہے تو وہ فوراً اس کو قبول کر لے گا۔ کیونکہ ایسی تنقید میں اس کو عین وہی چیز ملتی ہوئی نظر آئی جو پہلے سے اس کا مطلوب و مقصود تھی۔

اختلاف ایک فطری معاملہ

ابن قیم الجوزیہ 691ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے۔ 751ھ میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کی ایک مشہور کتاب اعلام الموقعین ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت عمر فاروق اور حضرت عبداللہ بن مسعود کے درمیان سو مسائل (نَحْوَ مِائَةِ مَسْأَلَةٍ) میں باہم اختلاف تھا۔ اسی طرح انھوں نے دوسرے صحابہ کے درمیان رایوں کے اختلاف کا ذکر کیا ہے (اعلام الموقعین، جلد 3، صفحہ 102)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اصحابِ رسول میں سے کسی نے بھی اختلاف کو برا نہیں مانا، تمام لوگوں نے اس کو ایک فطری معاملہ سمجھا۔ جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوتی اور نہ مسلمانوں کی جماعت میں کوئی انتشار پیدا ہوتا۔

یہ اسلام کی وہ صورت حال ہے جو اصحاب رسول کے زمانہ میں تھی۔ یعنی وہ زمانہ جس کو اسلام کی تاریخ میں معیاری دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں ہر مسلمان آزادانہ طور پر اختلاف رائے کرتا تھا۔ یہ اختلاف رائے اکثر نہایت شدید الفاظ میں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اختلاف اور تنقید کرنے والے کو روکا جائے یا اس کو کوئی ناپسندیدہ کام سمجھا جائے۔

اس کے برعکس، موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کو دیکھیے تو صورت حال بالکل مختلف نظر آئے گی۔ آج اگر کسی مسلم شخصیت پر تنقید کردی جائے تو مسلمان فوراً مشتعل ہوجاتے ہیں۔ وہ ناقد کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دورِ صحابہ اور موجودہ زمانہ میں اس فرق کا سبب کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ صرف ایک اللہ کو بڑا بنائے ہوئے تھے۔ اللہ کے بعد تمام انسان ان کی نظر میں برابر تھے۔ اس لیے انسانوں پر تنقید سے ان پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اس کے برعکس، موجودہ زمانہ کے مسلمان اللہ کے ساتھ دوسرے انسانوں کو بھی بڑا بنائے ہوئے

ہیں۔ ان انسانی بڑوں کے لیے انھوں نے مبتدعانہ طور پر "اکابر" کا لفظ وضع کر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنی محبوب شخصیتوں پر تنقید سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

دین میں معیار بہر حال اصحاب رسول ہیں۔ مسلمان اگر اس کے سوا کوئی اور معیار بنائیں تو وہ بلا شبہ بدعت ہے، اور بدعت اسلام میں مقبول نہیں۔

اختلاف کا مسئلہ

مسلمانوں کے اندر بڑے پیمانے پر مذہبی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ یہ اختلاف بڑھ کر کبھی تشدد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اِن اختلافات کا سبب مدارس کا نصاب ہے۔ ان کے خیال کے مطابق، اگر مدارس کے نصاب میں اصلاح کر دی جائے تو اختلاف کا خاتمہ ہو جائے گا اور لوگوں کے اندر اتحاد و اتفاق کی حالت قائم ہو جائے گی۔

مگر یہ اصل صورتِ حال کا کم تر اندازہ (underestimation) ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کا سبب فطرتِ انسانی میں ہے، نہ کہ مدارس کے نصاب میں۔ پیدائش کے اعتبار سے، ہر مرد مسٹر ڈفرنٹ (Mr. Different) ہوتا ہے اور ہر عورت مس ڈفرنٹ۔

یہی فطری فرق اختلاف کا اصل سبب ہے۔ اگر تمام مدارس کا نصاب ایک کر دیا جائے تب بھی اختلاف باقی رہے گا، کیوں کہ خواہ نصاب کی سطح پر اختلاف نہ ہو تب بھی فطرت کی سطح پر اختلاف موجود رہے گا، وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔

حضرت علی (وفات 40ھ) اور حضرت معاویہ (وفات 60ھ) دونوں ایک ہی مدرسہ، مدرسۂ نبوت، کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ ابوالحسن اشعری (وفات 936ء) معتزلی عالم ابوعلی الجبائی (وفات 916ء) کے شاگرد تھے، اس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ موجودہ زمانے میں سر سید احمد خاں (وفات 1898ء) اور مولانا

قاسم نانوتوی (وفات 1880ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں کے درمیان اختلاف پیدا ہوا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (وفات 1949ء) اور مولانا حسین احمد مدنی (وفات 1957ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندوی (وفات 1953ء) اور مولانا مسعود علی ندوی (وفات 1967ء) دونوں ایک ہی مدرسہ کے تعلیم یافتہ تھے، اِس کے باوجود دونوں میں اختلاف پیدا ہوا۔

اصل یہ ہے کہ خواہ دو آدمیوں نے ایک ہی مدرسہ اور ایک ہی نصاب کے تحت تعلیم پائی ہو، لیکن طرزِ فکر (way of thinking) کی سطح پر ہمیشہ ایک آدمی اور دوسرے آدمی کے درمیان فرق ہوتا ہے۔ یہی فرق ہے جو اختلاف کا سبب بن جاتا ہے۔ اِس کے بعد وہ بڑھ کر نفرت اور تشدد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اختلاف یا فرق چوں کہ فطرتِ انسانی کا حصہ ہے، اِس لیے وہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اختلاف کے مسئلے کا حل یہ نہیں ہے کہ ناکام طور پر اس کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے، بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو اُس اصول کی تعلیم دی جائے جس کو "اختلاف کے باوجود اتحاد" کہا جاتا ہے۔ یعنی رائے (opinion) کی سطح پر اختلاف، سماجی تعلق (social relationship) کی سطح پر اتفاق۔

انسانوں کے طرزِ فکر میں اختلاف کوئی غیر مطلوب چیز نہیں، بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ کیوں کہ اِس اختلاف کی بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے درمیان ڈسکشن اور ڈائیلاگ ہوتا ہے، اور ڈسکشن اور ڈائیلاگ ذہنی ارتقا کا ذریعہ ہے۔ جہاں ڈسکشن اور ڈائیلاگ نہ ہو، وہاں یقینی طور پر ذہنی جمود (intellectual stagnation) پیدا ہو جائے گا، اور ذہنی جمود سے زیادہ تباہ کن اور کوئی چیز انسان کے لیے نہیں۔

وحدت، تنوع

وسیع تقسیم کے اعتبار سے، علوم کی دو قسمیں ہیں: علومِ طبیعی (physical sciences) اور علوم انسانی (human sciences)۔ علوم طبیعی کی بنیاد تجرباتی علم (experimental knowledge) پر ہے، اِس لیے علومِ طبیعی میں قطعیت (certainty) تک پہنچنا ممکن ہوتا ہے۔ علومِ انسانی میں تجرباتی علم جیسی بنیاد قابلِ حصول نہیں، اِسی بنا پر یہ صورتِ حال نظر آتی ہے کہ جو لوگ علومِ انسانی کے شعبے میں کام کرتے ہیں، اُن کے درمیان ہمیشہ رائے کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ علومِ طبیعی کی طرح علومِ انسانی میں قطعیت تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

یہی وہ مسئلہ ہے جس کی بنا پر اللہ تعالی نے وحی (revelation) کا سلسلہ قائم کیا۔ مبنی بر وحی علم (revealed knowledge) ہم کو وہ یقینی بنیاد عطا کرتا ہے جو انسانی موضوعات کے معاملے میں ایک مسلّمہ بنیاد (axiom) کی حیثیت رکھتی ہے۔ وحی کے ذریعے ہم کو ایسے قطعی مسلّمات حاصل ہوجاتے ہیں جن پر غور وفکر کرکے انسانی زندگی کا قابلِ اعتماد نقشہ بنایا جاسکے۔

تاہم یہاں ایک فرق ہے۔ علومِ طبیعی میں ہمیشہ ایک پہلو ہوتا ہے، یعنی یہ کہ ظاہر کے اعتبار سے کسی چیز کا نقشہ (structure) کیا ہے۔ لیکن علومِ انسانی کا معاملہ اِس سے مختلف ہے۔ یہاں ہمیشہ چیزوں کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک، اسپرٹ اور دوسرے، فارم (form)۔ اِسی بنا پر وحی الٰہی میں چیزوں کی تقسیم دو طرح سے کردی گئی ہے—— اسپرٹ اور فارم۔

وحی الٰہی کے مطابق، اسپرٹ میں وحدت مطلوب ہے۔ اِس کے برعکس، فارم کے معاملے میں تنوع (diversity) کو مطلوب کا درجہ دیا گیا ہے۔ اِس تقسیم کے مطابق، تقوی

(divine consciousness) کو اسپرٹ کا درجہ دیا گیا ہے، اور عبادت، اخلاق اور معاملات کے شعبوں میں اصولی طور پر تنوع کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اسلام ایک مبنی بر وحی مذہب ہے۔ اسلام کے نقشے میں اِسی اصول کو اختیار کیا گیا ہے۔

علم کی دو قسمیں

علم کی دو قسمیں ہیں — ایک وہ علم جس کا تعلق انسانی فکر اور انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔ ایسے علم کو اصطلاح میں علمِ انسانی (humanities) کہا جاتا ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جس کا تعلق مادی شعبہ سے ہے۔ ایسے علوم کو سائنسی علوم کہا جاتا ہے۔ دونوں قسم کے علم کے مطالعے کے طریقے الگ الگ ہیں۔ ایک علم کے طریقے کو دوسرے علم کے معاملے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً سائنسی علوم کی بنیاد ریاضیات (mathematics) پر ہے۔ ایسے علوم میں قطعی استدلال یا ناقابلِ انکار استدلال ممکن ہوتا ہے۔ ان کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اِس لیے سائنسی علوم میں اختلاف نہیں پایا جاتا۔

سائنسی علوم میں یہ ممکن ہوتا ہے کہ کسی موضوع پر مختلف اہلِ علم کا اتفاقِ رائے حاصل کرلیا جائے۔ مگر علمِ انسانی (humanities) میں اِس قسم کا ریاضیاتی استدلال ممکن نہیں۔ اِس لیے علمِ انسانی کے معاملے میں لازمی اتفاقِ رائے بھی ممکن نہیں۔

دونوں قسم کے علوم میں اِس فرق سے ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ جو شخص علمِ انسانی یا مذہب کے معاملے میں یقین کا درجہ حاصل کرنا چاہے، اُس کو یہ توقع نہیں رکھنا چاہیے کہ یہاں سائنسی علوم کی مانند ریاضیاتی استدلال ممکن ہوجائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ

انسانی علوم کا معاملہ ففٹی ففٹی کے اصول پر مبنی ہے۔ پچاس فی صد استدلال (reasoning) اور پچاس فی صد وجدان (intuition)۔

پہلے جزء کا تعلق معلومات (information) سے ہے، اور دوسرا جزء معرفت یا حقیقت شناسی (realization of truth) سے تعلق رکھتا ہے۔ جو آدمی صرف معلومات کو جانتا ہو، مگر اس کے اندر حقیقت شناسی کی صلاحیت موجود نہ ہو، وہ ہمیشہ ذہنی انتشار (confusion) میں مبتلا رہے گا، وہ کبھی سچائی تک پہنچ نہ سکے گا۔

اختلاف ایک صحت مند ظاہرہ

علامہ ابن تیمیہ کی کتاب الفتاوی الکبریٰ (مجموعہ فتاویٰ) میں ایک واقعہ اِن الفاظ میں آیا ہے: صنَّفَ رجلٌ کتابًا سمّاہ کتاب "الاختلاف"، فقال أحمدُ بن حنبلٍ: سمِّہِ کتاب "السَّعَة"، (جلد 3، صفحہ 238)۔ یعنی ایک شخص (اسحاق بن بہلول) نے ایک کتاب لکھی۔ اُس نے اِس کتاب کا نام "کتاب الاختلاف" رکھا۔ یہ کتاب اُس نے امام احمد بن حنبل کی خدمت میں پیش کی۔ امام احمد بن حنبل نے اس کتاب کو دیکھ کر کہا کہ تم اِس کتاب کا نام کتاب الاختلاف نہ رکھو، بلکہ تم اِس کتاب کا نام کتاب السعۃ (توسع والی کتاب) رکھو۔

امام احمد بن حنبل کا مطلب یہ تھا کہ شرعی مسائل میں اختلاف محض اختلاف نہیں ہے، بلکہ وہ توسّع کی بنا پر ہے، یعنی ہر رائے میں صحت کا امکان ہے۔

تاہم یہ توسع سادہ مفہوم میں محض رواداری کے معنی میں نہیں ہے، بلکہ اُس کا ایک مثبت پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اختلاف ڈسکشن (discussion) کا ذریعہ بنتا ہے اور ڈسکشن سے ذہنی ارتقا (intellectual development) کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اختلاف سے مراد نزاع نہیں ہے، بلکہ اُس سے مراد سادہ طور پر رائے کا فرق

(difference) ہے۔ رائے کا یہ فرق یا اختلاف بے حد اہم ہے۔ اِسی کی بنا پر ڈسکشن اور ڈائیلاگ ہوتا ہے اور تبادلۂ خیال (exchange of thought) وجود میں آتا ہے۔ اگر رایوں میں فرق نہ ہو تو باہمی تبادلۂ خیال وجود میں نہیں آئے گا، حالاں کہ ذہنی ارتقا کے لیے تبادلۂ خیال بے حد ضروری ہے۔ جہاں تبادلۂ خیال نہیں، وہاں ذہنی ارتقا بھی نہیں۔

واضح ہو کہ اختلاف اور مخالفت میں فرق ہے۔ اختلاف ایک مثبت عمل ہے۔ اس کے برعکس، مخالفت سرتاسر ایک منفی عمل۔ اختلاف فکری ارتقا کا سبب ہے اور مخالفت فکری جمود (intellectual stagnation) کا سبب۔

اختلاف ایک برکت

عمر بن عبدلعزیز (وفات 101ھ) کو اسلام کی تاریخ میں پانچویں خلیفۂ راشد کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ان کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے: مَا سَرَّنِي لَوْ أَنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم لَمْ يَخْتَلِفُوا، لِأَنَّهُمْ لَوْ لَمْ يَخْتَلِفُوا لَمْ تَكُنْ رُخْصَةٌ (الفقیہ والمتفقہ للخطیب البغدادی، جلد 2، صفحہ 116)۔ یعنی میرے لیے یہ چیز باعث مسرت نہیں کہ اصحاب محمد میں اختلاف نہ ہوتا، اس لیے کہ اگر وہ اختلاف نہ کرتے تو ہم کو رخصت کا فائدہ نہ ملتا۔

عبادتی امور میں صحابہ کا اختلاف بعد کے زمانے میں مختلف فقہی اسکول کا ذریعہ بن گیا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بعد کے علما نے اختلاف کے معاملے میں ترجیح کا طریقہ اختیار کیا۔ یعنی مختلف مسالک میں کسی ایک طریقہ کو راجح اور کسی کو مرجوح قرار دینا۔ اس سے فقہ میں مختلف مدرسے بن گئے۔ اور بالآخر امت کے اندر فقہی تشدد پیدا ہو گیا۔

عمر بن عبدالعزیز کا یہ قول ایک حدیث پر مبنی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر

1760)۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو، تم ہدایت پر رہو گے۔

صحابہ کا اختلاف اساسی امور (basics) میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ جزئی امور (non-basics) میں ہے۔ اس طرح کے جزئی امور میں ہمیشہ تنوع (diversity) مطلوب ہوتی ہے۔ اس طرح کے جزئی امور میں توحد (یکسانیت) تلاش کرنا، غیر فطری ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح کے جزئی اختلاف کو تنوع پر محمول کیا جائے، ان کو توحد کا موضوع نہ بنایا جائے۔ اس اصول کو اختیار کرنے کی صورت میں امت کے اندر اتحاد باقی رہے گا۔ اس کی خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امت کے اندر اختلاف وانتشار پیدا ہو جائے گا۔ ایک امت کئی فرقوں میں بٹ جائے گی۔ یہ اختلاف بڑھ کر غلو اور تشدد کی صورت اختیار کر لے گا۔ اسلام کے بعد کے زمانے کی تاریخ اس کی تصدیق کرتی ہے۔

تفریق کا سبب

اختلافات ہمیشہ چھوٹے مسائل میں ہوتے ہیں، نہ کہ بڑے بڑے مسائل میں۔ مثلاً "محمد بن عبد اللہ پیغمبر تھے" اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ یہ عقیدہ تمام مسلمانوں کا مشترکہ عقیدہ ہے۔ مگر آپ پر درود کیسے بھیجا جائے، اس میں جزئی اختلافات پیدا ہو گئے۔ مثلاً سنی حضرات پیغمبر اسلام کے نام کے ساتھ "صلی اللہ علیہ وسلم" کا لفظ لکھتے اور بولتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں شیعہ حضرات کا طریقہ یہ ہے کہ وہ آپ کے نام کے آگے "صلی اللہ علیہ والہ" یا "صلی اللہ علیہ والہ وسلم" کا لفظ بولتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً تمام مسلمان اس کو مانتے ہیں کہ ایک مسلمان جب دوسرے مسلمان سے ملے تو وہ سلام اور مصافحہ کرے مگر یہاں یہ اختلاف ہے کہ حنفی لوگ دونوں ہاتھوں سے

مصافحہ کرتے ہیں اور اہل حدیث حضرات ایک ہاتھ سے مصافحہ کرتے ہیں۔

شریعت میں اس طرح کے اختلافات کا پیدا ہونا بذات خود نہ غلط ہے اور نہ مضر، بلکہ اس طرح کے اختلافات ایک طبیعی امر ہیں اور ہر گروہ میں اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ مگر اصل غلطی یہ ہے کہ لوگ موشگافیاں (hair-splitting) کرکے یہ ثابت کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کا طریقہ افضل ہے اور دوسرے کا طریقہ غیر افضل ان کا طریقہ راجح ہے اور دوسرے کا طریقہ مرجوح۔ بس یہیں سے خرابی شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ غیر ضروری بحثیں کرنے لگتے ہیں اور انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر ایک دوسرے سے دور ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے معاملات میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ بھی درست ہے اور وہ بھی درست ہے۔ آدمی جس طریقہ کو چاہے اختیار کرے اور اس کے ساتھ دوسرے کو دوسرے طریقہ پر چلنے دے۔ اس طرح کے ضمنی امور میں راجح اور مرجوح، افضل اور غیر افضل کی بحث چھیڑنا سخت مضر ہے۔ ایسی بحث ہمیشہ اس قیمت پر ہوتی ہے کہ بنیادی چیزوں سے نظریں ہٹ جائیں اور غیر بنیادی چیزیں لوگوں کی توجہات کا مرکز بن جائیں اور نتیجہ میں امت مختلف ٹکڑوں میں بٹ کر رہ جائے۔

اساسی اور بنیادی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اتحاد ہے اور جزئی اور ضمنی چیزوں میں زور دینے کا لازمی نتیجہ اختلاف۔

کلیات کے بجائے جزئیات

اسلامی شریعت کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک کلیات اور دوسرے جزئیات۔ شریعت کے کلی احکام واضح نصوص پر مشتمل ہیں۔ اس لیے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ شریعت کے اس پہلو پر تمام فقہا یکساں طور پر متفق ہیں۔ مگر جزئیاتِ شریعت میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

اس لیے شریعت کے اس حصے میں فقہا کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر تمام فقہا اس پر متفق ہیں کہ فجر کی نماز دو رکعت، ظہر کی نماز چار رکعت اور مغرب کی نماز تین رکعت ہے۔ مگر نماز کے بعض جزئی مسائل مثلاً آمین، رفع یدین اور قرأتِ فاتحہ خلف الامام کے معاملہ میں ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

بعد کے دور میں مسلمانوں کے درمیان جو مختلف فقہی مکاتب بنے ان کے الگ الگ ہونے کی بنیاد دراصل یہی اختلافی جزئیات تھیں۔ کلی نوعیت کے احکام میں الگ الگ فقہی مکتب بننے کا کوئی سوال نہیں۔ کیوں کہ ان امور میں ایک فقیہ اور دوسرے فقیہ کی رائے میں کوئی فرق ہی نہیں۔ ایک فقہی مکتب کو دوسرے فقہی مکتب سے جو چیز جدا کرتی ہے وہ دراصل اختلافی مسائل ہیں، نہ کہ اتفاقی مسائل۔

موجودہ زمانے میں ہندستان میں جو دینی مدارس قائم ہوئے وہ کسی ایک یا دوسرے فقہی مکتب فکر کے تحت قائم ہوئے۔ مثلاً کوئی مدرسہ دیوبندی مسلک کے تحت قائم ہوا اور کوئی بریلوی مسلک کے تحت اور کوئی سلفی مسلک کے تحت۔ ان مسالک کو جو چیز ایک دوسرے سے ممیز کرتی ہے وہ یہی اختلافی مسائل ہیں، نہ کہ اتفاقی مسائل۔ اس بنا پر عملاً یہ ہوا کہ ہر مدرسہ میں سب سے زیادہ زور اختلافی مسائل پر دیا جانے لگا۔ ہر مدرسہ کا مقصد یہ قرار پایا کہ وہ دوسرے مسلک کے بالمقابل اپنے مسلک کو قرآن وسنت سے صحیح ثابت کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا سارا تعلیمی نظام اختلافی جزئیات کے گرد گھومنے لگا۔ مثال کے طور پر ہماری موجودہ درس گاہوں کا یہ حال ہے کہ وہاں جب حدیث پڑھائی جاتی ہے تو توحید اور آخرت سے متعلق حدیثوں سے استاد اور شاگرد بالکل سرسری گزر جاتے ہیں۔ اور جہاں کوئی ایسی حدیث آ گئی جس میں ایک مسلک اور دوسرے مسلک کے درمیان اختلاف کا پہلو پایا جاتا ہو وہاں استاد زبردست مہارت دکھاتا ہے، حتی کہ بعض اوقات اس پر ایک ایک ہفتے تک بحث ہوتی رہتی ہے۔

اس تعلیمی نظام سے جو لوگ تربیت پا کر نکلتے ہیں قدرتی طور پر ان کے ذہن پر کلیاتِ شریعت سے زیادہ جزئیاتِ شریعت کا غلبہ رہتا ہے۔ وہ انھی اختلافی جزئیات میں اپنے مسلک کو برتر ثابت کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اس کا برا انجام موجودہ زمانہ میں یہ نکلا ہے کہ یورپ، امریکا میں مسلمانوں نے ان علما کو بطور امام اور مدرس بلایا تو وہاں پہونچ کر بھی انھوں نے یہی تمام جھگڑے چھیڑ دیے۔ ہمارے علما کے لیے یورپ اور امریکا پہونچنا اس کا وسیلہ نہ بن سکا کہ وہ ان ملکوں میں اسلام کی فطری تعلیم مثبت انداز میں عام کرنے کا کام کریں۔ وہ وہاں بھی وہی کرتے رہے جس کی ٹریننگ انہوں نے اپنی درسگاہوں میں حاصل کی تھی۔ یعنی جزئی اختلافی امور کی بنیاد پر مسلمانوں میں فرقہ بندی پیدا کرنا۔

اس سلسلے کا ایک قابلِ عبرت واقعہ وہ ہے، جو میں نے اپنی ڈائری (14 فروری 1998) میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے:

”ایک دیوبندی عالم سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے بتایا کہ ایک بار ہمارے مدرسہ میں امتحان کے پرچہ میں ایک سوال یہ تھا کہ اخلاق اور معاشرت سے متعلق دو حدیث لکھیے۔ مگر بہت کم طلبہ اس کے جواب میں دو حدیث لکھ سکے۔ حالانکہ انہیں طلبہ کا حال یہ تھا کہ رفع یدین اور اس قسم کے دوسرے اختلافی مسائل پر سوال ہو تو وہ اس کے جواب میں گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان طلبہ کو جب حدیث کی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں تو استاد اخلاق اور معاشرت جیسی حدیثوں کی صرف لفظی قرآت کر کے گزر جاتا ہے مگر جب رفع یدین اور آمین بالجہر جیسے اختلافی مسائل آتے ہیں تو وہ ان پر کئی کئی دن تک تقریر کرتا ہے اور ان پر اپنی معلومات کا دریا بہاتا ہے۔ یہ طریقۂ درس ظاہر ہے کہ اسی قسم کے علما پیدا کرے گا جس کا ذکر مذکورہ دیوبندی عالم نے کیا۔“

پانچ فقہی اسکول

مسلمانوں میں اِس وقت عملاً پانچ بڑے فقہی اسکول قائم ہیں— مالکی اسکول، حنبلی اسکول، شافعی اسکول، حنفی اسکول، جعفری اسکول۔ یہ تمام فقہی اسکول یہ مانتے ہیں کہ اُن کا دین ایک ہے، اور وہ اسلام ہے۔ اِس کے باوجود کیوں ایسا ہوا کہ ایک مذہب پانچ مذہبوں میں بٹ گیا۔ اُن میں اتنے زیادہ اختلافات ہوئے کہ سخت قسم کی گروہ بندی اور باہمی ٹکراؤ تک نوبت آ گئی۔

اِس گروہ بندی کے معاملے کو سمجھنے کے لیے مشہور مالکی عالم یوسف بن عبداللہ بن محمد بن عبدالبرؒ (وفات 1071ء) کی کتاب 'جامع بیان العلم وفضلہ' ایک اچھے گائڈ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اِس کتاب سے اور اِس موضوع کی دوسری کتابوں سے اِس معاملے کی جو حقیقت سامنے آتی ہے، اُس کو ہم یہاں مختصر طور پر درج کریں گے۔

دوسرے مذہبی نظاموں کی طرح، اسلام کی مذہبی تعلیمات کے دو حصے ہیں— اساسات (basics)، اور فروع (non-basics)۔ اِس معاملے کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا چاہیے کہ اسلام کے دورِ اوّل (عہدِ رسالت، عہدِ صحابہ، عہدِ تابعین) میں یہ دونوں قسم کی چیزیں موجود تھیں، لیکن اُس زمانے میں یہ چیزیں گروہ بندی کا سبب نہیں بنیں۔ اختلافات کی بنیاد پر گروہ بندی کا واقعہ بعد کو عباسی دور میں پیش آیا۔

جیسا کہ معلوم ہے، عباسی دور میں اسلامی علوم کی تدوین ہوئی۔ اس زمانے میں زیادہ بڑے پیمانے پر حدیثیں جمع کی گئیں۔ اِن حدیثوں میں دوسری باتوں کے علاوہ، یہ بھی بتایا گیا تھا کہ اصحابِ رسول کس طرح نماز ادا کرتے تھے۔ اِن روایتوں سے معلوم ہوا کہ نماز کا

ایک حصہ وہ ہے جس میں صحابہ کے درمیان کوئی فرق یا اختلاف نہیں پایا جاتا تھا۔ مثلاً ہر صحابی کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے فجر کی نماز دو رکعت پڑھی، ظہر اور عصر کی نماز انھوں نے چار رکعت پڑھی، مغرب کی نماز انھوں نے تین رکعت پڑھی، اور پھر عشا کی نماز انھوں نے چار رکعتوں کے ساتھ پڑھی۔

اِس طرح نماز کا ایک پہلو وہ تھا جس کے بارے میں تمام صحابہ ایک ہی متعین طریقے کے پابند تھے، لیکن اِسی کے ساتھ نماز کے بعض دوسرے پہلوؤں کے بارے میں فرق یا اختلاف پایا جاتا تھا۔ مثلاً کسی نے نماز شروع کرتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ باندھے، اور کسی نے سینے کے نیچے۔ قرأتِ فاتحہ کے بعد کسی نے آمین دھیرے سے کہی، اور کسی نے زور سے۔ نماز کے دوران کسی نے اللہ اکبر کہتے ہوئے رفعِ یدین کیا، اور کسی نے نہیں کیا، وغیرہ۔

جمعِ حدیث کے دوران جب عبادت کے اختلافات سامنے آئے، تو اب یہ سوال اٹھا کہ اِن اختلافات کی کیا توجیہ کی جائے۔ اختلافات کو مٹانا ممکن نہ تھا، کیوں کہ یہ اختلافات سب کے سب، اصحابِ رسول کی طرف سے آرہے تھے، اور اصحابِ رسول وہ لوگ تھے جنھوں نے براہِ راست طور پر پیغمبر کی عبادت کا مشاہدہ کیا تھا۔ اُن کو مخاطَب کرتے ہوئے پیغمبر نے کہا تھا: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 631)۔ ایسی حالت میں ہر طریقہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مستند حیثیت رکھتا تھا۔ بظاہر یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس بنیاد پر ایک طریقے کو لیا جائے اور دوسرے طریقے کو چھوڑ دیا جائے۔

اِس موقع پر مسلم فقہا کی دو رائیں ہوگئیں۔ ایک رائے یہ تھی: الْحَقُّ لَا يَتَعَدَّدُ (یعنی حق کئی نہیں ہوسکتا)۔ اِس لیے ہمیں عملی طور پر یہ کرنا ہوگا کہ ہم یہاں ترجیح (preference) کے اصول کو رائج کریں، یعنی کسی ایک رائے کو راجح قرار دینا، اور دوسری رائے کو مرجوح قرار دے کر اُس کو چھوڑ دینا۔

مگر اِس کے باوجود مسئلہ باقی رہا، کیوں کہ ترجیح کا اصول ہمیشہ اجتہاد پر مبنی ہوتا ہے اور جہاں اجتہاد آیا، وہاں اختلاف رائے بھی لازماً آئے گا۔ چنانچہ ترجیح کے اِس اصول کا نتیجہ عملی طور پر یہ ہوا کہ لوگوں کے درمیان کئی رائیں بن گئیں۔ ہر ایک نے اپنی رائے کی صحت پر اصرار کیا۔ چنانچہ کسی نے ایک رائے کو ترجیح (preference) دی اور کسی نے دوسری رائے کو، اور اِس طرح لوگ کئی گروہ میں بٹ گئے۔ مختلف فقہی اسکول کے وجود میں آنے کا سبب یہی ہے۔

ترجیح کے اِس اصول پر بحث کرتے ہوئے علما نے درست طور پر لکھا ہے کہ: مَذْهبُنَا صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخطَأَ وَمَذْهَب مُخَالِفِنَا خَطأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (الفتاویٰ الکبریٰ الفقہیۃ لابن حجر مکی، جلد 4، صفحہ 313)۔ یعنی ہمارا طریقہ درست ہے، اِس احتمال کے ساتھ کہ وہ غلط ہو۔ اور ہمارے مخالف کا طریقہ غلط ہے، اِس احتمال کے ساتھ کہ وہ درست ہو۔

اِس قول سے اندازہ ہوتا ہے کہ اِس معاملے میں فقہا کا اصولِ ترجیح کتنا زیادہ غیر منطقی (illogical) تھا۔ جب ایک رائے کو ترجیح دینے کے بعد بھی اس کی عدم صحت کا احتمال موجود ہے، اور اِسی طرح جب ایک رائے کو ترک کرنے کے باوجود بھی اس کی صحت کا احتمال پایا جائے، تو ایسی ترجیح عملاً سرتاسر بے معنی ہوجاتی ہے۔ اِس کے بعد یہ ناممکن ہوجاتا ہے کہ آدمی پُریقین کیفیت کے ساتھ اپنی عبادت کرسکے، جب کہ عبادت کے ساتھ یقین کا عنصر لازمی طور پر ضروری ہے۔

محدثین کا مسلک اِس معاملے میں فقہا کے مسلک سے مختلف تھا، اور بلاشبہ وہی مسلک زیادہ درست تھا۔ محدثین کے نقطۂ نظر کا اندازہ احمد بن حنبل (وفات 855ء) کے ایک واقعے سے ہوتا ہے۔ محمد بن عبد الرحمن صیرفی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے پوچھا

کہ اگر کسی مسئلے میں صحابہ کا اختلاف ہو، تو کیا تنقید اور تمحیص کرنا چاہیے، تاکہ جس کے ساتھ حق نظر آئے، اس کی پیروی کی جائے۔ احمد بن حنبل نے جواب دیا کہ نہیں۔ انھوں نے کہا، پھر ہم کیا کریں۔ احمد بن حنبل نے کہا: تُقَلِّدْ أَيَّهُمْ أَحْبَبْتَ (جامع بیان العلم لابن عبد البر، اثر نمبر 1705)۔ یعنی تم جس صحابی کے قول کو پسند کرو، اس کی تقلید کرو۔

محدثین کے مسلک کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے روایتوں کے اِس فرق کو تنوع (diversity) پر محمول کیا، یعنی یہ بھی ٹھیک، اور وہ بھی ٹھیک۔ یہ نظریہ انھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس قسم کی حدیث سے اخذ کیا: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ فَبِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1684)۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں۔ اُن میں سے تم جس کی بھی پیروی کروگے، راہ یاب ہوگے۔

اِس نقطۂ نظر کی حکمت یہ تھی کہ چیزوں میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اُن کے کچھ اساسی اجزا ہوتے ہیں، اور کچھ فروعی اجزا۔ یہ ایک عام اصول ہے کہ وحدت (oneness) اساسات میں مطلوب ہوتی ہے۔ جہاں تک فروع (non-basics) کا تعلق ہے، اُن میں ہمیشہ تنوع (diversity) ہوتا ہے۔ یہ ایک عمومی اصول ہے۔ فروع میں اگر تنوع نہ ہو تو اُس سے کٹرپن (rigidity) پیدا ہوتا ہے اور کٹرپن کسی بھی چیز کے لیے مفید نہیں۔

مزید یہ کہ خدا کی عبادت ایک زندہ عمل کا نام ہے۔ وہ کسی بے روح فارم کو دہرانے کا نام نہیں۔ عبادت کو جب اس کی زندہ اسپرٹ کے ساتھ انجام دیا جائے گا، تو یہی ہوگا کہ عبادت کے بنیادی اجزا کی حد تک تو یکسانیت ہوگی، لیکن اس کے فروعی اجزا میں تنوع پیدا ہو جائے گا۔

زندہ عبادت کبھی فروع میں یکسانیت کا تحمل نہیں کرسکتی۔ فروع میں یکسانیت لانے کی کوشش کرنا، عبادت کو بے روح رسموں کا ایک مجموعہ (set of rituals) بنا دینا ہے۔

ایسی عبادت ایک مشینی روبوٹ (robot) کی عبادت ہوگی، نہ کہ کسی زندہ انسان کی عبادت۔ عبادت، اعلیٰ کیفیات کے تحت کیا جانے والا ایک عمل ہے۔ ایسا عمل کبھی یکسانیت کے ساتھ ادا نہیں کیا جاسکتا۔

اصحابِ رسول کی عبادت کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عبادت اگرچہ اساسات (basics) کے اعتبار سے یکساں انداز میں ہوتی تھی، لیکن غیر اساسی اجزا کے اعتبار سے، ان کے یہاں ہمیشہ تنوع پایا جاتا تھا۔ اِس قسم کی ایک مثال یہاں نقل کی جاتی ہے جس سے صحابہ کی عبادت کا اندازہ ہوگا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی رفاعہ بن رافع الانصاری (وفات 661ء) کی ایک روایت ہے، جو حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے (مغرب کی) نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے رکوع کے بعد اپنا سر اٹھایا، تو آپ نے کہا: سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہُ (اللہ نے سن لیا جس نے اس کی حمد کی)۔ آپ کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص نے اُس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ (خدایا، تیرے لیے ہی حمد ہے، ایسی حمد جو بہت زیادہ، پاکیزہ اور بابرکت ہو)۔ نماز ختم ہوئی تو رسول اللہ نے پوچھا کہ کس شخص نے ایسا کہا تھا۔ اُس آدمی نے کہا کہ میں نے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ میں نے تیس سے زیادہ فرشتوں کو دیکھا۔ اُن میں سے ہر ایک سبقت کر رہا تھا کہ وہ پہلے اِس عمل کو لکھ لے (رَأَيْتُ بِضْعَةً وَثَلَاثِينَ مَلَكًا يَبْتَدِرُونَهَا، أَيُّهُمْ يَكْتُبُهَا أَوَّلُ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 799۔

اِس طرح کے بہت سے واقعات، حدیث کی کتابوں میں رسول اور اصحابِ رسول کے بارے میں آئے ہیں۔ اِن واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ نماز کسی سیٹ پیٹرن

(set pattern) کا نام نہیں، نماز ایک زندہ عمل کا نام ہے۔ کوئی زندہ عمل کبھی لگے بندھے طریقے سے نہیں ہوسکتا۔ زندہ عمل کیفیت سے بھرا ہوا عمل ہوتا ہے، اور کیفیت کبھی یکسانیت کی پابند نہیں ہوسکتی۔

اِس سے نماز کے معاملے کو سمجھا جاسکتا ہے۔ نماز کے بنیادی ڈھانچے میں تو ہمیشہ یکسانیت پائی جائے گی، لیکن نماز کے فروعی اجزا ہمیشہ کیفیات کے تابع ہوتے ہیں۔ فروعی پہلوؤں میں کیفیت کا اظہار کبھی ایک طریقے پر ہوگا اور کبھی دوسرے طریقے پر۔ حقیقت یہ ہے کہ عبادت کو ہر پہلو سے یکساں قسم کے ڈھانچے کا پابند بنانا، عبادت کی اسپرٹ کے بھی خلاف ہے، اور پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے نمونے کے بھی خلاف۔

تاریخ بتاتی ہے کہ محدثین کے زمانے میں، یا اُن سے پہلے، مختلف قسم کے فقہی اسکول موجود نہ تھے۔ یہ اسکول بعد کو فقہا کے دور میں بنائے گئے۔ ابتدائی دور میں مختلف فقہی اسکول کا بننا محض ایک سادہ واقعہ معلوم ہوتا ہے، لیکن دھیرے دھیرے بعد کے زمانے میں، وہ غلو آمیز گروہ بندی کی صورت اختیار کرگیا، جب کہ غلو اسلام میں نہیں (لَا غُلُوَّ فِي الْإِسْلَامِ)۔

(نوٹ: مذکورہ موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب: تجدیدِ دین)

فقہی مسائل میں اختلاف

فقہی مسائل میں اختلاف کا معاملہ زیادہ تر عبادت کے طریقوں میں اختلاف سے تعلق رکھتا ہے۔ اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 631)۔ یعنی، تم نماز اس طرح پڑھو جیسا کہ تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔

اسی طرح آپ نے فرمایا:

خُذُوا عَنِّي مَنَاسِكَكُمْ (سنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 9524)۔ یعنی، مناسک میں میری پیروی کرو۔

اس طرح کی احادیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک ہی غیر اختلافی ماڈل تھا۔ لیکن رسول اللہ کے بعد صحابہ عملی اعتبار سے قابل تقلید نمونہ بن گئے۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد صحابہ مختلف بیرونی علاقوں میں پھیل گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ صحابہ کے عبادتی طریقوں میں کامل یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ مثلاً نماز میں قرأت سے پہلے بسم اللہ پڑھنا یا نہ پڑھنا، امام کے پیچھے مقتدی کا قرأتِ فاتحہ کرنا یا نہ کرنا، نماز میں آمین بالسر اور آمین بالجہر کا اختلاف، وغیرہ۔

صحابہ کے درمیان اس قسم کا اختلاف (صحیح تر لفظ میں فرق) پہلے بھی موجود تھا، مگر پہلے اس فرق کو بحث کا موضوع نہیں بنایا جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں جب کہ مسلم معاشرے میں نومسلموں کی تعداد زیادہ ہوگئی تو اس فرق پر سوال کیا جانے لگا۔ اب اس اختلاف کو موضوع بنا کر یہ سوال کیا جانے لگا کہ ان میں سے صحیح تر ماڈل کون سا ہے۔ یہ نومسلم جن مذاہب سے نکل کر آئے تھے، وہاں انھوں نے دیکھا تھا کہ اس قسم کے فرق کو بنیادی

اہمیت دی جاتی ہے۔ اس قسم کے فرق کی بنیاد پر دوسرے مذاہب میں الگ الگ فرقے بنے ہوئے ہیں۔ اپنے اس قدیم ذہن کو انھوں نے اسلام پر بھی منطبق (apply) کردیا۔ اس ذہن کے تحت وہ اس وقت کے مسلم علما سے سوالات کرنے لگے۔ یہی وہ ظاہرہ ہے جس نے اسلام میں مذہبی فرقہ بندی کے دور کا آغاز کردیا۔

اس معاملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث پیشگی ہدایت کے طور پر موجود تھی۔ اس حدیث کے الفاظ یہ ہیں: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1760)۔ یعنی میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، ان میں سے جس کی بھی تم پیروی کروگے تم ہدایت پر ہوگے۔ اس حدیث کے مطابق صحابہ کے درمیان عبادت کے طریقوں میں اختلاف تنوع (diversity) کی بنا پر تھا، یعنی ہر طریقہ جو کسی صحابی سے ثابت ہو وہ یکساں طور پر درست ہے۔ عقلی طور پر تنوع کا یہ طریقہ قابلِ فہم تھا، کیوں کہ صحابہ کا اختلاف یا فرق صرف جزئیات (non-basics) میں تھا، وہ کلیات (basics) میں نہ تھا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فطری قانون کے مطابق جزئیات میں ہمیشہ فرق پایا جاتا ہے، جزئیات میں یکسانیت (uniformity) کا حصول ممکن نہیں۔

مگر ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کے زمانے میں امت کے اندر یہ اختلاف مسلکی شدت کا سبب بن گیا۔ جب کہ یہ اختلاف خود صحابہ میں موجود تھا، مگر صحابہ کے درمیان ان اختلافات کی بنیاد پر کوئی مسلکی تشدد نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سبب واضح طور پر یہ تھا کہ صحابہ مختلف طریقوں پر عبادت کرتے تھے، لیکن ان میں سے کسی نے کبھی یہ نہیں کہا کہ فلاں طریقہ افضل ہے، اور فلاں طریقہ غیر افضل۔ وہ مختلف طریقوں پر اس طرح عمل کرتے تھے جیسے کہ ہر طریقہ یکساں طور پر درست ہو۔ مگر بعد کو ایسا ہوا کہ انھی اختلافات کو لے کر امت مختلف فرقوں، بلکہ متحارب گروہوں میں بٹ گئی۔ جب کہ اس قسم کی فرقہ بندی شریعت میں سخت

نامحمود(الروم ،30:32) ہے۔اس معاملے میں اصل غلطی عباسی دور کے علمائے فقہ کی ہے، جن کو ائمۂ مجتہدین کہا جاتا ہے۔انھوں نے اس اختلاف کے موضوع پر بڑی تعداد میں کتابیں لکھیں۔انھوں نے یہ کیا کہ ان اختلافات کو بطور خود وہ درجہ دے دیا جو کہ شریعت میں ان کا درجہ نہ تھا، اور نہ کسی صحابی نے ان اختلافات کے بارے میں ایسا کہا تھا۔

ان فقہا نے یہ کیا کہ انھوں نے ترجیح (preference) کے نام سے بطور خود ایک اصول وضع کیا۔ انھوں نے لمبی بحثیں کر کے ایک طریقے کو راجح اور دوسرے طریقے کو مرجوح ثابت کرنے کی کوشش کی۔انھوں نے اختلافات کو بیان کیا، اور پھر ایک مسلک کو لے کر کہا:

هذا أَحْوَطُ (یہ زیادہ محتاط طریقہ ہے)،

هذا أَفْضَلُ (یہ زیادہ افضل طریقہ ہے)۔

انھوں نے بطور خود ایک مسلک کو اولیٰ اور دوسرے مسلک کو غیر اولیٰ قرار دیا۔ یہ بلاشبہ علمائے فقہ کی ایک اجتہادی غلطی تھی۔یہی وہ اجتہادی غلطی ہے جس نے امت میں فقہی تشدد کا آغاز کر دیا، جو پھر کبھی ختم نہ ہوسکا۔

یہ انسان کی نفسیات ہے کہ اس کے لیے جب انتخاب افضل اور غیر افضل کے درمیان ہو تو وہ ہمیشہ افضل کا انتخاب کرے گا۔ وہ اپنے انتخاب کو درست ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کے دلائل دے گا۔ بعد کے زمانے میں انسان کی یہی نفسیات بروئے کار آئی، اور فقہی مسلک میں اختلاف کے نتیجے میں نفرت اور تشدد حتیٰ کہ جنگ تک کو جائز کر لیا گیا۔

اس معاملے میں دورِ اول کے علما کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ایک مسلک کو قابلِ ترجیح قرار دینے کے باوجود وہ مسلک کے بارے میں متشدد نہ تھے۔مثلاً حنفی اور شافعی فقہا نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے قائل تھے، جب کہ مالکی فقہا اس کے قائل نہ

تھے،مگر دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کے پیچھے نماز ادا کی۔اسی طرح امام شافعی فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھنے کے قائل تھے، جب کہ امام ابوحنیفہ اس کے قائل نہ تھے،مگر جب امام شافعی امام ابوحنیفہ کے مقبرہ کے پاس گئے اور وہاں فجر کی نماز ادا کی تو انھوں نے دعائے قنوت نہیں پڑھی، وغیرہ۔مگر اس طرح کا عمل صرف انفرادی اخلاق کو ثابت کرتا ہے، اور شرعی اختلاف کے حل کے لیے شرعی اصول درکار ہے، نہ کہ انفرادی اخلاق۔

دینی امور میں جب کسی ایک طریقہ کو دوسرے طریقے کے مقابلے میں افضل بتایا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ افضل طریقہ میں زیادہ ثواب ہے، اور غیر افضل طریقہ میں کم ثواب ہے۔ایک فقہی عالم اگر افضلیت اور غیر افضلیت کی زبان میں اس طرح کا مسئلہ بتائے ، اور اس کے بعد مخالف مسئلہ بتانے والے عالم کے پیچھے ایک بار نماز پڑھ لے تو اس قسم کے عمل سے فقہی تشدد ختم نہیں ہوسکتا۔اس کا یہ عمل لوگوں کی نظر میں ذاتی نوعیت کا ایک اخلاقی برتاؤ یا حسنِ معاشرت قرار پائے گا، نہ کہ کوئی شرعی مسئلہ۔اور یہ ایک حقیقت ہے کہ جب حسن معاشرت اور دینی افضلیت کے درمیان انتخاب (choice) ہوتو آدمی ہمیشہ اس طریقے کو لے گا جس کو افضل بتایا گیا ہے، اور غیر افضل پر عمل کرنے والے کو کم تر سمجھ لے گا۔ اس طرح کے شرعی معاملے میں حسنِ معاشرت کبھی فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتا۔یہ مزاج یقیناً بڑھتے بڑھتے آخر کار فقہی تشدد اور فرقہ بندی کی صورت اختیار کرلے گا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ امت کے اندر بعد کے زمانے میں جو فقہی تشدد اور مسلکی فرقہ بندی پیدا ہوئی، اس کا سبب خود دین کی تعلیمات میں نہ تھا۔اس کا سبب تمام تر علمائے متقدمین کی اس اجتہادی غلطی میں تھا کہ انھوں نے غیر ضروری طور پر ایک ایسے معاملے میں توحد کا اصول اختیار کیا جو کہ دراصل توسع کا معاملہ تھا۔ایک دینی اختلاف جو دراصل توسع (diversity) کی بنا پر تھا، اس کے معاملے میں انھوں نے توحد (uniformity) کے اصول کو منطبق کرنا چاہا۔

ان کی یہ کوشش یقینی طور پر غیر فطری تھی، اس بنا پر توحد کے نام پر کی جانے والی کوشش تشدد کا ذریعہ بن گئی، اور آخر کار امت واحدہ، امتِ متفرقہ میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔

اس واقعے کی ذمے داری ساری کی ساری فقہائے متقدمین پر ہے۔ اس صورتِ حال کی اصلاح صرف اس وقت ہوسکتی ہے، جب کہ فقہائے متقدمین کے بارے میں یہ مانا جائے کہ انھوں نے بطورِ خود اختلافی مسائل کے حل کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ ان کی ایک اجتہادی غلطی تھی، اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ اس غلط روش کو ترک کر دیا جائے۔

موافقت، مخالفت

میری پسندیدہ تفسیروں میں سے ایک خاص تفسیر الجامع لاحکام القرآن ہے۔ یہ تفسیر اسپین (قرطبہ) میں لکھی گئی۔ اس کے مولف ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الانصاری (وفات 671ھ) ہیں۔ وہ قرطبہ کے ایک بڑے عالم تھے۔ اسی لیے وہ القرطبی کے نام سے مشہور ہیں۔

القرطبی کا فقہی مسلک مالکی تھا۔ مگر اپنی بے تعصبی کی بنا پر انھوں نے کئی جگہ امام مالک کے مسلک سے اختلاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر امام مالک نماز میں بچہ کی امامت کو ناجائز بتاتے ہیں۔ مگر القرطبی اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بچہ کا نماز میں امام بننا جائز ہے جب کہ وہ قرآن کی قرأت کرنا جانتا ہو: إِمَامَةُ الصَّغِيرِ جَائِزَةٌ إِذَا كَانَ قَارِئًا (تفسیر القرطبی، جلد 1، صفحہ 353)۔

اسی طرح امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ رمضان میں روزہ رکھنے والا ایک شخص اگر بھول کر کھالے تو اس کو قضا کا روزہ رکھنا ہوگا۔ مگر القرطبی اس رائے کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام مالک کے سوا دوسرے فقہا کے نزدیک بھول کر کھانے والے کے اوپر روزہ کی

قضا نہیں ہے اور میں کہتا ہوں کہ یہی مسلک صحیح ہے— قُلْتُ: وَهُوَ الصَّحِيحُ (تفسیر القرطبی، جلد 2، صفحہ 322)۔

موجودہ زمانہ میں علمی ذوق اتنا زیادہ بگڑ چکا ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ آدمی یا تو کلی موافق ہو سکتا ہے یا کلی مخالف۔ اگر کوئی شخص، مثال کے طور پر، ایک جماعت کو مفید جماعت بتائے مگر اس کے بعض طریقوں سے وہ اختلاف کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص مصلحت پرست ہے۔ اصل میں تو وہ اس جماعت کا مخالف ہے، مگر مفاد کی بنا پر وہ اس کی تعریف کر رہا ہے۔ (سفرنامہ اسپین)

غیر فطری اختلاف

مولانا محمد بدر عالم میرٹھی (وفات 1965) مشہور حنفی عالم تھے۔ ان کا ایک واقعہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ”ایک روز فرمانے لگے کہ حنفی مسلک کا سب سے مشکل مسئلہ کون سا ہے جس کو ثابت کرنا حنفیوں کے لیے بڑا دشوار ہوتا ہے۔ ہم نے فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، اس طرح کے مسائل بتانے شروع کیے۔ فرمایا نہیں۔ حنفی مسلک کا سب سے مشکل مسئلہ وتر کا ہے۔ یہ فرما کر اپنے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری کی عربی کتاب ”کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر“ مجھے دی اور فرمایا کہ اس کا غور سے مطالعہ کر کے آنا“ (ماہ نامہ دار العلوم، مارچ 2010، صفحہ 31)۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کے بعد کے زمانے میں، عباسی دور میں جو فقہ بنی، اس کی حقیقت کیا تھی۔ اس زمانے میں بظاہر بہت سے فقہی اسکول قائم ہوئے، لیکن اصل حقیقت کے اعتبار سے سب کی نوعیت ایک تھی، تمام فقہا بظاہر اختلاف کے باوجود

ایک ہی مشترک مہم میں مشغول تھے۔ اور وہ تھا، اسلام کا ایک ظاہری فارم بنانا۔فقہا کی تمام تر توجہ اسلامی عمل کے ظاہری فارم پر تھی، نہ کہ اس کے داخلی اسپرٹ پر۔

اس غلط ترجیح کی بنا پر فقہا کی کوششیں غیر مفید ہو کر رہ گئیں۔ فارم میں فطری طور پر موضوع تنوع اور تعدد ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا ایک مستند فارم بنانے کا نتیجہ صرف یہ نکلا کہ متعدد مذاہبِ فقہ قائم ہو گئے۔ اتحاد کی کوشش عملاً تفریق میں تبدیل ہوگئی۔فقہا کے پاس کوئی خود دریافت کردہ عباداتی ڈھانچہ نہیں تھا، وہ یہی کر سکتے تھے کہ اصحاب رسول کی روایتوں سے عبادت کا طریقہ متعین کریں۔ بطور حقیقت اصحاب رسول کی عبادت کے طریقوں میں اختلاف تھا، ایسی حالت میں اگر فقہا تنوع کے اصول کو مان لیتے تو مسلک کا اختلاف اپنے آپ ختم ہو جاتا۔ اس کے برعکس، انھوں نے عبادات کا واحد مستند فارم بنانے کی کوشش کی، اس کا نتیجہ عملاً یہ نکلا کہ غیر ضروری طور پر مختلف فقہی مسالک قائم ہو گئے۔

شیخ محمد امین شنقیطی (وفات 1905) مشہور عرب عالم تھے۔ ان کا ایک واقعہ مفتی فضیل الرحمن ہلال عثمانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: شیخ شنقیطی اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارے علما دینی بصیرت کے ساتھ جب تک سائنسی علوم حاصل نہیں کریں گے، اور ہمارے نوجوان ان سے فائدہ نہیں اٹھائیں گے۔ اس وقت تک فکری غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ اس وقت یورپ کے افکار دنیا میں چھائے ہوئے ہیں۔ اور ان کا جواب ان کی زبان میں دینا ہوگا۔ (ماہ نامہ دارالعلوم، مارچ 2010، صفحہ 35)

جدید مغربی افکار کے بارے میں مسلم علما کا عام ذہن یہی ہے۔ وہ ان کو اسلام پر مغرب کے فکری حملے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ جس چیز کو اپنی ضرورت سمجھتے ہیں، وہ صرف یہ ہے کہ اہل اسلام کی طرف سے ان کا دفاعی جواب دیا جائے۔ یہ مغربی افکار کا

صرف کمتر اندازہ ہے۔ مغربی افکار، دوسرے الفاظ میں سائنس کی زمین پر پیدا شدہ افکار کا نام ہیں، اور سائنس علوم فطرت کا دوسرا نام ہے۔ اس اعتبار سے، سائنس خود اسلام کے لیے ایک تائیدی علم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جدید طبیعی سائنس اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اسلام کا جدید علمِ کلام ہے۔

اِس معاملے میں مسلم علما کی یہ ہلاکت خیز غلطی ہے کہ وہ مغربی سائنس سے مغربی کلچر کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہ دیکھ سکے۔ اپنی عدمِ واقفیت کی بنا پر وہ دونوں کو ایک دوسرے کے ہم معنی سمجھتے ہیں۔ مغربی سائنس کا علم کتابوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے اور انھوں نے یہ کتابیں پڑھی نہیں۔ اس کے برعکس، ،مغربی کلچر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کتابی مطالعے کے بغیر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے مغربی کلچر کو دیکھ کر یہ فرض کرلیا کہ یہی معاملہ مغربی سائنس کا بھی ہے۔ یہ مسئلہ ”جواب“ دینے کا نہیں ہے، بلکہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جدید سائنسی علم کو اسلام کے حق میں استعمال کیا جائے۔

اختلاف کو نظرانداز کیجیے

جنوبی ہند سے ایک عالمِ دین کا مکتوب موصول ہوا ہے، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

تمل ناڈو اور دوسرے علاقوں میں علمائے کرام مختلف اداروں، مثلاً مدرسہ یا مسجد، وغیرہ، سے منسلک ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جب ان کو ادارے کی انتظامیہ (management) سے کوئی شکایت ہوجاتی ہے، اس وقت وہ منفی رویہ اپنا کر اس ادارے سے نکل کر کسی دوسرے ادارے میں چلے جاتے ہیں، یا ایک نیا ادارہ قائم کر لیتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ پریشان بھی رہتے ہیں، اور ان کا علمی سفر بھی رک جاتا ہے۔ کیوں کہ ادارہ کی ذمے داریاں سنبھالنے میں ان

کا وقت گزر جاتا ہے۔ان واقعات کو دیکھتے ہوئے میرے ذہن میں یہ بات سمجھ میں آئی ہے کہ علما کو صرف حاکم کے خلاف خروج (بغاوت) کے مسائل معلوم ہیں، کسی ادارہ کی انتظامیہ کے خلاف خروج (منفی رویہ) (management) کے مسائل ان کو معلوم نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خروج ہر جگہ غیر مطلوب ہے، اس کا انھیں علم نہیں۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ علما اپنی علمی ذمے داریاں ادا کریں، اور ادارے کی انتظامیہ وغیرہ اپنی ذمے داریوں کو سمجھیں تو معاملہ ٹھیک رہے گا۔ اس معاملے میں علما کے لیے وہ حدیث رسول واحد راستہ ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں: أَدُّوا إِلَيْهِمْ حَقَّهُمْ، وَسَلُوا اللَّهَ حَقَّكُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7052)۔ یعنی ان کو ان کا حق ادا کرو، اور اپنا حق اللہ سے مانگو۔ اگر اس حدیث کے مطابق عمل نہ کیا جائے، تو باعتبارِ نتیجہ صرف فساد برپا ہوگا، شکایت کا ازالہ نہیں ہوگا۔

اس سلسلے میں محدثین ہمارے لیے نمونہ ہیں۔ انھوں نے اپنی علمی اور دینی ذمے داریاں بھرپور طریقے سے ادا کی، لیکن وقت کے حکام سے جو شکایت تھی، اس کو نظر انداز کیا۔ جس کی وجہ سے آج ہم ان کے علمی ذخیرے سے فائدہ حاصل کررہے ہیں۔ اس کے برعکس، موجودہ دور کے علمائے کرام کا حال یہ ہے کہ دلوں میں شکایت پالنے کی وجہ سے وہ ایک طرف اپنے لیے مسائل میں اضافہ کرلیتے ہیں، تو دوسری طرف اس سے زیادہ بڑا یہ نقصان ہوتا ہے کہ وہ کوئی علمی کام نہیں کر پاتے ہیں اور نہ ہی کوئی اہم کارنامہ انجام دے پاتے ہیں۔ تقریباً ہر عالم اپنی انتظامیہ اور متولیانِ مساجد کے خلاف شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے، یہاں تک کہ پوری زندگی شکایت کی نذر ہوجاتی ہے۔

آج علما صرف جلسوں یا کانفرنسوں میں نظر آتے ہیں، مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو کوئی علمی تحقیق یا علمی یادگار نہیں دے پاتے۔ اس کے بغیر ہی وہ دنیا سے شاکی ہو کر

رخصت ہو جاتے ہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ علما اپنی اس سوچ کی اصلاح کریں، وہ اپنی لاعلمی کو جانیں۔ وہ ادارے کی انتظامیہ کی نیتوں پر حملے ترک کریں، اس کے بجائے ان کو چاہیے کہ جو مواقع ان کو حاصل ہیں، ان پر وہ فوکس کریں، اور امت مسلمہ کو فائدہ پہنچائیں۔ (مولانا سید اقبال احمد عمری، عمر آباد، تامل ناڈو)

مکتوب نگار نے جو بات لکھی ہے، وہ بلاشبہ درست ہے۔ لیکن راقم الحروف کے نزدیک اس کا سبب ماضی کی تاریخ تک جاتا ہے۔ فقہائے متقدمین اس معاملے میں میرے نزدیک ٹرینڈ سیٹر (trend setter) کی حیثیت رکھتے ہیں۔ فقہائے متقدمین کے زمانے میں مسائل میں اختلافات پیدا ہوئے۔ اس وقت فقہائے متقدمین نے مسائل پر لامتناہی بحثیں چھیڑ دیں۔ یہ بلاشبہ ایک غلو تھا، جس کے نتیجے میں غیر ضروری طور پر فقہی مسالک بنے، اور بڑھتے بڑھتے ان مسائل کی بنیاد پر مختلف قسم کے فقہی گروہ بن گئے۔ فقہ صرف ایک ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام کے زمانے میں عملاً موجود تھی۔ بعد کے زمانے میں فقہی بنیاد پر مختلف گروہ بن گئے، مثلاً حنفی فقہ، مالکی فقہ، شافعی فقہ، حنبلی فقہ، جعفری فقہ، وغیرہ۔ وہ وہی چیز تھی جس کو قرآن میں تفرق فی الدین (2:103) کہا گیا ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مشترک امور میں توحد کا طریقہ اختیار کیا جائے، اور اختلافی امور میں توسع کا طریقہ۔

علمائے فقہ کو اس معاملے میں توسع کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا، جس کی طرف ابن عبد البر نے اپنی کتاب جامع بیان العلم وفضلہ (جلد 1، صفحہ 345) میں اشارہ کیا ہے۔ اس اختلافی مسائل میں غلو کے نتیجے میں ایک مبتدعانہ اصول پیدا ہوا، جس کو ترجیح کہتے ہیں۔ ترجیح کا طریقہ، جو علمائے فقہ کے درمیان رائج ہوا، وہ بلاشبہ ایک مبتدعانہ اصول تھا۔ صحیح اصول

توسع ہے، نہ کہ ترجیح۔ عبادات میں اصل زور روح یعنی اسپرٹ پر دینا چاہیے، مگر ترجیح کی اس بحث نے یہ کیا کہ عبادات میں روحِ عبادت کا مسئلہ عملاً غیر اہم بن گیا، اور ساری بحث مسائل پر ہونے لگی۔ مسائل بالفاظ دیگر فارم پر ہونے لگی۔ اسی کا نتیجہ آخر کار وہ نکلا جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدَى (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 1763)۔ یعنی ان کی مسجدیں آباد ہوں گی، لیکن وہ ہدایت سے خالی ہوں گی۔ یہی معاملہ اداروں کے ذمہ داران سے اختلاف کا ہے۔ اگر اس قسم کے معاملے کا آپ تجزیہ کیجیے تو آپ پائیں گے کہ یہ سارے اختلافات فروعی چیزوں میں ہیں، نہ کہ اصولی چیزوں میں۔ جب کہ اتحاد صرف اصولی مسائل میں ممکن ہے، فروعی مسائل میں ممکن ہی نہیں۔

اس معاملے پر شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے ہمیں یہ کرنا چاہیے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اسلام کے دورِ اول میں جب خروج علی الحاکم کا مسئلہ پیدا ہوا، تو علمائے اسلام نے اس پر کیا رویہ اختیار کیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اس پر علما کا یہ اجماع ہو گیا کہ حاکم کے خلاف خروج کرنا، جائز نہیں ہے۔ چنانچہ امام نووی نے لکھا ہے: وَأَمَّا الْخُرُوجُ عَلَيْهِمْ وَقِتَالُهُمْ فَحَرَامٌ بِإِجْمَاعِ الْمُسْلِمِينَ وَإِنْ كَانُوا فَسَقَةً ظَالِمِينَ (شرح النووی علی صحیح مسلم، جلد 12، صفحہ 229)۔ یعنی حاکم کے خلاف خروج کرنا، مسلمانوں کے اجماع سے حرام ہے، اگرچہ حاکم فاسق وظالم ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ حاکم کے خلاف خروج نہ کرنا، مطلقاً مطلوب ہے۔ کوئی بھی عذر (excuse) اس معاملے میں خروج کو جائز نہیں کرتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ خروج ایک اور چیز سے جڑا ہوا ہے، اور وہ ہے، استحکام (stability)۔ سماجی زندگی میں استحکام مطلق طور

پر مطلوب ہے۔ کوئی بھی چیز جو استحکام کو نقصان پہنچائے، وہ بطورِ اصول قابلِ ترک ہے۔

قدیم زمانے میں یہ عمل سیاسی حاکم کے مقابلے میں اختیار کیا گیا تھا، موجودہ زمانے میں یہی اصول اس معاملے میں اپلائی ہوتا ہے، جب کہ ادارے کے ذمے دار کے خلاف خروج کا معاملہ ہو۔ کسی کے لیے یہ تو جائز ہے کہ وہ کسی عذر کو لے کر خاموشی کے ساتھ ادارے سے الگ ہوجائے۔ وہ الگ ہونے سے پہلے بھی اس معاملے میں خاموش رہے، اور ادارے سے الگ ہونے کے بعد بھی خاموش رہے۔ ادارے کے خلاف یا ادارے کے ذمے داران کے خلاف شکایتیں کرنا، اور منفی باتیں کر کے لوگوں کے اندر شکایتی ماحول پیدا کرنا، ہرگز جائز نہیں ہے۔

دوسرا حصہ

مینج کرنا سیکھیے

معاملات میں لوگ عام طور پر دو طریقے کو جانتے ہیں۔ ایک ہے فریقِ مخالف سے ٹکرانا، اور دوسرا ہے، فریقِ ثانی کے مقابلے میں سرینڈر کرنا۔ عام طور پر لوگ ٹکرانے کو بہادری سمجھتے ہیں، اور سرینڈر کرنے کو بزدلی۔ یہ دونوں طریقے غیر حکیمانہ ہیں۔ حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ آپ معاملے کو مینج کرنا سیکھیں۔ یعنی براہ راست مقابلہ کیے بغیر بالواسطہ انداز میں مسئلے کو حل کرنا۔

مثال کے طور پر رسول اللہ ایک بار سفر میں تھے۔ آپ کو خبر ملی کہ فریقِ مخالف کا ایک دستہ آپ کی طرف چلا آ رہا ہے۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا: مَنْ رَجُلٌ يَخْرُجُ بِنَا عَلَى طَرِيقٍ غَيْرِ طَرِيقِهِمْ الَّتِي هُمْ بِهَا؟ أَنَّ رَجُلًا مِنْ أَسْلَمَ قَالَ: أَنَا يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: فَسَلَكَ بِهِمْ طَرِيقًا وَعْرًا أَجْرَلَ بَيْنَ شِعَابٍ، فَلَمَّا خَرَجُوا مِنْهُ، وَقَدْ شَقَّ ذَلِكَ عَلَى الْمُسْلِمِينَ وَأَفْضَوْا إِلَى أَرْضٍ سَهْلَةٍ عِنْدَ مُنْقَطِعِ الْوَادِي (سیرت ابن ہشام، جلد 2، صفحہ 309)۔ یعنی آپ نے کہا: کون ہے جو ہم کو اس راستے سے لے کر چلے، جو ان سے الگ راستہ ہو۔ قبیلہ اسلم کے ایک آدمی نے کہا: میں، اے خدا کے رسول۔ پھر وہ ان کو لے کر ایک دشورراستے سے چلا۔ یہ ایک مشکل بھرا راستہ تھا۔ جب وہ اس دشوارراستے سے نکلے، اور یہ راستہ مسلمانوں کے لیے بہت مشقت والا تھا، وہ لوگ وادی کے خاتمے پر کھلے میدان میں پہنچ گئے۔

اس سنت رسول سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹکراؤ کا اندیشہ ہو تو اپنا راستہ بدل دیجیے۔ ایسے موقع پر آپ ہرگز ایسا نہ کریں کہ اپنے راستے پر چلتے رہیں، یہاں تک کہ ٹکراؤ کی نوبت آجائے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ اپنے راستے کو بدلیں۔ اپنے منصوبے کو نئے انداز سے مرتب کریں۔ اس طریقے کو ری پلاننگ کہا جاتا ہے۔ ری پلاننگ کا یہ طریقہ ہر جگہ مطلوب ہے۔ گھر کے اندر بھی، اور گھر کے باہر بھی۔ چھوٹے معاملے میں بھی اور بڑے معاملے میں بھی۔ گھریلو معاملے میں بھی اور بڑے بڑے اجتماعی معاملات میں بھی۔

اختلاف کے باوجود

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تیسرے خلیفہ راشد تھے۔ آخر عمر میں بعض جھوٹی خبروں کی بنا پر ایک ہزار سے زیادہ آدمی مدینہ آئے۔ انھوں نے مدینہ پہونچ کر کافی شور وغل کیا اور آخر کار حضرت عثمان کے مکان کو گھیر لیا۔ اگرچہ حضرت عثمان کے خلاف ان کا الزام سراسر بے بنیاد تھا، مگر یہ مسلمان آپ سے اتنا برہم ہوئے کہ آپ کا گھر سے نکلنا اور گھر میں پانی جانا بند کر دیا۔ یہاں تک کہ 18 ذی الحجہ 35ھ کو حملہ کر کے آپ کو شہید کر دیا۔ بوقتِ وفات آپ کی عمر 82 سال تھی۔

حضرت عثمان کا محاصرہ تقریباً 40 دن تک جاری رہا۔ بلوائیوں نے جب حضرت عثمان کو گھیر لیا اور مکان سے نکلنے پر پابندی لگا دی تو آپ کے لیے مسجد جانا ممکن نہ رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے نمازوں کی امامت آپ ہی فرماتے تھے۔ جب آپ کا مسجد جانا بند ہو گیا تو بلوائیوں کا سردار غافقی بن حرب عکّی امام بن گیا۔ اس نے مدینہ کی مسجد میں نمازوں کی امامت شروع کر دی۔

یہ مدینہ کے مسلمانوں کے لیے بڑی سخت آزمائش کی بات تھی۔ ایک طرف وہ اپنے لیے ضروری سمجھتے تھے کہ مسجد میں جا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کریں، دوسری طرف وہ دیکھ رہے تھے کہ ایک شخص جو کھلا ہوا مفسد اور غلط کار ہے، وہی مسجد کا امام بنا ہوا ہے۔ اس نازک حالت میں ایک شخص حضرت عثمان سے ملا اور ان سے پوچھا کہ ایسی حالت میں ہم کیا کریں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے انھیں یہ ہدایت فرمائی کہ تم لوگ اس کے پیچھے نماز ادا کرو۔ آپ نے فرمایا:

> فَإِذَا أَحْسَنَ النَّاسُ فَأَحْسِنْ مَعَهُمْ، وَإِذَا أَسَاءُوا فَاجْتَنِبْ إِسَاءَتَهُمْ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 695)۔ یعنی، جب وہ لوگ کوئی نیک کام کریں تو اس میں ان کا ساتھ دو اور جب وہ لوگ کوئی برا کام کریں تو ان کی برائی سے دور رہو۔

خلیفہ راشد کے اس واقعہ میں عظیم الشان نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ہمیں خواہ کتنی ہی زیادہ شکایت ہو، اس کے بارے میں اظہار رائے کرتے ہوئے ہمیں ہمیشہ انصاف پر قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں اپنے اختلاف کو حد کے اندر رکھنا چاہیے، نہ یہ کہ اختلاف پیدا ہونے کے بعد ہم حد کے باہر نکل جائیں۔

آخرت رخی سوچ

غزوۂ ذات السلاسل کا واقعہ ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرو بن العاص کو لشکر کا سردار مقرر کیا۔ مگر پورا لشکر بیک وقت تیار نہ تھا۔ آپ نے عمرو بن العاص کو ایک دستہ کے ساتھ پہلے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد دو سو مہاجرین و انصار کے ساتھ دوسرا دستہ تیار ہوا اور ابوعبیدہ بن الجراح کی سرداری میں روانہ ہوا۔ جھنڈا دیتے ہوئے آپ نے ان کو جو نصیحتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی: جب تم اپنے ساتھی (عمرو بن العاص) سے ملو تو تم دونوں مل کر کام کرنا، اختلاف مت کرنا— إِذَا قَدِمْتَ عَلَى صَاحِبِكَ فَتَطَاوَعَا وَلَا تَخْتَلِفَا۔

ابوعبیدہ کا دستہ جب مدینہ سے چل کر عمرو بن العاص کے پاس پہنچا تو نماز کا وقت آ گیا تھا۔ صفیں کھڑی ہوئیں، ابوعبیدہ نے چاہا کہ امامت کریں۔ عمرو بن العاص نے اس سے اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا آپ میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ یہ صحیح نہیں کہ آپ امامت کریں جب کہ اصل امیر میں ہوں۔ ابوعبیدہ کے دستہ کے لوگ جن میں ابوبکر و عمر بھی تھے، نے کہا کہ عمرو بن العاص اپنے دستہ کے امیر ہیں اور ابوعبیدہ اپنے دستہ کے۔ عمرو بن العاص نے اس تقسیم سے اتفاق نہیں کیا، اور کہا: تم لوگ میری مدد کے لیے بھیجے گئے ہو (إِنَّمَا أَنْتُم مَدَدٌ أُمْدِدْتُ بِكُم)، پس میں ہی قائد ہوں۔

ابوعبیدہ بن الجراح نے جب اختلاف بڑھتے دیکھا تو انھوں نے اپنا حق واپس لے لیا، اور کہا کہ رسول اللہ نے مجھے نصیحت کی تھی کہ تم عمرو بن العاص سے ملو تو جھگڑا مت کرنا، اتفاق کے ساتھ کام کرنا:

وَإِنّكَ وَاَللّٰهِ إنْ عَصَيْتنِي لَأُطِيعَنّكَ۔ یعنی، خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی میں تمھاری اطاعت کردوں گا (مغازی الواقدی، جلد 2، صفحہ 771)۔

اختلاف کے باوجود اعتراف

صحابہ ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جنھوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے براہ راست تربیت پائی ہو۔ صحابہ کا ہر قول اور ہر عمل پیغمبر اسلام کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ صحابہ پیغمبرانہ اخلاقیات کا توسیعی نمونہ (extended example) تھے۔

صحابہ کے دو گروہ تھے — انصار اور مہاجرین۔ مہاجر صحابہ میں سے دو کے نام یہ ہیں: سعد بن ابی وقاص (وفات 55ھ)، خالد بن الولید (وفات 21ھ)۔ ان دونوں کے تعلق سے ایک روایت حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ روایت یہ ہے: كَانَ بَيْنَ خَالِدِ بْنِ الْوَلِيدِ، وَبَيْنَ سَعْدٍ كَلَامٌ، قَالَ: فَتَنَاوَلَ رَجُلٌ خَالِدًا عِنْدَ سَعْدٍ، قَالَ: فَقَالَ سَعْدٌ: مَهْ، فَإِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 25535)۔ یعنی، خالد بن الولید اور سعد کے درمیان (نزاعی) تکرار ہوگئی۔ راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ایک شخص نے سعد سے خالد کی برائی بیان کی۔ تو سعد نے کہا: دور ہو، ہم دونوں کے درمیان جو معاملہ ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صحابی، سعد بن ابی وقاص اور خالد بن الولید کے درمیان کوئی ذاتی نزاع پیدا ہوگئی۔ کسی معاملے پر بات کرتے ہوئے دونوں کے درمیان

تکرار ہوگئی۔ اس بات کو لے کر ایک شخص نے سعد بن ابی وقاص سے خالد بن الولید کی برائی بیان کی۔ لیکن سعد ایک اعلیٰ اخلاق والے آدمی تھے۔ انھوں نے فوراً کہا کہ ہمارے اور خالد کے درمیان جو اختلاف ہے، وہ ایک ذاتی نوعیت کا اختلاف ہے۔ اس اختلاف کو ہم ذاتی حد تک رکھیں گے۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس کی بنا پر ہم ایک دوسرے کو دین کے اعتبار سے برا سمجھنے لگیں۔ اجتماعی زندگی میں باہمی نزاع کا پیدا ہونا، ایک عام بات ہے، لیکن اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ ذاتی معاملے کو دین سے الگ رکھیں۔ ذاتی شکایت کو وہ ایک دوسرے کے دین تک نہ لے جائیں۔ ذاتی اختلاف کے باوجود وہ دینی اعتبار سے ایک دوسرے کے اعتراف میں کمی نہ آنے دیں۔

اختلاف کو مسئلہ نہ بنانا

دو اصحابِ رسول کے درمیان اختلاف کا ایک واقعہ مختلف کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں: سَمِعْتُ طَارِقًا يَعْنِي ابْنَ شِهَابٍ، يَقُولُ: كَانَ بَيْنَ خَالِدٍ وَسَعْدٍ كَلَامٌ، فَذَهَبَ رَجُلٌ يَقَعُ فِي خَالِدٍ عِنْدَ سَعْدٍ، فَقَالَ: مَهْ إِنَّ مَا بَيْنَنَا لَمْ يَبْلُغْ دِينَنَا (حلیۃ الاولیاء، جلد 1، صفحہ 94)۔ یعنی طارق بن شہاب کہتے ہیں کہ خالد بن الولید اور سعد بن ابی وقاص کے درمیان کسی مسئلے پر کچھ تکرار ہوگئی۔ اس کے بعد ایک آدمی نے سعد کے پاس خالد کی برائی کی۔ تو سعد نے کہا: ٹھہرو، جو ہمارے درمیان ہے، وہ ہمارے دین تک نہیں پہنچے گا۔

اختلاف ایک امر فطری ہے۔ لیکن اختلاف کو اسی مسئلے تک محدود رکھنا چاہیے، جو واقعۃً دونوں فریق کے درمیان ہے۔ نزاعی مسئلہ میں دوسرے غیر نزاعی معاملے کو شامل کرنا، ایک ایسی بات ہے، جو غیر اخلاقی ہے، اور غیر شرعی بھی۔

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان اگر کوئی نزاع پیدا ہو، تو یا تو اس کو نظر

انداز کر دیا جائے، اور مسئلے کو مسئلہ بننے سے پہلے ختم کر دیا جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو، تو نزاع کو متعلق مسئلے کی حد تک محدود رکھا جائے۔ کسی حال میں اس کو باہر نہ لے جایا جائے۔

کوئی نزاع اس وقت بڑھتا ہے، جب کہ اس کو نزاع کی حد سے باہر تک وسیع کیا جائے۔ اگر نزاع کو سختی کے ساتھ اصل نزاعی مسئلے تک محدود رکھا جائے، اور گفتگو کو اخلاقی حدود کا پابند رکھا جائے، تو نزاع غیر مطلوب حد تک وسیع نہ ہوگی۔ مثلاً مسئلہ لین دین کا ہو، اور اس کو لے کر یہ کہا جائے کہ تمھارا تو پورا خاندان لین دین میں نا قابلِ اعتبار رہے۔

منافق کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ مسئلے کو مسئلے کی حد تک نہیں رکھتا، بلکہ مسئلے کو غیر متعلق باتوں تک لے جاتا ہے (إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ) صحیح البخاری، حدیث نمبر 34۔ اس بنا پر مسئلہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ نئے نئے نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ مسئلہ پھیل کر غیر متعلق بحثوں تک پہنچ جاتا ہے۔

وسیع تر مفاد

جس زمانے میں حضرت علی اور حضرت معاویہ کے درمیان جنگ ہو رہی تھی، قیصر روم (قسطنطنیہ) نے ارادہ کیا کہ وہ مسلم دنیا پر حملہ کر دے۔ اس کے ذہن میں آیا کہ اِس وقت مسلمان باہمی لڑائی میں مبتلا ہیں۔ اگر اس وقت میں نے حملہ کر دیا تو میں شام ومصر وغیرہ علاقہ پر دوبارہ قبضہ کر سکتا ہوں۔ حضرت معاویہ کو اس کی خبر ملی تو انھوں نے فوراً قیصر روم کے نام ایک خط روانہ کیا، اس میں لکھا ہوا تھا:

وَاللّٰهِ لَئِنْ لَمْ تَنْتَهِ وَتَرْجِعْ إِلَى بِلَادِكَ، لَأَصْطَلِحَنَّ أَنَا وَابْنُ عَمِّي عَلَيْكَ وَلَأُخْرِجَنَّكَ مِنْ جَمِيعِ بِلَادِكَ، وَلَأُضَيِّقَنَّ عَلَيْكَ الْأَرْضَ بِمَا رَحُبَتْ (البدایۃ والنہایۃ، جلد 8، صفحہ 127)۔ یعنی، اللہ کی قسم، اگر تم باز نہ آئے اور اپنے ملک کی طرف

واپس نہ ہوئے تو میں اپنے چچا زاد بھائی کے ساتھ تیرے خلاف صلح کرلوں گا پھر تیرے پورے ملک پر قبضہ کر کے زمین کی وسعت کے باوجود اس کو تیرے اوپر تنگ کر دوں گا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت معاویہ کے اس خط کے بعد قیصر روم نے اپنا حوصلہ کھودیا۔اس نے فوجوں کی تیاری روک دی۔اس نے سمجھ لیا کہ اب مسلمانوں سے جنگ چھیڑنا اپنی مزید بربادی کو دعوت دینا ہے۔یہ زندہ لوگوں کا طریقہ ہے۔ان کے اندر آپس میں اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔مگر جب معاملہ وسیع تر مفاد کا آجائے تو وہ اپنے اختلاف کو ختم کر کے ایک ہوجاتے ہیں۔ان کے اختلاف کی ایک حد ہوتی ہے۔حد کے آجانے کے بعد ان کا اختلاف باقی نہیں رہتا۔

زندہ انسان دوستی کے باوجود کسی کی بے جا حمایت نہیں کرتا۔وہ دشمنی کے باوجود کوئی چھوٹی حرکت نہیں کرتا۔وہ انفرادی جھگڑے کے باوجود اجتماعی امور میں متحد ہوجاتا ہے۔وہ شخصی کدورت کے باوجود اسلامی تعلق میں فرق نہیں آنے دیتا۔زندہ انسان کسی سے نزاع پیش آنے کے باوجود اس کی خصوصیات کا اعتراف کرتا ہے۔وہ رنجش پیدا ہونے کے باوجود امانتوں کو ادا کرتا ہے۔زندہ انسان کسی حال میں پست حرکت نہیں کرتا، وہ کسی حال میں اپنی انسانیت کو نہیں کھوتا۔زندہ انسان دشمن ہوسکتا ہے مگر وہ کمینہ نہیں ہوسکتا۔زندہ انسان کو شکایت ہوسکتی ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ جس سے اس کو شکایت ہو اس کے خلاف وہ جھوٹا الزام لگانے لگے۔

تنقید کوسن کر

خلیفہ ہارون الرشید (193-149ھ) نے ایک بار اپنے وزیر سے کہا کہ مجھ کو کسی بزرگ کے پاس لے چلو۔وہ خلیفہ کو الفضیل بن عیاض (187-105ھ) کے پاس لے گیا۔اس سلسلہ میں لمبا قصہ کتابوں میں نقل ہوا ہے۔

خلیفہ کے ساتھ اس کے کئی درباری تھے۔ انھوں نے فضیل سے مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے بھی مصافحہ کیا۔ خلیفہ نے اپنا ہاتھ جب فضیل کے ہاتھ میں رکھا تو انھوں نے کہا کہ کتنا زیادہ نرم ہے یہ ہاتھ، اگر کل کے دن وہ اللہ کے عذاب سے بھی بچ جائے (یَا لَهَا مِنْ کَفٍّ مَا أَلْیَنَهَا، إِنْ نَجَتْ غَدًا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ)۔ اس کے بعد خلیفہ نے فضیل سے کہا کہ کچھ نصیحت کیجیے۔ انھوں نے تلخ نصیحت کے انداز میں کچھ کلمات کہے۔ خلیفہ نے کہا کہ اور کچھ فرمائیے۔ فضیل نے مزید کچھ کہا۔ اس طرح وہ سخت تنقیدی انداز میں دیر تک خلیفہ کو ڈرانے والی باتیں کرتے رہے۔ خلیفہ ان کی نصیحتوں کو سن کر رو پڑا۔ آخر میں اس نے اپنے وزیر سے کہا کہ جب تم مجھ کو کسی آدمی کے پاس لے جاؤ تو اسی طرح کے آدمی کے پاس لے چلو۔ یہ مسلمانوں کے سردار ہیں: إِذَا دَلَلْتَنِي عَلَى رَجُلٍ فَدُلَّنِي عَلَى مِثْلِ هَذَا، هَذَا سَيِّدُ الْمُسْلِمِينَ (حلیۃ الاولیاء للاصفہانی، جلد 8، صفحہ 107-106)۔

آدمی کے اندر اگر صحیح مزاج ہو تو وہ نصیحت کو سن کر اس سے سبق لے گا، خواہ یہ نصیحت کتنے ہی سخت تنقیدی الفاظ میں کی گئی ہو۔ ایسا آدمی نصیحت کو اس کے معنوی اعتبار سے دیکھے گا، نہ کہ اس کے لفظی اعتبار سے۔ وہ اس کو اصولی حیثیت سے لے گا، نہ کہ ذاتی حیثیت سے۔

صحیح مزاج اگر بادشاہ کے اندر ہو تو وہ بھی تنقید کو سن کر اسے برداشت کرے گا۔ اور ایک معمولی آدمی بھی اگر صحیح مزاج نہ رکھتا ہو تو وہ تنقید کو سن کر بگڑ جائے گا۔ تنقید کسی آدمی کو پہچاننے کی سب سے زیادہ یقینی کسوٹی ہے۔ تنقید کو سن کر جو آدمی اپنے ذہنی توازن کو نہ کھوئے وہی اعلیٰ انسان ہے۔ اور جو شخص تنقید کو سن کر بگڑ جائے، اس کے متعلق یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اپنے اندر اعلیٰ انسان والی خصوصیات رکھتا ہے— تنقید کسی آدمی کی انسانیت اور اس کے تقویٰ کی پہچان کراتی ہے۔

ذہنی ارتقا کا ذریعہ

علمائے سلف کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے درمیان دینی مسائل میں کثرت سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ اِس کے باوجود ہر عالم دوسرے عالم کا احترام کرتا تھا۔ اِس سلسلے میں یہاں دو واقعات نقل کیے جاتے ہیں: امام احمد بن حنبل اور علی بن المدینی کے درمیان ایک مسئلے پر بحث ہوئی اور بحث ایسی ہوئی کہ دونوں طرف سے آوازیں بلند ہونے لگیں۔ مجھے اندیشہ ہونے لگا کہ آپس میں بدمزگی پیدا ہوجائے گی (وَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتَّى خِفْتُ أَنْ يَقَعَ بَيْنَهُمَا جَفَاءٌ)۔ لیکن علی بن المدینی واپس جانے لگے تو امام احمد بن حنبل نے ان کے ساتھ اِس درجہ احترام کا معاملہ کیا کہ آگے بڑھ کر ان کی رکاب تھام لی (جامع بیان العلم لابن عبد البر، جلد 2، صفحہ 107)۔

اِسی طرح یونس صدفی امام شافعی کے ایک ممتاز شاگرد ہیں۔ ایک مرتبہ کسی مسئلے میں استاذ سے خوب بحث ہوئی۔ پھر جب اگلی ملاقات ہوئی تو امام شافعی نے ان کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا کہ کیا یہ بات بہتر نہ ہوگی کہ ہم بھائی بھائی بن کر رہیں، خواہ کسی مسئلے میں بھی ہمارے درمیان اتفاق پیدا نہ ہوسکے: أَلَا يَسْتَقِيمُ أَنْ نَكُونَ إِخْوَاناً وَإِنْ لَمْ نَتَّفِقْ فِي مَسْأَلَة (سیر اعلام النبلاء، جلد 10، صفحہ 16)۔

اِس طرح کے واقعات کا مطلب صرف باہمی احترام (mutual respect) نہیں ہے، بلکہ اِن واقعات میں ایک اور زیادہ بڑا پہلو ہے اور وہ ہے اختلافِ رائے (difference of opinion) کا احترام۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ اختلافِ رائے کو علمی پہلو سے دیکھنا، نہ کہ شخصی پہلو سے۔

اختلافِ رائے کا احترام کوئی سادہ بات نہیں، اس کا براہِ راست تعلق ذہنی ارتقا سے ہے۔

جس ماحول میں اختلافِ رائے کو برا نہ سمجھا جائے، وہاں لازماً ڈسکشن کا ماحول ہوگا۔ لوگ علمی دلائل کے ذریعے اپنا اپنا نقطۂ نظر بیان کریں گے۔ جہاں اختلافِ رائے کو برا سمجھنے کے بجائے اختلافِ رائے کا احترام پایا جاتا ہو، وہاں ذہنی جمود نہ ہوگا، بلکہ ایسے ماحول میں ذہنی ارتقا کا عمل جاری رہے گا اور ذہنی ارتقا بلاشبہ کسی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

اختلاف، نفرت

مولانا محمود حسن دیو بندی (1851-1920) تحریکِ خلافت کے پر جوش حامیوں میں سے تھے۔ ان کے شاگرد مولانا اشرف علی تھانوی (1862-1943) تحریکِ خلافت کے مخالف تھے۔ وہ اس تحریک پر کھلم کھلا تنقید کرتے تھے۔ مگر استاد نے اپنے شاگرد کی اس "گستاخی" کو کبھی برا نہیں مانا۔ دونوں کے درمیان آخر وقت تک مخلصانہ تعلق باقی رہا۔

مولانا اشرف علی تھانوی ایک گفتگو کے ذیل میں اپنے استاد اور شیخ کے بارے میں لکھتے ہیں: "حضرت کے قلب پر میرے اختلاف سے ذرہ برابر بھی گرانی نہ تھی۔ ایک مرتبہ تحریک خلافت کے زمانہ میں حضرت کی بیٹھک میں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے میرے متعلق برے بھلے الفاظ کہہ رہے تھے۔ کچھ الفاظ حضرت کے کانوں میں پڑ گئے۔ باہر تشریف لے آئے۔ بہت خفا ہوئے اور یہ فرمایا کہ خبردار، جو آئندہ ایسے الفاظ کبھی استعمال کیے۔ اور یہ فرمایا کہ میرے پاس کیا وحی آتی ہے کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ سب ٹھیک ہے۔ میری بھی ایک رائے ہے۔ اس کی بھی ایک رائے ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے یہ فرمایا کہ ہمیں تو اس پر فخر ہے کہ جو شخص تمام ہندستان سے بھی متاثر نہ ہوا اور کسی کی بھی پروانہ کی وہ بھی ہماری ہی جماعت سے ہے"۔ (ملفوظات حکیم الامت، مولانا اشرف علی تھانوی، ادارہ تالیفات اشرفیہ، ملتان، صفحہ 114)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف کے معاملہ میں علمائے امت کا طریقہ کیا ہونا چاہیے۔ اس طرح کے اختلافات میں وہی روح کارفرما ہونی چاہیے جو امام شافعی کی طرف منسوب اس قول میں بیان کیا گیا ہے: میری رائے درست ہے، مگر احتمالِ خطا کے ساتھ۔ دوسرے کی رائے غلط ہے مگر احتمالِ صحت کے ساتھ — رَأْيِي صَوابٌ يَحْتَمِلُ الخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ۔

یہ اختلافات عام طور پر اجتہادی امور میں ہوتے ہیں اور اجتہادی امور میں ہمیشہ ایک سے زیادہ رائے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لیے صحیح ترین مسلک یہ ہے کہ آدمی اختلاف کے باوجود اپنے آپ کو فریقِ ثانی کی نفرت سے بچائے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر کو شدت کے ساتھ پیش کرے، اس کے باوجود اس کی نفسیات یہ ہو کہ یہ معاملہ 50-50 فیصد کا ہے، نہ کہ صد فی صد کا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف

مولانا حسین احمد مدنی (1957-1879) سیاسی مسلک کے اعتبار سے انڈین نیشنل کانگریس کے حامی تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی (1943-1863) کا مسلک اس معاملہ میں مختلف تھا۔ وہ کانگریس کی حمایت کو مسلمانوں کے لیے درست نہیں سمجھتے تھے۔ اس اختلاف کے باوجود دونوں بزرگوں میں نہایت اچھے تعلقات تھے۔ دونوں ایک دوسرے کی قدر کرتے تھے۔

ایک شخص کا ذہنی سانچہ اگر یہ ہو کہ موقف صرف دو ہوا کرتے ہیں۔ یا کامل موافقت یا کامل مخالفت، تو وہ دونوں بزرگوں کے اس طریقہ کو "زمانہ شناسی" پر محمول کرے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان اگرچہ ایک دوسرے کے مخالف تھے، مگر ذاتی مفاد کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بارے میں اچھے الفاظ بولتے رہے۔

مگر جو شخص اسلام کی روح اور مومنانہ مزاج کو جانتا ہو وہ اس کو وسعتِ نظری قرار دے گا۔ وہ کہے گا کہ دونوں صاحبان مخلص تھے۔ دونوں کا دین ایک تھا۔ البتہ بعض مسائل میں دونوں کی رائے ایک دوسرے سے الگ ہوگئی تھی۔ اور اس قسم کا اختلاف انسانوں کے درمیان ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہر دور کے مومنین صالحین میں اس قسم کا اختلاف پایا جاتا تھا اور ہمیشہ پایا جاتا رہے گا۔ یہ اختلاف بذات خود کوئی غیر محمود چیز نہیں۔ وہ غیر محمود صرف اس وقت بنتا ہے جب کہ اختلاف صرف اختلاف نہ رہے، وہ نفرت اور عناد تک جا پہنچے۔

اصحابِ رسول کے درمیان بہت سے امور میں اختلاف تھا۔ اسی طرح فقہا اور علما میں اور مفسرینِ قرآن اور شارحینِ حدیث میں ہزاروں اختلاف پائے جاتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے اختلافات کا برملا اظہار کیا۔ اس کے باوجود ایسا ہوا کہ انھوں نے ایک دوسرے کا اعتراف کیا۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کی قدردانی کرتے رہے۔ اس دوطرفہ عمل کا سبب زمانہ شناسی نہیں تھا بلکہ دین شناسی تھا۔ ان کا یہ مسلک مفادِ دنیا کی بنا پر نہ تھا بلکہ خوفِ آخرت کی بنا پر تھا۔

اختلاف کے ساتھ اعتراف ایک آدمی کے مومنِ خاشع ہونے کی علامت ہے۔ لیکن بے خبر لوگوں کے لیے وہ مفاد پرستی اور زمانہ شناسی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔

اتحاد کی طاقت

ٹائیکو براہے (Tycho Brahe, 1546-1601) اسکانیا (ڈنمارک) میں پیدا ہوا، اور پراگ میں اس کی وفات ہوئی۔ جوہانس کیپلر (Johannes Kepler, 1571-1630) جرمنی کے ورٹمبرگ میں پیدا ہوا، اور ریزنبرگ (Regensburg) میں اس کی وفات ہوئی۔ دونوں فلکیات کے شعبہ میں تحقیق کر رہے تھے۔ مگر دونوں میں سے کوئی بھی اس حیثیت میں نہ تھا کہ وہ عالم افلاک میں کوئی بڑی حقیقت دریافت کر سکے۔

ٹائیکو براہے اور کیپلر دونوں ہم عصر تھے۔ مگر ایک چیز دونوں کے لیے کسی بڑی فلکیاتی دریافت میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ دونوں میں سے کوئی بھی اپنے موضوع کے ہر گوشہ پر مہارت نہیں رکھتا تھا۔ ٹائیکو براہے نے کثرت سے فلکیات کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ اپنے مشاہدات کو قلم بند کرتا رہتا تھا، فلکیاتی مشاہدات کے بارے میں یہ تحریری ذخیرہ اس کے پاس کافی مقدار میں جمع ہو گیا تھا۔ مگر علم الافلاک کا دوسرا پہلو ریاضی سے تعلق رکھتا ہے، اور ٹائیکو براہے ریاضی میں کمزور تھا۔ اس بنا پر اس کو یہ قدرت حاصل نہ تھی کہ اپنے مشاہدات کو ریاضی کی کلیات میں مربوط کر سکے۔

دوسری طرف کیپلر کا معاملہ تھا کہ وہ فلکیاتی مشاہدہ میں کوئی مہارت نہیں رکھتا تھا۔ وہ بہت کم مشاہدہ کرتا تھا۔ اس کے زمانہ میں اگر چہ دوربین دریافت ہو چکی تھی، مگر عملاً وہ دوربین سے کام نہ لے سکا تھا۔ اس کی خصوصیت صرف یہ تھی کہ وہ ریاضیات کا ماہر تھا اور حسابی طور پر اس نے فلکیات کے بارے میں بہت سے قیمتی نظریات وضع کیے تھے۔

یہاں ٹائیکو براہے کی فراخ دلی نے کام کیا۔ ٹائیکو براہے اور کیپلر میں اگر چہ ذاتی اختلافات تھے۔ حتی کہ کیپلر نے اپنے ایک خط میں ٹائیکو براہے پر منافقت کا الزام لگایا تھا اور اس کو بہت برا بھلا کہا تھا، مگر ٹائیکو براہے، اپنی تیز مزاجی کے باوجود، کیپلر پر غصہ نہیں ہوا۔ آخر وقت میں اس نے سوچا کہ میرے علمی ذخیرہ کا سب سے بہتر وارث کیپلر ہی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے کیپلر کی گستاخیوں کو بھلاتے ہوئے اس کو اپنے پاس بلایا اور 1601 میں اپنی موت سے پہلے اپنا پورا تحریری ذخیرہ بلا معاوضہ کیپلر کے حوالہ کر دیا۔

جب ٹائیکو براہے کے مشاہدات کا سارا سرمایہ کیپلر کے پاس آ گیا تو کیپلر کی کمی کی تلافی ہو گئی۔ اب اس نے اپنے دماغ کی تمام ریاضیاتی قوت کو ان مشاہدات کے ساتھ مربوط

کرنے میں لگا دیا۔ اس کا نتیجہ ان تین سائنسی کلیات کی صورت میں نکلا جو کپلر کے سہ گانہ قوانین حرکت کے نام سے مشہور ہیں:

Kepler`s laws of planetary motion

ان قوانین کو استعمال کرتے ہوئے بعد کو سر آئزک نیوٹن (1643-1727) نے قوت کشش (gravitational force) کے بارے میں اپنی دریافت مکمل کی۔ یہی موجودہ دنیا میں کسی بڑی کامیابی کا راز ہے۔ ہر آدمی کی اپنی محدودیت ہوتی ہے۔ اس بنا پر کوئی بھی شخص تنہا کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا۔ کوئی کام اس وقت انجام پاتا ہے جب کہ کئی لوگ اپنی صلاحیتوں اور اپنی کوششوں کو ایک رخ پر لگانے کے لیے راضی ہوجائیں۔ متحدہ کوشش کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے واقعہ کو ظہور میں لانا ممکن نہیں۔

مگر متحدہ کوشش کی ایک قیمت ہے۔ اور وہ قیمت ہے — اختلاف کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کی بات پر ایک دوسرے سے جڑنا۔ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ متحد ہوجانا۔ انسان کے اندر اختلاف کا پایا جانا لازمی ہے۔ اس دنیا میں اخلاص کے باوجود لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ اختلاف سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں عملی بات صرف یہ ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا حوصلہ پیدا کریں۔ اجتماعی مفاد کے لیے انفرادی پہلوؤں کو بھلا دیں۔ بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کردیں۔ مقصد کے تقاضے کے لیے اپنی ذات کے تقاضوں کو دفن کردیں۔

اسی کا نام بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی ہے۔ اور اس بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی کے بغیر اس دنیا میں کسی بڑے منصوبہ کو تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں۔

اختلاف کو بھلا دیا

گورباچوف (Mikhail Sergeyevich Gorbachev, 1931-2022) سوویت یونین کے آخری لیڈر تھے۔ وہ 1985 میں سوویت روس میں برسر اقتدار آئے۔ انھوں نے پارٹی میں اپنے موافق افراد لانے کے لیے اس کے ڈھانچے کو بدلنا شروع کیا۔ اس وقت بورس یلتسین (Boris Nikolayevich Yeltsin, 1931-2007) پولِٹ بیورو کے ممبر تھے۔ گورباچوف ان کی غیر معمولی شخصیت سے خائف تھے۔ اس لیے وہ یلتسین کو پولٹ بیورو میں شامل کرنے کے مخالف تھے۔ یہ اختلاف بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ 1987 میں یلتسین نے پارٹی کے تمام اعلیٰ عہدوں سے استعفا دے دیا۔ 1989 میں یلتسین جمہوریہ روس کی صدارت کے لیے کھڑے ہوئے تو گورباچوف نے ان کی مخالفت کی۔ اور ان کے مقابلے میں دوسرا امیدوار کھڑا کیا۔ تاہم اس مخالفت کے باوجود یلتسین کامیاب ہوئے اور جمہوریہ روس کے صدر بن گئے (ہندوستان ٹائمس 26 اگست 1991)۔

روسی کمیونسٹ پارٹی کے انتہا پسند گروہ نے 19 اگست 1991 کو گورباچوف کے خلاف بغاوت کی اور ان کو ہٹا کر کریملن کی حکومت پر قابض ہوگئے۔ اس کا حوصلہ بھی ان کو اسی اختلاف سے ملا۔ وہ سمجھتے تھے کہ یلتسین اور گورباچوف کے اختلاف سے فائدہ اٹھا کر وہ گورباچوف کا خاتمہ کرسکتے ہیں۔ مگر عملاً اس کے برعکس صورتِ حال پیش آئی۔ بغاوت کے بعد یلتسین نے اپنے تمام اختلافات کو بھلا دیا۔ انھوں نے اپنی پوری طاقت اور اپنی ساری ذہانت گورباچوف کی حمایت پر لگادی۔ اپنی ذات کو خطرے میں ڈال کر انھوں نے باغی حکمرانوں کے خلاف عوام کو منظم کیا۔ بغاوت کے اگلے ہی دن اس کے خلاف ماسکو میں اتنا بڑا عوامی مظاہرہ کرایا کہ باغیوں کو حکومت چھوڑ دینا پڑا۔ 21 اگست 1991 کو گورباچوف

کریمیا سے واپس آ گئے اور دوبارہ حکومت کا عہدہ سنبھال لیا۔ عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ گوربا چوف کا زندہ بچ جانا اور دوبارہ صدر کے عہدہ پر واپس آجانا یلتسین کا کارنامہ ہے۔

بلند فطرت آدمی کی سب سے بڑی پہچان یہی ہے۔ مشکل وقت میں وہ شکایت اور اختلاف کو بھلا کر انسان کا ساتھ دیتا ہے۔ جبکہ پست فطرت آدمی کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔

حل رخی پالیسی

موجودہ سال کا غالباً سب سے زیادہ اہم واقعہ سوویت روس اور امریکا کی وہ مفاہمت ہے جس کو ٹائم (30 مئی 1988) نے بجا طور پر عظیم اتحاد (grand compromise) کا نام دیا ہے۔ سوویت روس اور امریکا دونوں دنیا کی سب سے بڑی طاقت (superpowers) شمار ہوتے ہیں۔ پچھلے 70 سال سے دونوں کے درمیان سخت رقابت جاری تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف ٹکراؤ کی پالیسی پر قائم تھے۔ دونوں ملکوں کے پریس اور میڈیا کا کام یہ تھا کہ ایک دوسرے پر الزام لگائیں اور ایک دوسرے کی مذمت کرتے رہیں۔ مگر لمبے تجربہ کے بعد، اب دونوں ٹکراؤ کے بجائے صلح کی باتیں کر رہے ہیں۔ وہ ہتھیاروں کی دوڑ کے بجائے بات چیت کی دوڑ پر اپنی توجہ لگائے ہوئے ہیں۔ وہ رقابت کے طریقہ کو چھوڑ کر مفاہمت کے طریقہ کو اپنا رہے ہیں۔

سوویت روس کے ایک ذمہ دار نے اس نئی پالیسی کو حل رُخی (solution-oriented) پالیسی کا نام دیا ہے۔ اس سے پہلے دونوں کی تمام توجہ اگر اس پر جمی ہوئی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو غلط ثابت کریں تو اب انہوں نے اس قسم کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی

تمام توجہ اس پر لگا دی ہے کہ مسئلہ کا حل کیا ہے۔ یہ واقعہ جو سوویت روس اور امریکا کے درمیان پیش آیا ہے، اس میں دوسری قوموں کے لیے بہت بڑا اسبق ہے۔ موجودہ زمانہ میں اختلاف اور ٹکراؤ کی پالیسی اتنا مہنگا سودا بن چکی ہے کہ بڑی طاقت بھی اس کا تحمل نہ کرسکیں۔ پھر چھوٹی قومیں کیوں کر اس تباہ کن مشغلہ کا تحمل کرسکتی ہیں۔

ایک تقابل

طرابلس (لیبیا) میں 24-28 ستمبر 1990ء کو ایک انٹرنیشنل اسلامی کانفرنس ہوئی۔ اس کانفرنس کی دعوت کے مطابق ایک سفر ہوا۔ وہاں ایک مجلس میں میں نے کہا کہ اختلاف موجودہ دنیا کا ایک ناگزیر ظاہرہ ہے۔ وہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہمارا اصل کام حالتِ اختلاف کو ختم کرنا نہیں ہے، کیوں کہ وہ ممکن نہیں۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں کے اندر یہ مزاج بنائیں کہ وہ اختلاف کو پرامن دائرہ میں حل کرنے کی کوشش کریں۔ موجودہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ انہوں نے برداشت کو کھو دیا ہے۔ اختلاف پیدا ہوتے ہی فوراً وہ جارحیت پر اتر آتے ہیں۔

میں نے کہا کہ روس اور امریکا کے درمیان اختلاف تھا۔ دونوں کے پاس انتہائی طاقتور ہتھیار موجود تھے۔ مگر اس کے باوجود وہ سختی کے ساتھ اس پر قائم ہیں کہ ہر اختلاف کو میز پر طے کرنے کی کوشش کریں۔ خلیج میں عراق اور کویت کے درمیان اختلاف تھا۔ عراق کے پاس اتفاق سے کچھ طاقت آ گئی۔ اس نے فوراً کویت کے خلاف فوجی اقدام کر دیا۔ دوسری طرف اسی معاملہ میں امریکا کو عراق سے شدید ترین اختلاف ہے۔ وہ اپنی فوجیں لیے ہوئے خلیج میں کھڑا ہوا ہے۔ مگر کئی مہینے گزر جانے کے باوجود ابھی تک اس نے عراق پر فوجی حملہ نہیں کیا۔ مسلمانوں کے اسی مزاج نے انہیں موجودہ دنیا میں برباد کر رکھا ہے۔

عربوں کا مزاج

1984 کے مدینہ کے سفر میں ایک عرب عالم نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب الاسلام یتحدی پڑھی، الدین فی مواجہۃ العلم پڑھی، اور الاسلام والعصر الحدیث پڑھی یہ سب کتابیں مجھے پسند آئیں۔ ان کتابوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر رحمت کا دروازہ کھولا ہے۔ مگر اس کے بعد میں نے آپ کی کتاب "حکمۃ الدین" پڑھی تو وہ پسند نہیں آئی۔ اس میں آپ نے الاخوان المسلمین کی سیاست پر تنقید کی ہے۔ یہ زمانہ ایسا ہے کہ دشمنان اسلام ہمارے اختلاف سے فائدہ اٹھانے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ہم کو صرف وہی باتیں کرنی چاہئیں جس سے اتفاق پیدا ہو۔

اس قسم کی باتیں اور بھی کئی بار سننے کو ملی ہیں۔ مگر میں سوچتا ہوں کہ یہ کیسا عجیب مطالبہ ہے۔ جن جماعتوں پر میں نے تنقید کی ہے، وہ موجودہ زمانہ میں باہمی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ انہوں نے مسلم ملکوں میں مسلمانوں کو حکمراں اور غیر حکمراں کے دو طبقوں میں بانٹ رکھا ہے اور دونوں کے درمیان زبردست ٹکراؤ جاری کر دیا ہے۔ میں تو زیادہ سے زیادہ صرف علمی تنقید کرتا ہوں۔ جب کہ دوسرے لوگوں کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اختلاف سے گزر کر مسلمانوں کو باہمی تصادم میں ڈال دیا ہے۔ پھر بھی اختلاف پیدا کرنے کا الزام میرے اوپر ہے۔

تاہم عربوں کا مزاج یہ ہے کہ وہ اختلاف کے باوجود کسی آدمی سے محبت کر سکتے ہیں۔ عرب نوجوانوں کی بڑی تعداد اخوانی تحریک سے متاثر ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میں اخوانی تحریک کا ناقد ہوں۔ اس کے باوجود الاسلام یتحدی کی بنیاد پر وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ محمد ضیاء الدین ملا جفجی (حلب، شام) اخوانی نوجوان ہیں اور اخوانیوں کے بارے میں میرے خیالات کو جانتے ہیں۔ مگر وہ نہایت احترام اور محبت کے ساتھ مجھ سے ملتے رہے۔ وہ

دوسری بار آئے تو بتایا کہ میں نے شام میں اپنے والد سے ٹیلیفون پر بات کی۔ انہوں نے کہا کہ اس وقت میں خود نہیں آسکتا۔ تم شیخ وحید الدین کو میرا سلام کہو اور میری طرف سے ان کے ہاتھ کا بوسہ دو (قَبِّلْ يَدَهُ بِالنِّيَابَةِ عَنِّي)۔

اس سفر (1984) میں ایک ہندستانی طالب علم سے میں نے عربوں کے بارے میں ان کے تجربات پوچھے۔ انہوں نے کہا کہ میں نے عربوں میں ایک خاص بات یہ دیکھی کہ ان کے اندر توسع کا مزاج ہوتا ہے جو ہندوستان اور پاکستان جیسے علاقوں میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ ہم لوگ کسی محفل میں ایک تقریر کرتے ہیں یا کسی موقع پر ایک سوال کا معمولی جواب دیتے ہیں تو ہمارے اساتذہ فراخ دلی کے ساتھ احسنت احسنت کہتے ہیں۔ ان کا مزاج ہوتا ہے کہ جو خوبی ہے اس کا بھرپور اعتراف کیا جائے اور جو کمی ہے اس کو نظر انداز کیا جائے۔

انگلینڈ، آئرلینڈ

1992 کے سفر میں میرا قیام وگن (Wigan) میں ایک تعلیم یافتہ عرب نوجوان طارق حسین الکردی کے مکان پر تھا۔ انھوں نے آئرلینڈ کی شہریت لی ہے مگر آج کل وہ انگلینڈ میں رہ رہے ہیں۔ آئرلینڈ میں زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں اور انگلینڈ میں زیادہ تر کیتھولک، دونوں میں سخت نفرت ہے۔ میں نے طارق حسین الکردی سے پوچھا کہ آپ کی شہریت آئرش ہے، پھر آپ انگلینڈ میں کس طرح رہتے ہیں اور یہاں کے قانون کے مطابق آپ کو یہاں کی تمام سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ انہوں نے کہا کہ یہ صحیح ہے کہ دونوں کے درمیان نفرت پائی جاتی ہے۔ مگر دونوں ملکوں کے درمیان ایگریمنٹ ہے کہ ایک جگہ کے شہری کو دوسری جگہ وہی سہولتیں حاصل رہیں جو اس کو اپنے ملک میں حاصل ہیں۔

انگلینڈ اور آئرلینڈ میں جو اختلافات ہیں وہ تقریباً اسی قسم کے ہیں جو ہندوستان اور پاکستان میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً آئرلینڈ والوں کو شکایت ہے کہ انگلینڈ والے عظیم تر انگلینڈ بنانا چاہتے ہیں اور اس میں آئرلینڈ کو ضم کر لینے کا منصوبہ بنائے ہوئے ہیں، وغیرہ۔ مگر اس قسم کے اختلافات کے باوجود یہاں دونوں ملکوں میں جو مفاہمت ہے وہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ناقابل تصور ہے۔ مغربی دنیا کا مزاج اس انگریزی مثل سے معلوم ہوتا ہے کہ آؤ، ہم اس پر اتفاق کرلیں کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے:

Let us agree to disagree.

اختلاف کے باوجود قدردانی

1987 میں میں نے میوات کا سفر کیا۔ اس سفر کی ایک یادگار شخصیت گلپاڑہ کے حاجی دراب خاں (عمر 80 سال) کی تھی۔ وہ بالکل ان پڑھ ہیں۔ اپنا نام بھی نہیں لکھ سکتے۔ مگر ان کے اندر ایک ایسی خصوصیت ہے جو اپنی معلومات کے مطابق اب تک میں نے کسی عالم کے اندر بھی نہیں پائی، وہ ہے — اختلاف کے باوجود قدردانی۔

مولانا عبدالرحیم صاحب (بڈیڈ، ضلع گڑگاؤں) اس سے پہلے گلپاڑہ کے مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ یہاں ساڑھے تین سال تک امام اور مدرس کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1969ء میں وہ یہاں سے چھوڑ کر چلے گئے۔ دیہات کے لوگوں کو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں میں اماموں اور مدّرسوں سے شکایت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ گلپاڑہ کے لوگوں کو بھی ہوئی۔ انہیں میں سے ایک حاجی دراب خان بھی تھے۔ ان کے الفاظ میں ان کی ”اس مولوی سے لڑائی رہنے لگی“۔

یہ لڑائی کس بات پر ہوتی تھی ۔ معمولی معمولی باتوں پر۔ مثلاً حاجی دراب خاں نے اپنا ایک درخت کٹوایا اور اس کی لکڑی مسجد کے صحن میں رکھوادی۔ اس کی وجہ سے مسجد کا صحن تنگ ہو گیا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس لکڑی کو یہاں سے ہٹاؤ۔ مگر حاجی دراب خاں نے نہیں ہٹوایا۔ آخر مولانا عبدالرحیم صاحب نے ایک روز اپنے مدرسہ کے لڑکوں کے ذریعہ تمام لکڑی کو وہاں سے نکلوا کر باہر رکھوا دیا۔ اس پر حاجی دراب خان کافی غصہ ہوئے، وغیرہ۔

یہ مسجد حاجی دراب خاں کے خاندان نے بنوائی تھی ۔ مدرسہ بھی ان ہی لوگوں نے قائم کیا تھا۔ مولانا عبدالرحیم صاحب وہاں گویا ان کے ایک "ملازم" تھے۔ ایسی حالت میں ان کی یہ جسارت بالکل ناقابل برداشت تھی۔ اس قسم کی اور بہت سی باتیں تھیں جن کی وجہ سے حاجی دراب کی "اس مولوی سے لڑائی رہتی تھی"، مگر مولانا عبدالرحیم نے بتایا کہ اس کے باوجود کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حاجی دراب ان کے بارے میں مخالفانہ رول ادا کریں۔

مولانا عبدالرحیم ایک بااصول آدمی ہیں اور اسی کے ساتھ صاف گو ہیں ۔ چنانچہ گاؤں کے لوگوں سے کسی نہ کسی بات پر ان کی تکرار ہو جاتی تھی ۔ مثلاً وہ یہاں مسجد کے امام بھی تھے۔ مقرر وقت پر وہ ٹھیک گھڑی کے لحاظ سے جماعت شروع کر دیتے تھے، خواہ کوئی آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بعض لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار ہوتی تھی۔ اس طرح کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ کئی لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ حتی کہ انھوں نے گاؤں کی اکثریت کو اپنے موافق بنالیا اور عام رائے یہ ہوگئی کہ ان کو مدرسہ سے نکال دیا جائے اور ان کی جگہ دوسرے آدمی کو لایا جائے۔

مگر حاجی دراب اس تحریک کے سخت مخالف ہو گئے ۔ انھوں نے کہا کہ اگر چہ اس مولوی سے میری ذاتی لڑائی ہے ۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مدرسہ کے کام کے لیے وہ نہایت موزوں ہے، اس کو ہٹانے کے بعد ایسا لائق معلم ہم کو نہیں مل سکتا، اس لیے انھوں

نے اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے مولوی عبد الرحیم صاحب کی بھر پور حمایت کی۔ ذاتی شکایت کے باوجود اعتراف اور قدر دانی کی یہ صفت اتنی کم یاب ہے کہ کم از کم میں نے اپنے تجربہ میں اب تک کوئی دوسرا حاجی دراب نہیں دیکھا۔

تم قیمتی آدمی ہو

1988 کے سفر امریکا کا واقعہ ہے۔ صغیر احمد اسلم صاحب نے بتایا کہ 1969ء میں وہ لاس اینجلس کی ایک بڑی فرم میں 35 اسٹور کے منیجر تھے۔ ان کو اپنے امریکی افسر کے ساتھ سفر کرنا پڑتا تھا۔ یہ جنرل منیجر تقریباً 35 سال کا تھا۔ اور ہوٹل کے زمانہ قیام میں شراب اور عیاشی کے کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ صغیر اسلم صاحب ایک بااصول آدمی تھے۔ ان کو اس قسم کی باتیں پسند نہ تھیں۔ آخر ایک سفر میں وہ جنرل منیجر کے کمرہ میں گئے اور دروازہ بند کر کے اس سے نہایت سخت گفتگو کی — تم عیاش ہو، تم بالکل نکمے ہو، تم بزنس کرنا نہیں جانتے، وغیرہ۔

صغیر اسلم صاحب جنرل منیجر کو بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے بعد جب باہر جانے لگے تو جنرل منیجر نے ان کو پکڑ کر واپس بلایا اور کہا کہ تم جانتے ہو کہ میں کون ہوں۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ ہاں، تم اس کمپنی کے مالک ہو۔ اس نے کہا کہ پھر تمہارے اندر یہ جرأت (courage) کہاں سے آئی کہ تم مجھ کو اس طرح خطاب کرو۔ صغیر اسلم صاحب نے کہا کہ تم یہی تو کر سکتے ہو کہ مجھ کو فائر (برخاست) کر دو، تو میں اس سے پہلے کمپنی سے اپنا استعفا تیار کر چکا ہوں۔ اس نے کہا کہ فائر کرنا تو درکنار، میں تم کو چھوڑوں گا بھی نہیں، تم ہماری کمپنی کے لیے بہت قیمتی ہو۔

اس شخص کا نام جب اسٹوارٹ میگروڈر (Jeb Stuart Magruder) تھا۔ میں

نے صغیر اسلم صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس کے ساتھ اتنی سخت گفتگو کی، پھر بھی وہ آپ کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوا۔ اس کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ جانتا تھا کہ میں کمپنی کے لیے ایک مفید شخص ہوں۔ اپنے ذاتی جذبات پر اس نے کمپنی کے مفاد کو غالب رکھا۔

مذکورہ امریکی نے ذاتی رنجش کے باوجود صغیر اسلم صاحب کی قدردانی کی۔ یہ اعتراف اور یہ بلند حوصلگی جو امریکہ کے ایک شرابی میں پائی جاتی ہے، وہ آج ہماری بڑی بڑی دینی شخصیتوں میں بھی موجود نہیں۔ ذاتی رنجش کے بعد کسی کی صلاحیت کا اعتراف بلاشبہ اعلیٰ ترین اخلاقی قدر ہے، مگر ہمارے تمام اکابر اس اخلاقی قدر سے مکمل طور پر خالی ہیں۔

استاد، شاگرد

ہندستانی صحافی اور مصنف مسٹر پربھاش جوشی (وفات 2009) اندور کے سفر (مئی 1993) میں میرے ساتھ تھے۔ دوران سفر انھوں نے کئی سبق آموز واقعات بیان کیے۔ ایک واقعہ یہ تھا کہ سمپورنانند جی (وفات 1969) اچاریہ نریندر دیو (وفات 1956) کے شاگرد تھے۔ 1955ء میں سمپورنانند یوپی کے چیف منسٹر تھے۔ اس وقت سمپورنانند کا تعلق کانگرس سے تھا اور اچاریہ نریندر دیو کا پرجا سوشلسٹ پارٹی سے جو کانگرس کے خلاف اپوزیشن کا پارٹ ادا کررہی تھی۔ لکھنؤ میں پرجا سوشلسٹ پارٹی کا سالانہ اجلاس ہورہا تھا۔ اس کا پولیٹیکل رزولیوشن اگلے دن پیش ہونے والا تھا۔ اور اس کا ڈرافٹ اچاریہ نریندر دیو کو تیار کرنا تھا۔

عین اس وقت اچاریہ نریندر دیو بیمار پڑ گئے۔ سمپورنانند رات کے وقت اپنے گرو کو دیکھنے کے لیے آئے۔ اچاریہ نریندر دیو نے ان سے کہا کہ دیکھو، کل مجھے اپنی پارٹی کے اجلاس میں پولیٹیکل رزولیوشن پیش کرنا ہے مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں اس کو لکھ نہیں

سکا۔ تم اس رزولیوشن کا ڈرافٹ تیار کردو۔ سمپورنانند نے تعجب کے ساتھ کہا کہ میں اور آپ کا پولیٹکل رزولیوشن۔ کیوں کہ یہ رزولیوشن اسی کانگریسی حکومت کے خلاف لکھنا تھا جس کے سمپورنانند چیف منسٹر تھے۔ اچاریہ نریندر دیو نے کہا کہ ہاں، تم ہی اسے لکھو۔ سمپورنانند نے کہا کہ جب آپ کہہ رہے ہیں تو بہر حال مجھے اس کو لکھنا ہوگا۔

سمپورنانند اپنی سرکاری رہائش گاہ میں واپس آئے اور رات بھر جاگ کر پرجا سوشلسٹ پارٹی کا پولیٹکل رزولیوشن تیار کیا۔ اگلی صبح کو انھوں نے یہ ڈرافٹ اچاریہ نریندر دیو کے پاس بھیج دیا۔

اگلی رات کو سمپورنانند دوبارہ اپنے استاد کی عیادت کے لیے گئے۔ بات چیت کے دوران انھوں نے اچاریہ نریندر دیو سے پوچھا کہ اس رزولیوشن کا کیا ہوا۔ اچاریہ جی نے کہا کہ وہ پارٹی کے اجلاس میں پیش ہو کر پاس بھی ہو گیا۔ سمپورنانند نے کہا کہ آپ نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اچاریہ نریندر دیو نے کہا کہ جس چیز کو تم نے لکھا ہو اس کو مجھے دیکھنے کی کیا ضرورت۔ میں نے تو اسے پڑھے بغیر ہی فوراً آگے بڑھا دیا تھا۔ یہ رزولیوشن اگرچہ خود سمپورنانند سرکار کے خلاف تھا مگر اس کا ڈرافٹ اتنے اچھے انداز میں تیار کیا گیا تھا کہ پرجا سوشلسٹ پارٹی کے لوگوں کو شبہ تک نہیں ہوا کہ اس کو اچاریہ نریندر دیو کے سوا کسی اور نے لکھا ہوگا۔

اسکائی از دی لمٹ

مسٹر پربھاش جوشی نے اندور کے سفر (مئی 1993ء) میں ایک واقعہ 1976ء کا بتایا۔ یہ ایمرجنسی کا زمانہ تھا۔ رام ناتھ گوئنکا کا اخبار انڈین ایکسپریس ہمیشہ ایمرجنسی کے خلاف لکھا کرتا تھا۔ چنانچہ کانگرس گورنمنٹ اس کی سخت مخالف ہوگئی۔ ان کا اکاؤنٹ منجمد کر

دیا گیا۔ سنجے گاندھی نے تمام بینکوں کو ٹیلیفون کر دیا کہ کوئی بھی گوینکا کو پیسہ نہ دے۔ چنانچہ ایسا وقت آ گیا کہ 5-10 ہزار روپیہ کی رقم بھی گوینکا کے لیے مشکل ہو گئی۔ اسی زمانہ میں انڈین ایکسپریس کے ایڈیٹر مسٹر ملگاؤ کر کا چک بینک سے یہ لکھ کر واپس آ گیا کہ کھاتہ میں رقم موجود نہیں۔

گھنشیام داس برلا اس وقت ملک کے نمبر ایک صنعت کار تھے۔ برلا کا تعلق کانگرس سے تھا اور گوینکا کا تعلق اپوزیشن سے۔ مگر جب برلا کو معلوم ہوا تو وہ فوراً ان کی مدد کے لیے تیار ہو گئے۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ اگر وہ خود گوینکا سے ملنے کے لیے جائیں تو یہ خبر مشہور ہو گی اور اگر گوینکا کو اپنے یہاں بلائیں تب بھی لوگ اس کو جان لیں گے۔ اور پھر ان کے لیے گوینکا کی مدد کرنا مشکل ہو جائے گا۔ چنانچہ برلا نے اپنا ایک آدمی رات کے وقت گوینکا کے پاس بھیجا۔ برلا نے اس سے کہا کہ گوینکا کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ وہ اپنے اصول سے نہ ہٹیں، وہ اس پر پوری طرح جمے رہیں۔ جہاں تک پیسہ کا سوال ہے تو میں اس کا انتظام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ گوینکا نے آدمی سے کہا کہ تم واپس جاؤ اور جا کر برلا جی سے کہو کہ میری ضرورت تو بہت زیادہ ہے۔ آپ کتنی رقم کی حد تک میری مدد کر سکتے ہیں۔ برلا نے کہا کہ جا کر میری طرف سے گوینکا جی کو کہہ دو کہ:

Sky is the Limit.

وہ دونوں ایک دوسرے کے حریف تھے۔ کیوں کہ برلا کانگرس میں تھے اور گوینکا کانگرس مخالف گروپ سے تعلق رکھتے تھے۔ گوینکا نے برلا سے کوئی رقم تو نہیں لی مگر اس کے بعد وہ برلا کے بہت معتقد ہو گئے۔ ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد گوینکا کا دور دورہ ہو گیا۔ اس کے بعد برلا کی سالگرہ آئی تو انھوں نے خصوصی اہتمام کے ساتھ ایک ہزار سرخ گلاب کا پھول برلا کی خدمت میں پیش کیا۔

چلو یہ بھی ٹھیک ہے

صغیر اسلم صاحب کا تعلق پاکستان سے ہے، اور امریکا میں بزنس کرتے ہیں۔ وہ بہت خوبیوں کے آدمی ہیں۔ ان کا ایک اصول مجھے بہت پسند آیا۔ اس کو میں اپنے لفظوں میں ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے“ اصول کہتا ہوں۔ جب بھی کسی سے کوئی اختلافی بات پیدا ہو تو فوراً وہ یہ کہہ کر بات کو وہیں ختم کر دیتے ہیں کہ ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔“ یہ اصول وہی ہے جس کو اعراض کہا جاتا ہے۔

وسعت ظرفی

مسٹر مہاویر تیاگی (وفات 1980) نے ایک کتاب لکھی اس کا نام ہے ”اب میری کون سنے گا“ آزادی کے بعد مہاتما گاندھی نے یہ جملہ کہا تھا۔ اسی کو مہاویر تیاگی نے اپنی کتاب کا عنوان بنا دیا۔ مہاویر تیاگی نے اس میں اپنا ایک قصہ لکھا ہے۔ مولانا محمد علی نے ایک بار کہا تھا کہ ایک گنہ گار مسلمان بھی میرے نزدیک مہاتما گاندھی سے بہتر ہے۔ مہاویر تیاگی کو محمد علی کا یہ جملہ بہت ناپسند ہوا۔ انھوں نے کانگرس کی ایک میٹنگ میں اس کے خلاف اپنا رزولیوشن رکھا۔ اس میٹنگ کے چیئرمین اتفاق سے خود محمد علی تھے۔ گاندھی جی نے کہا کہ اس رزولیوشن کو پیش ہونے سے روک دیا جائے۔ محمد علی نے بحیثیت چیئرمین کہا کہ میں کسی کے کہنے سے اس کو روک نہیں سکتا۔ البتہ خود مہاویر تیاگی چاہیں تو اس کو واپس لے سکتے ہیں۔ گاندھی جی نے مہاویر تیاگی کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنا رزولیوشن واپس لینے پر راضی نہیں ہوئے۔

اس کے بعد گاندھی جی مہاویر تیاگی کو تھوڑی دیر کے لیے الگ لے گئے۔ انھوں نے مہاویر تیاگی سے کہا کہ اختلافی معاملہ میں بدھیوان کی بات مانی جاتی ہے یا بیوقوف کی۔ مہاویر تیاگی نے کہا کہ بدھیوان کی۔ گاندھی نے کہا کہ پھر یہ بتاؤ کہ تم زیادہ بدھیوان ہو یا میں۔ مہاویر تیاگی نے کہا کہ آپ مجھ سے زیادہ بدھیوان ہیں۔ گاندھی جی نے کہا کہ پھر میں کہتا ہوں کہ اس رزولیوشن کو واپس لے لو۔ اس لیے کہ محمد علی ہمارے دوست ہیں۔ اور دوست کی بری بات کا بھی سہن کرنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد مہاویر تیاگی نے اپنا رزولیوشن واپس لے لیا۔

مغربی دنیا، مسلم ادارے

11 جون 1990ء کو نئی دہلی کے روسی سفارت خانہ سے ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ مجھ کو دس روزہ پروگرام کے تحت سوویت روس بھیجنا چاہتے ہیں تاکہ میں وہاں اسلام اور مسلمانوں کے حالات کو براہ راست دیکھوں، نیز یہ کہ 28 جولائی کے لیے انہوں نے میری سیٹ ریزرو کرادی ہے۔ پچھلے 35 سال کے اندر اس موضوع پر میں کم از کم ایک سو مضامین اور کتابیں اردو، عربی اور انگریزی میں شائع کر چکا ہوں۔ ان تمام مضامین اور کتابوں میں ہمیشہ میں نے کمیونزم اور سوشلزم کی مخالفت کی ہے۔ ایک زمانہ میں بہت سے اسلام پسند سوشلزم کی طرف مائل ہو چکے تھے اور اس کو اسلامی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر میں ہمیشہ اس نظریہ کا مخالف رہا۔

سوویت روس کی موجودہ حکومت کا میرے جیسے ایک "مخالف" کو اپنے ملک میں بلانا کوئی سادہ واقعہ نہیں۔ یہ ایک نہایت اہم واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید

سیکولرزم کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو اس کو سارے عالم پر غالب کیے ہوئے ہے۔ وہ یہی فراخ دلی اور برداشت ہے۔ مغربی جمہوریت جس کو اب روس اختیار کر رہا ہے، وہ موافق اور مخالف کی اصطلاحوں سے اوپر اٹھ کر لوگوں سے معاملہ کرتی ہے۔ وہ اپنے ایک مخالف کی پذیرائی کے لیے بھی تیار رہتی ہے۔ اس کی اسی صفت نے اس کو یہ طاقت دی ہے کہ وہ ساری دنیا پر غلبہ حاصل کر سکے۔

موجودہ زمانہ کے اسلامی اداروں کا حال اس معاملہ میں بالکل برعکس ہے۔ ان کے یہاں صرف اپنے موافق کے لیے جگہ ہے۔ جس شخص کو وہ اپنا مخالف سمجھ لیں، اس کے سایہ سے بھی وہ نفرت کرنے لگتے ہیں۔ ایک شخص اگر کسی اسلامی ادارہ کے "اکابر" پر تنقید کر دے تو اس کی تنقید خواہ کتنی ہی علمی اور مدلل کیوں نہ ہو، اس کے بعد وہ شخص اس ادارہ کی نظر میں اتنا مبغوض ہو جائے گا کہ وہ معقول انداز میں اس کا نام بھی نہیں لے سکتے، کجا کہ اس کو اپنے ادارہ کے کسی پروگرام میں شرکت کے لیے بلائیں۔

موجودہ اسلامی اداروں کی یہی کمزوری ہے جس نے ان کو آج کی دنیا میں بالکل بے قیمت بنا دیا ہے۔ اس کا مزید نقصان یہ ہے کہ یہ ادارے سطحی انسانوں کی سرائے بن کر رہ گئے ہیں۔ کم از کم پچھلے پچاس سال کی بابت میں کہہ سکتا ہوں کہ اس مدت میں ان اداروں کے ذریعہ غالباً کوئی ایک بھی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا جس کی آج کی دنیا میں کوئی اہمیت ہو۔ زندہ اور اعلیٰ انسان وہاں پیدا ہوتے ہیں جہاں کھلی تنقید اور آزادانہ اختلاف رائے کا ماحول ہو۔ ان اداروں میں یہ ماحول سرے سے موجود ہی نہیں، پھر وہاں اعلیٰ درجہ کے انسان کیوں کر پیدا ہو سکتے ہیں۔

آج اسلام کی نئی تاریخ بنانے کے لیے مجتہدانہ صلاحیت رکھنے والے افراد درکار ہیں۔

مگر موجودہ اسلامی اداروں میں اکابر پرستی اور شخصی تقلید کا ماحول اتنی گہرائی کے ساتھ چھایا ہوا ہے کہ وہاں صرف تنگ نظر اور مقلد انسان ہی بن سکتے ہیں۔ ان اداروں سے مجتہدانہ اوصاف والی شخصیت کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ان اداروں سے کسی اعلیٰ انسان کا ابھرنا ویسا ہی ایک عجوبہ ہوگا جیسا کسی قبرستان سے ایک زندہ انسان کا نکل آنا۔

امریکا کی مثال

نومبر — دسمبر 1999 میں امریکا کے لیے میرا دسواں سفر ہوا۔ میں اپنے سفروں میں ہمیشہ وہاں کے حالات جاننے کی کوشش کرتا ہوں۔ موجودہ زمانہ میں امریکا کو مادی اعتبار سے سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے۔ اس کارازمیں نے یہ جانا کہ امریکا کے لوگ کٹر ذہن کے نہیں ہیں۔ وہ تجربہ سامنے آنے کے بعد فوراً اس کے مطابق اپنی اصلاح کر لیتے ہیں۔ انسان کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرق و اختلاف انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ اس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف نہ ہوں۔ بالفرض اگر ہم مذہبی فرق کو ختم کر دیں تب بھی ہزاروں معاملات ایسے باقی رہیں گے جن میں لوگوں کے درمیان فرق و اختلاف موجود ہوگا۔ ایسی حالت میں اصل ضرورت یہ ہے کہ مجموعی انسانی زندگی کے لیے اتحاد کا فارمولا دریافت کیا جائے، نہ کہ صرف مذہبی شعبہ کے لیے۔ اور یہ فارمولہ صرف ایک ہے — اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کی عزت کرنا اور باہم مل جل کر رہنا۔

تیسرا حصہ

مشاہداتِ دنیا

ستمبر 1989ء کو لیبیا کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ اس سفر میں میں نے لیبیا پہنچ کر اپنی گھڑی میں مقامی وقت کے مطابق تبدیلی نہیں کی تھی۔ جب مجھے وقت معلوم کرنا ہوتا تو میں ایسا کرتا کہ اپنی گھڑی میں ساڑھے تین گھنٹہ کا فرق کر لیتا تھا۔ اس طرح مجھے مقامی وقت کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ ہندوستان کے مقابلہ میں لیبیا کا وقت ساڑھے تین گھنٹہ پیچھے ہے۔ وقت کے آگے پیچھے ہونے کا مطلب کیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان نے اپنی سہولت کے لیے رات اور دن کی مدت کو 24 گھنٹے میں تقسیم کیا ہے۔ یہ مان لیا گیا ہے کہ ہر ملک میں دوپہر کا وقت 12 بجے کا ہوگا۔ اب چونکہ زمین کی محوری گردش کی بنا پر ''دوپہر'' کا لمحہ ہر ملک میں الگ الگ وقت پر آتا ہے، ہر ملک کا وقت الگ الگ ہو گیا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں جس وقت دوپہر ہوگا، اس وقت لیبیا میں ابھی دوپہر کا وقت آنے میں تقریباً ساڑھے تین گھنٹہ باقی ہوں گے۔ ہر ملک دوپہر کے وقت کو 12 بجے کا وقت مان کر اپنی گھڑی کا آغاز کرتا ہے، اس لیے ہر ملک کا وقت نسبتی طور پر الگ الگ ہوجاتا ہے۔

وقت کا یہ فرق قدرت کا ایک سبق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ''فرق'' اس دنیا کی لازمی حقیقت ہے۔ اس دنیا میں ہمیں فرق کے باوجود مل کر رہنا ہے۔ یہاں اختلاف کے باوجود اتحاد قائم کرنا ہے۔

☆☆☆☆☆

7 دسمبر 1993 کی صبح کورشی کیش میں فجر کی نماز اول وقت پڑھی۔ اس کے بعد سوامی چیدانند سے رخصتی ملاقات کرنے کے لیے ان کے دفتر میں گیا۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کانفرنس کے بہت سے مرد اور عورت وہاں چلے آرہے ہیں۔ سوامی جی نے بتایا کہ ان لوگوں

کو معلوم ہوا کہ آج آپ جا رہے ہیں تو وہ آپ سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ یہ زیادہ تر یورپ کے ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں تقریباً 10 منٹ تک ان کے سامنے خطاب کیا۔

میں نے کہا کہ آپ لوگ یہاں روحانی اتحاد کے عنوان پر جمع ہوئے ہیں۔ اس نسبت سے چند باتیں میں قرآن کے حوالے سے کہوں گا۔ قرآن میں یہ تصور دیا گیا ہے کہ تمام انسان ایک ہی صحیح فطرت پر پیدا کیے جاتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف، جھگڑے، غلط فہمیاں یہ سب چیزیں انسانی شخصیت کا اصل حصہ نہیں ہیں، یہ سب اوپری چیزیں ہیں۔ جہالت، حرص، تعصب، کینہ وغیرہ ان کے اسباب ہیں۔ یہ سب چیزیں وقتی طور پر آدمی کی فطرت کو ڈھک لیتی ہیں۔ اگر ان کو ہٹا دیا جائے تو اندر کی یکساں فطرت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ روحانی اتحاد تو اپنے آپ سارے انسانوں کے درمیان موجود ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ اوپر کے پردوں کو ہٹا دیا جائے۔ پردہ ہٹنے کے بعد جو چیز حاصل ہوگی وہ وہی ہوگا جس کو ہم روحانی اتحاد کہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سینیگال کے سفر (1990) میں ایک بار ہوٹل کے لاؤنج میں آیا تو یہ دیکھا کہ کچھ افریقی مقامی زبان میں بات کر رہے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بعد ہوٹل کے باہر نکلا تو جھاڑی میں ایک بلی تھی۔ اس نے "میاؤں میاؤں" کی آواز نکالی۔ اچانک خیال آیا کہ جانور تمام دنیا میں ایک ہی انداز پر بولتے ہیں۔ کوئی جانور جس طرح ہندوستان میں بولتا ہے، ٹھیک اسی طرح وہ یورپ اور افریقہ میں بھی بولتا ہے۔ مگر انسان کی بولیاں الگ الگ ہیں۔ حتی کہ دنیا بھر میں ان کی کئی ہزار بولیاں ہوگئی ہیں۔

پھر خیال آیا کہ یہ انسان کے حالتِ امتحان میں ہونے کا ایک پہلو ہے۔ جانوروں کا کوئی امتحان نہیں۔ اس بنا پر ان کی ہر نوع کے لیے ایک ہی بولی مقرر کر دی گئی۔ مگر انسان اس امتحانی میزان پر کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ خود اپنے ارادے سے متحد ہو۔ وہ اختلاف کے باوجود اتحاد کا ثبوت دے۔ جانوروں سے امتحان مطلوب نہ تھا، اس لیے انھیں ازاول تا آخر حالتِ اتحاد میں رکھا گیا۔ اس کے برعکس انسان سے امتحان مطلوب تھا۔ اس لیے انھیں حالت اختلاف میں ڈال دیا گیا اور پھر کہا گیا کہ تم اپنے اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اتحاد کا ثبوت دو۔

☆☆☆☆☆

4 مئی 1990ء کی سہ پہر کو جنیوا سے دکار کے لیے روانگی ہوئی۔ میری سیٹ کھڑکی سے ملی ہوئی تھی۔ باہر کی طرف دیکھا تو جہاز کا "پر" لمبا پھیلا ہوا تھا۔ پر (wing) کے اوپر انگریزی میں یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے کہ اس کے آگے نہ چلیں:

Do not walk outside this area.

ہوائی جہاز جب ایئر پورٹ پر کھڑا ہوتا ہے تو کارکن حضرات اس کو چیک کرتے ہیں۔ اس وقت کوئی شخص چلتا ہوا پر کے اوپر پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے اس کو پر کے اوپر چلنے سے منع کر دیا گیا۔ کیونکہ ہوائی جہاز کا پر اس کا کمزور حصہ ہے۔ وہ انسانی بوجھ کا تحمل نہیں کر سکتا۔

ہوائی جہاز کے پَر (wing) کے اوپر مذکورہ الفاظ پڑھتے ہوئے مجھے وہ حدیث یاد آ گئی جس میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی کچھ حدیں ہیں تم ان حدوں سے تجاوز نہ کرو —— وَحَدَّ حُدُودًا فَلَا تَعْتَدُوهَا (المعجم الصغیر للطبرانی، حدیث نمبر 1111)۔ "حد" کا معاملہ دنیا اور آخرت دونوں قسم کے معاملات میں انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ دونوں عالَموں میں وہی لوگ کامیاب رہیں گے جو حد کو جانیں۔ مثلاً کسی سے آپ کو اختلاف ہو تو علمی تردید کی حد تک آپ جا سکتے ہیں۔ اس کے آگے الزام تراشی اور کردار کشی اور سبّ وشتم کے لیے زبان وقلم کو

استعمال کرنے کی کسی کو اجازت نہیں۔ اسی طرح عمل کے معاملہ میں جائز حدود میں سرگرم ہونے کی ہر ایک کو اجازت ہے۔ مگر جائز حدود کے باہر کسی کو اجازت نہیں۔

☆☆☆☆☆

امریکا میں بڑی تعداد میں ایسے مراکز قائم ہیں جن کو یہاں کی اصطلاح میں ''اسلامک سنٹر'' کہا جاتا ہے۔ ہندستانی اصطلاح میں ان کو وسیع تر مسجد کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں مرکزی طور پر ایک مسجد ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ دوسرے تعلیمی اور ثقافتی شعبے بھی۔ یہ مراکز یہاں کے مسلمانوں کے لیے نقطہ اتحاد یا اجتماعی شیرازہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس قسم کے ایک مرکز کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہاں کے وابستہ مسلمانوں میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔ وہاں میں نے لوگوں کے اجتماع میں ایک تقریر کی۔ اس میں میں نے بتایا کہ اتحاد کی واحد قیمت اختلاف کو برداشت کرنا ہے۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے ہی کا دوسرا نام اتحاد ہے۔ اس سلسلہ میں صحابہ کرام کی بہت سی مثالیں دیں۔

تقریر کے بعد بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد مجھ سے ملے۔ انہوں نے کہا کہ ''اختلاف کے باوجود اتحاد'' کا یہ نظریہ ابھی تک ہم کو بتایا ہی نہیں گیا۔ حالانکہ اس معاملہ میں اہم ترین بات یہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خواہ مشرق کے مسلمان ہوں یا مغرب کے مسلمان، سب کی واحد کمی یہ ہے کہ ان میں حقیقی شعور موجود نہیں۔ ہمارے علما اور قائدین خود ہی بے شعوری کا شکار ہیں، پھر وہ دوسروں کو کس طرح شعور دے سکتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

23 ستمبر 1989ء کی شام کو دہلی سے پی آئی اے کی فلائٹ 293 کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ جہاز کی سروس انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ کے مطابق تھی۔ کراچی تک ایک گھنٹہ 45 منٹ کی پوری پرواز نہایت ہموار رہی۔ جہاز کے اندر مطالعہ کے لیے پاکستان کے اردو اور انگریزی اخبار موجود تھے۔

اخبارات کا مطالعہ میرے لیے کچھ زیادہ خوشی کا باعث نہ ہوسکا۔ اخبارات میں لفظی کشتی کا منظر دکھائی دیا۔ پنجاب کے ریاستی وزیر کی تقریر اسلام آباد کے مرکزی وزیر کے خلاف اور مرکزی وزیر کی تقریر پنجاب کے ریاستی وزیر کے خلاف۔ جماعت اسلامی کے لیڈر کا بیان مہاجر لیڈر کے خلاف اور مہاجر لیڈر کا بیان جماعت اسلامی کے لیڈر کے خلاف۔ اسی قسم کی خبریں اخبارات کے صفحہ اول کی زینت بنی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ تو اندازہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں جمہوریت ہے۔ مگر اہل پاکستان شعوری اعتبار سے شاید ابھی اس درجہ کو نہیں پہنچے کہ وہ جمہوریت کا تحمل کرسکیں۔

پاکستان ہندو اور مسلم اختلاف سے بچنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ مگر جب پاکستان بن گیا تو معلوم ہوا کہ "خداداد ملک" میں مسلم اور مسلم اختلاف اس سے بھی شدید صورت میں موجود ہے۔

☆☆☆☆☆

مسلمانوں کو دوسرے مذاہب کی طرف سے اکثر یہ الفاظ سننے پڑتے ہیں کہ تمہارے یہاں تو ستر سے زیادہ فرقے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مذاہب میں اس سے بھی زیادہ فرقے ہیں۔ امریکا کے ونسنٹ فوٹ (Vincent Foote) ایک بیپٹسٹ (Baptist) تھے۔ انہوں نے بتایا کہ امریکا میں 250 قسم کے بیپٹسٹ ہیں۔ اور مجموعی طور پر عیسائیوں میں تین ہزار فرقے ہیں۔ ابھی حال میں (35 سال پہلے) ایک نیا عیسائی فرقہ بنا ہے۔ اس کا صدر دفتر امریکا (واشنگٹن ڈی سی) میں ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

Church of Scientology International

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں میں اور دوسرے مذاہب میں اصل فرق فرقے کی کثرت کا نہیں ہے بلکہ جھگڑے کی کثرت کا ہے۔ مسلمان بات بات پر آپس میں لڑتے رہتے ہیں اس لیے کم فرقہ ہونے کے باوجود وہ کثرت فرقہ کے لیے مشہور ہیں۔ جب کہ دوسرے مذاہب

کے لوگ زیادہ فرقے ہونے کے باوجود اس طرح آپس میں نہیں لڑتے، اس لیے ان کا باہمی اختلاف دوسروں کو بہت کم دکھائی دیتا ہے۔(سفرنامہ غیر ملکی اسفار)

☆☆☆☆☆

21 نومبر 1993 کو عصر کی نماز گورنمنٹ کالونی (باندرہ، بمبئی) کی مسجد غوثیہ میں پڑھی۔ یہ ہائی وے کے عین کنارے ہے۔ نہایت وسیع اور خوبصورت مسجد ہے۔ 1974ء میں جب کہ جناب عبدالرحمن انتولے مہاراشٹر کے ہاؤسنگ منسٹر تھے، انہوں نے اس مسجد کی تعمیر کی منظوری دی تھی۔ کافی نمازی جماعت میں موجود تھے۔ میں نے سوچا کہ پنج وقتہ نماز اور ہفتہ وار جمعہ کی نماز کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے کتنی بڑی نعمت اہل اسلام کو عطا کی ہے۔ اس طرح ہر روز ہر علاقہ کے مسلمان روحانی مرکز کے ماحول میں ملتے ہیں۔ اس سے جو اجتماعی فائدے ہوتے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسجدوں کی تعداد ہزار گنا بڑھ گئی ہے۔ مگر مسجد کا عملی فائدہ اتنا ہی کم ہوگیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ نااہل لوگ ہر مسجد میں پہنچ جاتے ہیں۔ وہ مسجد کو اعتقادی اختلاف، سیاسی نزاعات، حتیٰ کہ متشددانہ تحریکوں کا اڈہ بنا دیتے ہیں۔ یہ اللہ کی مسجدوں کا غلط استعمال ہے۔ اس غلط استعمال نے مسلم آبادیوں کو مسجد کے حقیقی دینی فائدے سے محروم کردیا ہے۔

☆☆☆☆☆

امریکہ کے موجودہ سفر (1988) میں میں نے جو نئی باتیں دریافت کیں، ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ امریکی یہودیوں کی طاقت کا اصل راز ان کی تنظیم ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984) نے امریکا میں یہودیوں کی تعداد 58 لاکھ بتائی ہے۔ اس قلت تعداد کے باوجود انہوں نے اپنے تمام قابل ووٹ افراد کو ووٹر لسٹ میں درج کرا رکھا ہے۔ ہر الیکشن میں ان کے بیشتر افراد ووٹ دیتے ہیں اور ہمیشہ متحدہ طور پر اپنے ووٹوں کا استعمال کرتے

ہیں۔ ان کے تمام ادارے شیرازہ کی طرح باہم مربوط ہیں۔ اپنے قومی مقاصد کے لیے وہ بے دریغ دولت خرچ کرتے ہیں۔ ان میں انفرادی سطح پر اختلافات ہیں، مگر قومی نوعیت کے معاملہ میں وہ ہمیشہ متحد رہتے ہیں۔ وہ اربابِ کار سے مسلسل ربط رکھتے ہیں اوران کی رائے کو اپنے حق میں متاثر کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہر کام منظم انداز میں کرتے ہیں، نہ کہ اس طرح متفرق انداز میں جس کا ہمارے یہاں عام رواج ہے۔

☆☆☆☆☆

ایک سفر میں فلپائن کے ایک صاحب (احمد نوح) سے ائرپورٹ پر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ فلپائن میں سات ملین مسلمان ہیں۔ مسلمان تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ حتی کہ ان کے بیان کے مطابق سارے فلپائن میں ایک بھی مسلمانوں کا پریس موجود نہیں۔

فلپائن کے ایک علاقے میں مسلمان آزادی کی تحریک چلا رہے ہیں۔ اس تحریک آزادی کے لیڈر پہلے صرف مسٹر نور میسواری (Nur Misuari, b. 1939) تھے۔ ہاشم سلامات (Hashim Salamat, 1939-2003) ان کے نائب تھے۔ اب دونوں میں سخت اختلاف ہو گیا ہے۔ دونوں الگ الگ اپنی تحریکیں چلا رہے ہیں۔ احمد نوح صاحب دونوں لیڈروں سے ملے۔ انہوں نے نور میسواری سے کہا کہ اگر آپ نے اپنی سیاست کو نہ بدلا تو انقلاب ناکام ہو جائے گا (إِنْ لَمْ تُغَيِّرْ سِيَاسَتَكَ الآنَ فَالثَّوْرَةُ سَتَفْشَلُ)۔ مگر دونوں کو متحد کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

ان کی گفتگو سے میں نے اندازہ کیا کہ فلپائن کے دونوں لیڈر اگرچہ اپنے اختلاف اور علاحدگی کے لیے اصولی الفاظ بولتے ہیں، مگر اصلاً یہ قیادت کا جھگڑا ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے یہ وہی جھگڑا ہے جو ہندوستان سمیت تمام ملکوں میں پیش آ رہا ہے۔ لوگ اسلام کے نام پر اٹھتے ہیں۔ کام شروع کرتے ہیں۔ مگر جلد ہی بعد ایک دوسرے سے الگ ہو جاتے

ہیں۔ اگر ان کی سرگرمیاں حقیقتاً اسلام کے لیے ہوتیں تو اختلاف کے وقت ایک شخص پیچھے ہو جاتا اور پھر اختلاف اپنے آپ ختم ہو جاتا (جیسا کہ دو اصحابِ رسول ابوعبیدہ بن جراح اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے واقعہ سے ثابت ہوتا ہے، دیکھیے زیر نظر کتاب کا مضمون: آخرت رخی سوچ)۔ مگر جب اصل مقصد لیڈری ہو اور اسلام کا نام محض نعرہ کے طور پر استعمال کیا جائے تو ہمیشہ ایسا ہی پیش آتا ہے۔

☆☆☆☆☆

3 جنوری (1994) کی شام کو صغیر اسلم صاحب کے ساتھ امریکا میں ایک صاحب سے ملنے کے لیے روانہ ہوا۔ راستہ میں ہم لوگ ایک مقام سے گزرے۔ صغیر اسلم صاحب نے بتایا کہ پہلے ہم لوگ یہاں رہتے تھے۔ یہاں ان کے پاس چھ ہزار مربع فٹ کا مکان تھا۔ خوبصورت پارک کے کنارے کا یہ مکان بہت وسیع اور بہت شاندار تھا۔ مگر صغیر اسلم صاحب نے اپنے بچوں کی تربیت کے لیے اس کو چھوڑ کر مسجد کے قریب چھوٹا مکان لے لیا۔ یہ دوسرا مکان دو ہزار مربع فٹ کا ہے۔ علاقہ کے لحاظ سے بھی پہلا مکان نہایت اہم علاقہ میں تھا۔ جب کہ موجودہ مکان دوسرے درجہ کے علاقہ میں ہے۔ جب انہوں نے یہ مکان بدلا تو اکثر لوگ ان کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اتنا اچھا مکان چھوڑ کر معمولی مکان میں آگئے۔

یہاں ہر آدمی بچوں کے بگڑنے کی شکایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر یہ شکایت میرے نزدیک بے معنی ہے۔ اس لیے کہ اس معاملہ کا تعلق بچوں سے زیادہ ان کے بڑوں سے ہے۔ بڑے لوگ اپنے چاہنے کی قیمت ادا نہیں کرتے اسی لیے وہ اپنے بچوں کی اصلاح نہیں کر پاتے۔ اگر آپ اپنے بچوں کو آخرت پسند بنانا چاہتے ہیں تو اپنے گھر کے ماحول کو دنیوی شان و شوکت سے پاک کرنا ہوگا۔ اس کے بجائے اپنے آپ کو مسجد والے ماحول سے قریب کرنا ہوگا۔

یہی معاملہ پوری ملت کا ہے۔لوگ جو کچھ چاہتے ہیں اس کی قیمت ادا کرنے کے لیے وہ تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مطلوب چیز بھی ان کو نہیں ملتی مثلاً ہر آدمی اتحاد کی بات کرتا ہے مگر وہ اختلاف اور شکایت کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ یہ اتحاد کی واحد قیمت ہے۔لوگ سچائی کی بات کرتے ہیں، مگر وہ راہِ حق میں لوگوں کی طرف سے پیش آنے والی زیادتیوں پر صبر کرنے کے لیے تیار نہیں۔حالانکہ صبر کے بغیر خدا کے پیغام کو عام کرنا ممکن ہی نہیں۔لوگ ملت کی تعلیم وترقی کی بات کرتے ہیں مگر وہ نزاعات کو اوائڈ کرنے کے لیے تیار نہیں، حالانکہ تعلیم وترقی کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نزاعات کو ہر حال میں اوائڈ کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

لندن کے سفر (1992) میں ماہنامہ صراط مستقیم کے مدیر محترم نے ایک انٹرویو لیا۔ ایک سوال یہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ آپ کو ہر ایک سے اختلاف ہے اور آپ دوسری جماعتوں سے کٹ کر اپنا ایک نیا دین پیش کر رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ میں نے کہا کہ اختلاف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اساسیات میں اختلاف، اور دوسرا فروع میں اختلاف۔ میرا اساسیات میں کسی سے کوئی اختلاف نہیں۔مثلاً تمام لوگ رسول اللہ کو خاتم الرسل مانتے ہیں تو میں بھی رسول اللہ کو خاتم الرسل مانتا ہوں۔ میرا جو کچھ اختلاف ہے وہ فروعات میں ہے اور فروعات میں اختلاف صحابہ، تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہا اور علما کے درمیان ہمیشہ رہا ہے۔ یہاں اصل مسئلہ اختلاف کا نہیں بلکہ غیر ضروری حساسیت کا ہے۔ لوگ غیر ضروری طور پر اختلاف کے معاملہ میں حساس ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر وہ فروع میں اختلاف کو وہ درجہ دینے لگے ہیں جو اساسیات میں اختلاف کا درجہ ہوتا ہے۔لوگوں کی یہی

غیر ضروری حساسیت ہے جس نے مسئلہ پیدا کیا ہے، نہ کہ نفس اختلاف نے۔

☆☆☆☆☆

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اس نے کہا کہ آپ کی تحریروں میں اختلاف رائے اور تنقید بہت ہوتی ہے۔ یہاں کے کچھ لوگ کہنے لگے ہیں کہ آپ کو تنقید کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ بے بنیاد الزام ہے۔ آپ کسی بھی مہینہ کے الرسالہ کو اٹھا کر دیکھیے اور ہر مضمون کو پڑھ کر پتہ کیجیے کہ اس میں اختلاف رائے والا پہلو کتنا ہے۔ آپ پائیں گے کہ کسی پرچہ میں سرے سے ایسا کوئی مضمون نہ ہوگا اور کسی میں ہوگا بھی تو صرف ایک یا دو فیصد۔

پھر میں نے کہا کہ اصل مسئلہ اختلاف رائے نہیں ہے۔ اصل مسئلہ لوگوں کی غیر ضروری حساسیت ہے۔ صحابہ کے زمانہ سے لے کر ہر اگلے دور تک علما کے درمیان اختلاف ہوتا تھا مگر کبھی کسی نے اختلاف کو برا نہیں بتایا۔ مثلاً امام محمد اور امام ابو یوسف دونوں امام ابوحنیفہ کے شاگرد تھے۔ دونوں نے امام ابوحنیفہ کی رایوں سے 182 معاملہ میں اختلاف کیا ہے۔ مگر اس کو کبھی کسی نے برا نہیں مانا۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف رائے یا علمی وفکری تبصرہ قوموں کی زندگی ہے۔ اس کو اسلام میں اتنا زیادہ جگہ دی گئی ہے کہ آدم کی پیدائش کی کہانی کا ایک جزء جو بائبل میں حذف ہو گیا تھا اس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں درج فرمایا۔ یہ خود اللہ تعالیٰ سے فرشتوں کا یہ کہنا تھا: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (2:30)۔ یعنی، زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔

اس اختلاف کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کو کوئی سزا نہیں دی۔

☆☆☆☆☆

بمبئی کے سفر (نومبر 1993) میں عشا کی نماز کے بعد جناب جمشید علی سید کی رہائش گاہ پر ایک اجتماع ہوا۔ تعلیم یافتہ افراد اور الرسالہ کے قاری اس میں شریک ہوئے۔ میں نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ الرسالہ مشن اور موجودہ حالات میں اسلام کا طریق کار کے موضوع پر خطاب کیا۔ اس کے بعد سوال و جواب کی صورت میں گفتگو دیر تک جاری رہی۔ عام طور پر لوگوں نے الرسالہ کے نقطہ نظر سے اتفاق کیا۔

اجتماع میں موجود جناب خلیل زاہدی صاحب نے میری ایک بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ہر مسلمان ہندوؤں سے ذاتی تعلق میں اعراض اور ہم آہنگی کے اصول ہی پر عمل کرتا ہے مگر جب ملت کے پلیٹ فارم سے بولنا ہو تو وہ ٹکراؤ کی زبان بولنے لگتا ہے۔ اس دوعملی کو ختم کرنا بہت ضروری ہے۔

حاجی مستان مرزا (67 سال) بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ آپ نے بہت تجرباتی زندگی گزاری ہے۔ یہ بتائیے کہ مخالف کو جیتنے کا طریقہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: محبت، پیار۔ اگر آپ اپنے مخالف سے محبت کا سلوک کریں گے تو وہ بھی آپ ہی کی بولی بولنے لگے گا۔

ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ بقیہ علما سے میرا کوئی اختلاف نہیں۔ ان کے دل میں جو کچھ ہے اگر وہ وہی کرنے لگیں تو ان سے میرا اختلاف اپنے آپ ختم ہو جائے۔ حاجی مستان صاحب نے اس کو سن کر کہا: ”پھر علمائے دین کے دل میں جو ہے وہ اس کو اپنی زبان سے کہہ دیں۔ تمام علمائے دین ایک اسٹیج پر آ کر اپنے دل کی بات تمام اہل اسلام کو بتا دیں۔“

جمشید سید صاحب سے میں نے پوچھا کہ آپ بزنس کرتے ہیں۔ بتائیے کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد جواب دیا: کنٹروورسی

(controversy) سے بچنا اور اگر کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو میز پر بیٹھ کر اس کو طے کرلینا۔ میں نے کہا کہ یہ اصول جو ہر آدمی اپنی ذاتی زندگی میں اختیار کیے ہوئے ہے، اسی کو ہم کہتے ہیں کہ ملی معاملات میں بھی اختیار کرلو تو لوگ فوراً کہنے لگتے ہیں کہ الرسالہ بزدلی سکھاتا ہے۔ آخر لوگوں کی زندگی میں یہ دو عملی کیوں ہے۔ کیا دو عملی کا نام اسلام ہے۔

☆☆☆☆☆

لندن میں ایک علمی ادارہ ہے جس کا نام ہے مسلم انسٹی ٹیوٹ۔ اس ادارہ کے تحت لندن میں حج کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار (4 تا 7 اگست 1982ء) ہوا۔ اس سیمینار میں شرکت کے لیے مجھے بھی دعوت دی گئی تھی۔ مرکزی لندن کے ایک ہوٹل میں ہمارے لیے قیام کا انتظام تھا، اس میں ایک بڑا کمرہ نماز کے لیے خاص کیا گیا تھا۔ یہاں پانچوں وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جاتی تھی، مختلف ملکوں سے آئے ہوئے لوگوں کے مسلک بھی الگ الگ تھے۔ کوئی ایک ہاتھ کان پر رکھ کر اذان دیتا تھا اور کوئی دونوں ہاتھ۔ کوئی ہاتھ لٹکا کر نماز پڑھتا تھا کوئی ہاتھ باندھ کر۔ کوئی نماز کے بعد اجتماعی دعا کرتا تھا اور کوئی بغیر دعا کے نماز ختم کر دیتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ مگر ان اختلافی مسائل پر یہاں نہ کوئی بحث ہوئی تھی اور نہ اختلاف۔ ہر ایک دوسرے کے مسلک پر اعتراض کیے بغیر اپنے مسلک کے مطابق نماز پڑھتا اور پھر باہم اس طرح ملتا جیسے ان کے درمیان کوئی فرق ہی نہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ''مغربی علما'' ان مشرقی علما سے بہتر ہیں، جو انہیں امور پر باہم لڑتے رہتے ہیں، حتیٰ کہ دینی مسجدیں اور مدرسے الگ الگ بنا لیتے ہیں۔ یہ دراصل میدان اختلاف میں فرق کا سوال ہے، نہ کہ خود اختلاف کا۔ مشرقی علما جب کسی مختلف مسلک والے آدمی پر تنقید کرتے ہیں تو وہ کفر وفسق کی اصطلاحوں میں کلام کرتے ہیں۔ اس کے

برعکس، مغربی تعلیم یافتہ لوگ اس معاملہ میں اپنے مغربی اساتذہ کی نقل کرتے ہیں، وہ اپنی اختلافی شدت کو سیکولر الفاظ اور اصطلاحات تک محدود رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نئی دہلی میں سینیگال کی ایمبیسی موجود ہے۔ جو صاحب اس سفر (مئی 1990ء) کے لیے سینیگال ایمبیسی میں میرا ویزا لینے کے لیے گئے تھے، انہوں نے بتایا کہ ویزا افسر نے پاسپورٹ میں میری تصویر دیکھی تو کہا کہ میں ان کو جانتا ہوں۔ ہم کو خوشی ہے کہ وہ ہمارے ملک میں جارہے ہیں۔

ویزا افسر کے اس طرح "پہچاننے" کا سبب یہ تھا کہ ٹائمس آف انڈیا (10 دسمبر 1989ء) میں میرا انٹرویو چھپا تھا۔ اس میں انٹرویور نے میری تصویر بھی چھاپ دی تھی۔ مذکورہ افسر نے کہا کہ میں نے اس انٹرویو کو پڑھا تھا اور اس میں ان کی تصویر دیکھی تھی۔ یہ تصویر اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ موجودہ زمانہ کے نئے امکانات میں سے ایک امکان یہ ہے کہ ایک شخص کسی آدمی کو براہ راست نہ دیکھے، اس کے باوجود وہ اس کو اس کی صورت سے پہچانتا ہو۔

اس زمانہ میں تصویری صحافت نے انسان کے اوپر جو نئے مواقع کھولے ہیں، ان کی یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے۔ ہندوستان کے علما تصویر کو ناجائز بتاتے ہیں، مگر یہی علما عرب شخصیتوں کا اپنے اداروں میں استقبال کررہے ہیں، جب کہ یہ عرب لوگ تصویر کو عین جائز سمجھتے ہیں۔

ہندوستان کے دو عالموں کے درمیان اگر اختلاف ہوتو دونوں کے درمیان نزاع قائم ہوجاتی ہے۔ مگر یہی اختلاف ہندستانی عالم اور عرب عالم کے درمیان ہوتو ہندستانی عالم اس کو

خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرلیتا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے، یہ ایک نازک معاملہ ہے۔ مگر اس سے پردہ اٹھانا شاید خدا کے سوا کسی اور کے اختیار میں نہیں۔

☆☆☆☆☆

پونے کے سفر (1991) میں ایک شام کو جناب عبدالصمد صاحب کی رہائش گاہ کے سامنے کھلی زمین پر ایک اجتماع ہوا۔ اس میں شہر کے پڑھے لکھے لوگ جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں ایک گھنٹہ کی تقریر میں میں نے بتایا کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی طاقت اتحاد ہے۔ اور اتحاد پیدا ہونے کا واحد راز یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا مزاج پیدا ہو جائے۔

اسی سفر کے دوران ایک مجلس میں حدیث رسول، صَلُّوا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ (سنن الدار قطنی، حدیث نمبر 1768) — یعنی نیک اور فاجر ہر ایک کے پیچھے نماز پڑھو — کی تشریح کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برے لوگوں کو لا کر امام کی جگہ کھڑا کر دو۔ اس حدیث کا خطاب حقیقتاً امام کی طرف نہیں ہے۔ بلکہ مقتدیوں کی طرف ہے۔ یعنی مسجد میں کسی کو امام بنا دیا گیا۔ اب ایک شخص کے اندر خیال پیدا ہوا کہ امام کے اندر تو فلاں خرابی ہے۔ تو جس شخص یا جن لوگوں کے دل میں اس طرح کا خیال آئے انھیں اپنے اس خیال کے پیچھے نہیں دوڑنا چاہیے بلکہ اس کو نظر انداز کر کے امام کے پیچھے نماز پڑھتے رہنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

اخوانی فکر کے حامل ایک عرب نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ آپ کہتے ہیں کہ امراء المسلمین سے سیاسی نزاع کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ حالاں کہ امام احمد بن حنبل

جیسے جلیل القدر محدث نے عباسی حکومت سے نزاع کی۔ میں نے کہا کہ آپ کا حوالہ درست نہیں۔ امام احمد نے کبھی بھی عباسی حکومت سے سیاسی نزاع نہیں کی۔ یعنی انہوں نے کبھی یہ مہم نہیں چلائی کہ وہ عباسی خلافت کو توڑ کر نیا سیاسی نظام بنائیں۔ ان کا اختلاف صرف ایک مخصوص اعتقادی مسئلہ میں تھا۔ اس کے آگے ان کا کوئی سیاسی مطالبہ نہیں تھا۔

☆☆☆☆☆

کراچی (چاندنی چوک، ناظم آباد) کی محمدی مسجد کے خطیب جناب سید عبدالرؤف صاحب کو ایک تلخ تجربہ ہوا۔ انہوں نے ایک بار جامعہ کراچی میں قرآن کی تلاوت کی۔ تلاوت کے خاتمہ پر، عام قاریوں کے معمول کے خلاف، انہوں نے صدق اللہ العظیم نہیں کہا۔ اس پر ایک طالب علم نے انہیں ٹوکا اور کہا: جناب، آپ ایک آیت چھوڑ گئے ہیں۔

جناب عبدالرؤف صاحب پر اس کا سخت ردعمل ہوا۔ ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ چونکہ علما اور قرّاء نے اختتام تلاوت پر صدق اللہ العظیم کہنا اپنا معمول بنا لیا ہے۔ لہٰذا اس تواتر عمل نے عام لوگوں کے ذہنوں میں یہ مغالطہ پیدا کر دیا ہے کہ شاید یہ الفاظ بھی قرآن کا مستقل حصہ ہیں۔ ان کا یہ احساس اتنا شدید ہوا کہ وہ تلاوت قرآن کے آخر میں اس کلمہ کے کہنے کو بدعت و گمراہی سمجھنے لگے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک سخت مضمون لکھا جو لاہور کے ماہنامہ حکمت قرآن (نومبر، دسمبر 1989) میں دو قسطوں میں چھپا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد جوابی ردوکد ہوئی۔ یہاں تک کہ حکمت قرآن (مارچ 1990) میں مدیر محترم نے لکھا کہ یہ انتہا پسندانہ نقطہ نظر ہے۔ اگر دور اول میں اس کا معمول نہ ہو تب بھی تلاوت قرآن کے آخر میں صدق اللہ العظیم کہنا بدعت اور گمراہی نہیں۔ یہ گویا اختتام تلاوت کی علامت ہے اور اس اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔

میں نے ایک صاحب سے گفتگو کے دوران کہا کہ مذکورہ طالب علم کی بات محض ایک انفرادی بات تھی، اس کو اتنی زیادہ اہمیت دینا اور اس کو عمومی گمراہی سمجھ کر اس پر بحث جاری کر دینا صحیح نہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی حلقوں میں عام طور پر یہی ذہن چھایا ہوا ہے۔ اور اختلاف کا اصل سبب یہی مزاج ہے۔

☆☆☆☆☆

1984 کے مدینہ کے سفر میں بعض اشخاص نے عالم اسلام کے دینی مدارس کی بابت سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ہندوستان میں اور دوسرے ملکوں میں جو اسلامی ادارے قائم ہیں وہ اپنے اعلان کردہ مقصد کے برعکس نتائج پیدا کر رہے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان اداروں کا نظام جدلی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔ ان کے یہاں سارا زور اساسیات کے بجائے جزئیات پر ہے۔ ان میں سے کسی کا زور اعتقادی اختلافات پر ہے، کسی کا فقہی اختلافات پر اور کسی کا سیاسی اختلافات پر۔ اب چوں کہ جزئیات میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ اس لیے وہاں کے ماحول میں جس کی تربیت ہوتی ہے وہ اختلافات کا ماہر ہو کر نکلتا ہے۔

☆☆☆☆☆

28 ستمبر کو ظہر کی نماز قاہرہ کی مسجد ابی بکر الصدیق (شارع عبدالعزیز فہمی) میں پڑھی۔ اس پر تعمیر کا سن 1957 لکھا ہوا تھا۔ مسجد کشادہ تھی۔ مسجد سے متصل ایک کمرہ تھا جس میں امام کا دفتر تھا۔ اس میں میز کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ میز کے اوپر ٹیلی فون رکھا ہوا تھا۔ نمازیوں کی اکثریت کے سر پر ٹوپی نہ تھی۔ امام نے نماز ختم کی تو اجتماعی دعا کے بغیر اٹھ کر اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس قسم کی چیزیں ہندوستان میں اجنبی سمجھی جائیں گی۔ مگر عرب دنیا میں اس قسم کی چیزیں عام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی جھگڑے صرف برصغیر ہند میں پائے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں اس قسم کے جھگڑوں کا کوئی وجود نہیں۔

اس فرق کی وضاحت کرتے ہوئے کچھ عرب حضرات سے میں نے کہا کہ عبادت میں کچھ ارکان ہیں اور کچھ آداب۔ ارکان میں کوئی اختلاف نہیں۔ مگر آداب کے بارے میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جب احادیث جمع کی گئیں اور یہ اختلافات سامنے آئے تو محدثین نے ان کو توسع پر محمول کیا اور کہا کہ اِس پر عمل کرلو تب بھی ٹھیک ہے، اور اُس پر عمل کرلو تب بھی ٹھیک ہے۔ مگر فقہا نے کہا کہ الحق لایتعدد (حق کئی نہیں ہوسکتا)۔ اس وقت عالم اسلام، بڑی تقسیم میں دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ عرب ملکوں میں محدثین کا نقطہ نظر مقبول ہوا۔ اس بنا پر وہاں توسع کا مزاج پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس، برصغیر ہند میں فقہا کا نقطہ نظر پھیلا۔ میں نے کہا کہ اس معاملہ میں محدثین کا نقطہ نظر ہی درست ہے۔ اور اگر عرب دنیا کی طرح برصغیر میں بھی محدثین کا نقطہ نظر آجائے تو تمام غیر ضروری جھگڑے اپنے آپ ختم ہوجائیں۔

29 ستمبر کو عصر کی نماز قاہرہ کی مسجد الامین (شارع اسماعیل صبری باشا) میں پڑھی۔ یہ ایک چھوٹی مگر صاف ستھری مسجد تھی۔ اس کے ایک گوشہ کو منبر کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ مسجد کے اندر دو الماری میں کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ یہ کتابیں تفسیر، حدیث، فقہ اور علم العقائد وغیرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

وقت ہوا تو امام مصلے پر کھڑا ہوگیا۔ اس نے اقامت کہی، اس کے بعد خود ہی نماز پڑھائی۔ نمازیوں کی تعداد ایک صف سے زیادہ نہ تھی۔ نماز پوری کرنے کے بعد امام نے اپنے دائیں طرف چہرہ کرکے السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہا اور بائیں طرف السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اس کے بعد اجتماعی دعا کے بغیر لوگ اٹھ کر چلے گئے۔

برصغیر ہند میں فقہی اختلاف نے ملت کو مختلف طبقوں میں بانٹ رکھا ہے۔ عالم عرب میں یہ چیزیں موجود نہیں۔ البتہ ایک اور چیز مزید شدت کے ساتھ موجود ہے، اور وہ سیاسی اختلاف ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر عبد الحلیم عویس مصری سے بات چیت ہوئی انھوں نے کچھ مسلم لیڈروں کا ذکر کیا جنہوں نے اپنے غلط عمل کے ذریعہ ملت کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ مگر مسلمانوں کے درمیان اب بھی ان کو بڑائی کا مقام حاصل ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ مسلمان ایک ایسی قوم ہیں جو اپنے مفسدین کو عظمت کا درجہ دیتے ہیں (امۃ" تُعَظِّمُ مفسدِیھا)۔

☆☆☆☆☆

امریکا کے سفر (1993) میں ایک فلسطینی نوجوان سے اسلامک سوسائٹی (آرنج کاؤنٹی) میں ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے بعد انہوں نے فرائڈے رپورٹ (The Friday Report) کے تین شمارے برائے مطالعہ دیے۔ یہ دار مکہ ڈینور (Denver) کی طرف سے ہر ماہ "اسلامک نیوز لیٹر" کے طور پر شائع ہوتا ہے۔ اس نیوز لیٹر کے شمارہ اکتوبر۔ نومبر 1993 (جمادی الاول 4141ھ) میں فتویٰ کا ایک صفحہ تھا۔ اس میں بتایا گیا کہ یہ فتاویٰ اہل السنۃ والجماعۃ کے علما کی طرف سے دیے گئے ہیں۔ ایک سوال یہ تھا کہ کیا یہ جائز ہے کہ ایک غیر اسلامی ملک میں ایک مسجد بیچ کر دوسری زیادہ بڑی جگہ خریدی جائے۔ اس کے جواب میں بتایا گیا تھا کہ بیچنا اور جگہ کا بدلنا دونوں جائز ہے۔

Q. Is it permissible to sell a mosque in a non-Islamic country in order to buy a bigger one?

A. If the mosque is ruined or not big enogh and they have to demolish or sell it, it is permissible to sell it and to buy or build another one or transfer it to another place for the interest of the Muslims. (p.3)

اس کو پڑھ کر میں نے ایک صاحب سے کہا کہ اس قسم کا فتویٰ اگر انڈیا کا کوئی عالم دے تو شاید فوراً ہی دوسرا جوابی فتویٰ شائع ہوگا جس میں اعلان کیا جائے گا کہ جس شخص نے

ایسا فتویٰ دیا ہے وہ مباح الدم ہے، اس کو ذلت کے ساتھ قتل کر دینا چاہیے۔ مگر امریکا میں یہ فتویٰ چھپ رہا ہے اور انٹرنیشنل سیرت کانفرنس میں وہ تقسیم کیا جا رہا ہے مگر کوئی اس کے خلاف احتجاج کرنے والا نہیں۔ ہندوستان اور امریکا کا یہی فرق ہے جس نے ایک ملک کو مسلمانوں کے لیے فساد کا ملک بنا دیا ہے اور دوسرے کو امن کا ملک۔

☆☆☆☆☆

4 مارچ 1984 کو مدینہ کے سفر میں ایک صاحب عبدالقادر النماری (الجزائر) نے انٹرویو لیا۔ وہ اخبار المدینہ کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے ایک کاغذ پر بہت سے سوالات لکھ رکھے تھے۔ میں نے کچھ سوالات کے جوابات دیے اور کچھ اختلافی نوعیت کے سوالات کے جوابات سے معذرت کی۔ میں نے دیکھا کہ میرے جوابات کے بعد دوبارہ وہ نئی شق نکال کر سوال نہیں کرتے تھے اور میری معذرت فوراً قبول کر لیتے تھے۔

عبدالقادر جزائری تبلیغی جماعت سے متاثر ہیں اور کسی جماعت کے ساتھ دہلی (نظام الدین) بھی جا چکے ہیں۔ مجھے گفتگو کے دوران بار بار یہ تجربہ ہوا کہ تبلیغی جماعت کے افراد بحثوں میں نہیں الجھتے۔ اور نہ اختلافی امور میں زیادہ شدت ظاہر کرتے۔ یہ ان کے دینی مزاج کا ثبوت ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہیں ان سے گفتگو کے دوران اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کو سب سے زیادہ دلچسپی اختلافی امور سے ہے۔ کوئی بھی جواب انہیں چپ نہیں کرتا۔ ہر جواب کے بعد وہ ایک نیا لفظی شوشہ نکال کر نئی بحث شروع کر دیتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

3 اکتوبر 1990ء کو طرابلس سے پی آئی اے کی فلائٹ نمبر 720 کے ذریعہ روانگی ہوئی۔ 4 اکتوبر کو صبح ساڑھے چار بجے کراچی پہنچا۔ یہاں ٹرانزٹ پسنجر کے طور پر دو دن قیام رہا۔

14 اکتوبر کو ظہر کی نماز گلشن اقبال (بلاک نمبر 7) کی جامع مسجد میں پڑھی۔ پوری مسجد ایک بڑے ہال کی صورت میں ہے۔ اس کے اندر اور باہر بالکل فطرت کا ماحول ہے۔ نماز پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوا کہ میں ایک روحانی مرکز میں ایک روحانی عمل ادا کر رہا ہوں۔ جب میں مسجد کے اندر بیٹھا ہوا تھا، مجھے خیال آیا کہ اگر مسلمان ان تمام جھگڑوں کو ختم کر دیں جن کو وہ اسلام کے نام پر غیر ضروری طور پر جاری کیے ہوئے ہیں اور اسلام کی نمائندگی کے لیے صرف اس قسم کی مسجدیں دنیا میں باقی رہیں تو دنیا کی آدھی آبادی صرف ان مسجدوں کو دیکھ کر اسلام قبول کر لے۔ دوسرے مذاہب کے عبادت خانوں کے مقابلہ میں مسجد کا ماحول نہایت فطری اور سادہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمانوں کی بے فائدہ سیاسی اور مادی اور قومی ہنگامہ آرائیوں نے اسلام کے اس فطری حسن پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اگر مسلمان صرف اتنی قربانی کریں کہ وہ کچھ نہ کریں تو اسلام اپنے آپ دنیا کو اپنی طرف کھینچے گا اور لوگ جوق در جوق دین فطرت کے دائرہ میں داخل ہو جائیں گے۔

ایک پاکستانی نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اس سال ہائی اسکول پاس کیا ہے۔ ان سے میں نے پوچھا کہ میں نے سنا ہے کہ پاکستان میں ہندو لڑکے تعلیم کے میدان میں مسلمان لڑکوں سے آگے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں، یہ بات صحیح ہے۔ میں نے پوچھا کہ اس کا راز کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرے ایک استاد نے ایک مرتبہ یہی بات ہم لوگوں سے کہی۔ انہوں نے اس کا راز یہ بتایا کہ ہندو لڑکوں میں مل کر پڑھنے (combined study) کا رواج ہے۔ مل کر پڑھنے سے ہر ایک کو دوسرے کی معلومات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، ایک طالب علم ذاتی طور پر پڑھے تو اس کو ایک درجہ فائدہ ملے گا۔ مگر جب کئی طالب علم مل کر مطالعہ کریں تو ہر ایک کو کئی گنا زیادہ فائدہ ملنے لگتا ہے۔

کراچی کے روزنامہ جنگ (13 اکتوبر) میں ”جنگ الیکشن سیل“ کی طرف سے ایک تجزیہ چھپا تھا اس میں 1988ء میں ہونے والے الیکشن کی ان 34 نشستوں کا ذکر تھا جو

اسلامی جمہوری اتحاد اور دوسری جماعتوں اور آزاد امیدواروں کی باہمی چپقلش کی وجہ سے پیپلز پارٹی کومل گئیں۔ ان جماعتوں میں ووٹ بٹ جانے کے باعث پیپلز پارٹی جیت گئی۔

مضمون میں بتایا گیا تھا کہ یہ پوری سچائی نہیں۔ مضمون نگار نے نام بنام تفصیل کے ساتھ بتایا تھا کہ یہی واقعہ خود پیپلز پارٹی کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس کے اپنے دائرہ میں بھی کئی جگہ امیدواروں کی کثرت کی بنا پر اس کے ووٹ بٹ گئے اور وہ اسلامی جمہوری اتحاد کے مقابلہ میں ہار گئی۔ مضمون نگار نے لکھا تھا کہ اس نے باقاعدہ تفصیلات جمع کیں تو حیرت انگیز طور پر ان نشستوں کی تعداد بھی 34 ہی تھی جو پیپلز پارٹی نے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر کھودیں۔ یعنی اپنے ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر اسلامی جمہوری اتحاد نے بھی 34 نشستیں کھوئیں اور اسی طرح پیپلز پارٹی نے بھی ووٹوں کی تقسیم کی بنا پر 34 نشستیں کھودیں۔

اختلافی معاملات میں لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ وہ اپنے موافق آدھی بات کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے مخالف آدھی بات کا ذکر نہیں کرتے۔ یہ طریقہ نہ عقل کے مطابق ہے اور نہ اسلام کے مطابق۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کریں وہ ہمیشہ حقیقت کی دریافت میں ناکام رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

اندور، مدھیہ پردیش کے سفر (مئی 1993ء) میں اندور یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں میرے لیے رکنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ گیسٹ ہاؤس کے کمرہ میں ”مدھیہ پردیش شاسن“ کا ہندی کا کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے ہر صفحہ پر دو تاریخیں درج تھیں۔ کھلے ہوئے صفحہ پر ایک طرف ”مئی 1993ء“ لکھا ہوا تھا۔ اور دوسری طرف ”ویشاکھ۔ جیٹھ 1915“ درج تھا۔ یہ کیلنڈر اگر کسی مسلم ادارہ نے چھاپا ہوتا تو اس پر ”مئی 1993ء“ کے ساتھ ”ذی الحجہ 1413ھ“ چھپا ہوا ہوتا۔

میں نے سوچا کہ اسی قسم کے اختلافات ہیں جن کو بڑھا کر دوقومی نظریہ کا پرچار کیا گیا۔ اور ملک کا بٹوارہ کرایا گیا۔ اور اب دوبارہ اسی قسم کے اختلافات ہیں جن کو لے کر ہمارے لیڈر باہمی نفرت پھیلانے میں مصروف ہیں۔ حالاں کہ یہ فرق یا اختلاف کسی انسان کے گھڑے ہوئے نہیں۔ وہ فطرت کے نقشۂ تخلیق پر مبنی ہیں جن کو نہ انسان نے بنایا اور نہ وہ ان کو بنانے پر قادر ہے۔ مثلاً فطرت کا نظام یہ ہے کہ سورج الگ طریقہ سے گردش کرتا ہے اور چاند الگ طریقہ سے۔ اگر خود فطرت میں یہ فرق نہ ہوتا تو ایک سے زیادہ کیلنڈر بھی نہیں بن سکتے تھے۔ اس اختلاف کو تنوع سمجھ کر قبول کرنا چاہیے، نہ کہ اس کو دو انسانی گروہوں میں ٹکراؤ کا اشو بنایا جائے۔

☆☆☆☆☆

ایک انٹر فیتھ پروگرام میں میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اختلاف زندگی کی ایک حقیقت ہے۔ روزانہ کی زندگی میں گھر کے اندر اور گھر کے باہر ہم طرح طرح کے اختلافات سے دوچار ہوتے ہیں۔ وہاں ہم کیا کرتے ہیں۔ وہاں ہم برداشت کے اصول پر عمل کرکے زندگی گزارتے ہیں۔ یہی طریقہ مذہب میں بھی اختیار کرنا ہے۔ یعنی مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود ٹالرنس (tolerance)۔

☆☆☆☆☆

ایک مجلس میں بات چیت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انڈیا میں جو ہندو مسلم معاملہ ہے اس کا بہت کم تعلق نام نہاد انتظامیہ سے ہے۔ اس کا زیادہ تر تعلق مسلم عوام اور ہندو عوام سے ہے۔ اس معاملہ میں ہمیں یہ کرنا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات پیدا کریں اور لوگوں کو یہ نصیحت کریں کہ وہ اختلافی معاملات میں صبر و ضبط اور حکمت و تدبیر

سے کام لیں، نہ کہ جوش اور مشتعل مزاجی سے۔ اس کے سوا جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے وہ تباہ کن ثابت ہوگا۔

☆☆☆☆☆

ایک مرتبہ سیوا گرام کے لیے میرا ایک سفر ہوا۔ وہاں پروگرام میں تقریر کرتے ہوئے میں نے یہ کہا کہ دیش کی ترقی کے لیے بلا شبہ ایک پروگرام درکار ہے۔ مگر پروگرام سے پہلے وہ افراد درکار ہیں جو اس پروگرام کو دل کی آمادگی کے ساتھ اختیار کریں۔ میں نے کہا کہ اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں میں یہ شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ اختلافات ہر سماج میں ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ اختلاف اور شکایت کے باوجود مل جل کر رہنا سیکھیں۔ ہمارے دیش کے مسئلہ کا حل وہی ہے جو کسی نے کہا کہ اختلافی باتوں کو پر امن طور پر طے کر لینا:

Peaceful resolution of conflicts.

اس مقصد کے لیے ہمیں intensive awareness programme جاری کرنا ہوگا۔

☆☆☆☆☆

مالٹا کے سفر (1991) میں ایک اخبار نویس نے سوال کیا کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ڈائیلاگ کی کامیابی کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ کیونکہ آپس کے اختلافات کی وجہ سے یہ کوشش آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ پھر ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ایک جملہ میں اس کا جواب یہ ہے کہ اختلاف کو نظر انداز کیجیے۔ اور اتحاد کے گوشوں کی تلاش جاری رکھیے:

I will give the answer in a single sentence: avoid the differences and continue the dialogue to seek the points of agreement.

☆☆☆☆☆

کینیڈا کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کچھ لٹریچر دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کینیڈا میں سرکاری سطح پر ایک تحریک چلائی جا رہی ہے جس کو وہ لوگ ملٹی کلچرلزم (Multiculturalism) کہتے ہیں۔ یہ اسی قومی ایکتا کے لیے ہے جس کو ہندوستان میں نیشنل انٹگریشن (National integration) کہا جاتا ہے۔ مگر مجھے کینیڈا کی اصطلاح، ہندوستان کی اصطلاح سے زیادہ پسند آئی۔ ہندوستان کی اصطلاح میں بظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ مختلف گروہوں کے درمیان یک جہتی کو کلچرل یکسانیت کے ذریعہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ جب کہ کینیڈا کی اصطلاح واضح طور پر کلچرل تعدد کو تسلیم کرتے ہوئے سماج کے اندر ہم آہنگی لانا چاہتی ہے۔

جس طرح ہندوستان میں مختلف تہذیبی گروہ ہیں، اسی طرح کینیڈا (اور دوسرے ملکوں) میں بھی مختلف تہذیبی گروہ ہیں۔ اس "اختلاف" کو "اتحاد" میں تبدیل کرنے کا راز یہ نہیں ہے کہ خود اختلاف کو ختم کرنے کی ناکام کوشش کی جائے۔ اس کا راز صرف ایک ہے، وہ یہ کہ اختلاف کو بطور واقعہ تسلیم کیا جائے اور اسی کے ساتھ لوگوں کے اندر یہ مزاج پیدا کیا جائے کہ وہ باہمی طور پر رواداری اور احترام کے ساتھ رہ سکیں۔

☆☆☆☆☆

ایک بڑے سائنسی ادارہ ایم آئی ٹی کے زیر انتظام پونے میں ایک بین الاقوامی کانفرنس ہوئی جو 24 نومبر سے یکم دسمبر 1996ء تک جاری رہی۔ اس کانفرنس کا نام ورلڈ فلاسفرس میٹ تھا۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے کانفرنس میں شرکت کی۔ کانفرنس میں بہت بڑی تعداد میں تعلیم یافتہ ہندو شریک تھے۔ کئی ہندوؤں نے اپنے مخصوص ذوق کے مطابق یہ بات کہی کہ سب دھرم ایک ہیں۔ لوگ ناحق مذہب کے نام پر آپس میں لڑتے ہیں۔ اس سلسلہ میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مذہبی اختلاف کا حل یہ نہیں ہے کہ یہ

ثابت کیا جائے کہ سب مذہب ایک ہیں۔ اس کا حقیقی حل یہ ہے کہ ٹالرنس پر زور دیا جائے۔ لوگوں کو یہ بتایا جائے کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے نہ صرف مذہب میں بلکہ ہر معاملہ میں اختلافات ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں پر امن سوسائٹی بنانے کا راز یہ ہے کہ لوگ اپنے عقیدے کو مانتے ہوئے دوسرے کا احترام کریں۔ گویا کہ اس مسئلہ کا حل باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

☆☆☆☆☆

بمبئی (ممبئی) کے سفر میں ایک مسلمان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے "ہندو تعصب" کا ذکر کیا۔ میں نے مثال پوچھی تو انھوں نے کہا کہ دیکھیے، بمبئی میں جمعہ کی نماز میں کچھ مسجدوں میں نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو وہ سڑک پر صف بنا لیتے ہیں۔ اس کو ہندو برداشت نہیں کر سکتے۔ وہ ہم کو وارننگ دے رہے ہیں کہ سڑک پر نماز پڑھنا بند کر دو، ورنہ —— میں نے کہا کہ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اختلاف اور دشمنی کے وقت بھی انصاف سے کام لو۔ اس لیے اس معاملہ میں آپ لوگوں کو انصاف والی بات کہنا چاہیے۔ پھر میں نے کہا کہ اسی ملک میں پچاس سال سے یہ ہو رہا ہے کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے مسلمان جب نماز پڑھنا چاہتے ہیں تو ہندو مسافر کھڑے ہو کر جگہ خالی کر دیتے ہیں تا کہ مسلمان سہولت کے ساتھ نماز پڑھ سکیں۔ اگر آپ کو اس میں شبہ ہو تو تبلیغی جماعت کے کسی بھی آدمی سے پوچھ لیجیے۔

اب سوچئے کہ وہی ہندو جو روزانہ ٹرین میں نماز پڑھنے کے لیے جگہ خالی کر دیتا ہے وہی سڑک پر نماز پڑھنے کو کیوں ناپسند کر رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹرین میں آپ کو نماز کی جگہ دینے سے اس کا سفر بھنگ نہیں ہوتا۔ جب کہ سڑک پر آپ کی نماز سے اس کا سفر

بھنگ ہوتا ہے۔سڑک سے سفر کرنے والے ہزاروں مسافروں کو سڑک کے اِدھر اور اُدھر اس وقت تک رکے رہنا پڑتا ہے جب تک آپ نماز ختم کر کے سڑک کو خالی نہ کر دیں۔ اس لیے آپ یوں کہیے کہ جو نماز ہندو کی زندگی میں خلل نہ ڈالے اس کا وہ سواگت کرتا ہے، البتہ وہ اس نماز کا مخالف ہے جس سے اس کی زندگی میں خلل واقع ہوتا ہو۔

☆☆☆☆☆

دسمبر 1992 میں شانتی یاترا کے تحت میں اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ شری رام پور (مہارشٹرا) میں پہنچا۔لوگوں سے ملاقاتوں کے دوران شری رام پور کا ایک سبق آموز قصہ معلوم ہوا۔ یہاں ایک بزرگ کی قبر ہے۔6 دسمبر کے بعد کسی شریر آدمی نے رات کے وقت قبر کو توڑ ڈالا۔ اس قسم کا ایک واقعہ عام طور پر دو فرقوں میں کشیدگی اور پھر خونین فساد کا سبب بن جاتا ہے۔مگر شری رام پور میں ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب یہ قصہ پیش آیا تو فوراً ہی بستی کے ہندو اور مسلمان وہاں پہنچے اور دونوں نے مل کر قبر کو پھر سے بنایا۔ اور پھر اس کے اوپر حسب قاعدہ چادر چڑھائی۔ اس طرح انھوں نے فساد کے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔ یہ واقعہ 17 دسمبر کو مجھے معلوم ہوا جب کہ میں شانتی یاترا کے تحت شری رام پور میں پہنچا تھا۔

اسی یاترا کے تحت 17 دسمبر کی شام کو ہم نِواسا پہنچے۔ یہاں پد یاترا کے بعد حسب معمول جلسہ ہوا جس میں ہمارے ساتھیوں نے تقریریں کیں۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ زندگی میں کبھی کبھی اختلاف کا پیدا ہونا عین فطری ہے۔ ایسا ہمیشہ ہوگا۔ خواہ وہ ایک سماج ہو یا کوئی دوسرا سماج۔ پھر اس کا حل کیا ہے۔

میں نے کچھ واقعات بتاتے ہوئے کہا کہ اس کے حل کے لیے میں آپ کو دو آسان نسخہ بتاتا ہوں۔ ایک یہ کہ — دوری کو دور کیجیے۔یعنی ایک فرقہ اور دوسرے فرقہ کے لوگ

آپس میں خوب ملیں۔ وہ باہمی دوری کو ختم کریں۔ اس کے بعد بہت سی غلط فہمیاں اپنے آپ ختم ہوجائیں گی۔

دوسرے یہ کہ جب جھگڑے یا اختلاف کی صورت پیدا ہو تو ایسے موقع پر آپ کا اصول ہونا چاہیے — ٹکراؤ نہیں، تدبیر۔ یعنی ایسے مواقع پر آپ ٹکراؤ کا طریقہ اختیار نہ کریں بلکہ تدبیر کا طریقہ اختیار کریں۔ آپ بم پر بم نہ ماریں بلکہ بم کو ڈیفیوز کردیں۔ اگر آپ ایسا کریں تو آپ جھگڑے کو اس کے پہلے ہی مرحلہ میں ختم کردیں گے۔ میری تقریر کے بعد کچھ ہندو نوجوان مجھ سے ملے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے کبھی اس طرح سوچا نہیں تھا۔ مگر آج سمجھ میں آیا کہ یہی اصل بات ہے اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔

☆☆☆☆☆

14 دسمبر 1992ء کو ڈیفنس کالونی (نئی دہلی) میں بابری مسجد کے واقعہ کے بعد ایک ٹی وی پروگرام ہوا۔ اس میں مختلف مذہبوں کے لوگ جمع ہوئے۔ پروگرام کے اینکر نے ہر ایک سے ایک ہی سوال کیا "موجودہ حالات میں آپ دیش کے لوگوں کو کیا سندیش دینا چاہیں گے۔" ہر مذہب کے نمائندہ نے کہا کہ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت یہ ہے کہ امن قائم ہو اور نفرت کا خاتمہ کیا جائے۔ میں نے بھی یہی بات اپنے انداز سے کہی۔

میں نے مزید کہا کہ جب کچھ لوگ مل کر رہیں، تو خواہ وہ ایک گھر میں ہوں یا ایک ملک میں، بہرحال ایسے مواقع آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس لیے عملی طور پر امن اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جب کہ اختلافی بات پیش آنے کے باوجود امن ومحبت کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

☆☆☆☆☆

ایک صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ہم ہندستانیوں میں یہ کمزوری ہے کہ ہم اکیلے اکیلے کام کرسکتے ہیں، مگر ہم سنگٹھن کے ساتھ کام نہیں کرسکتے۔

میں نے کہا کہ یہ بات بالکل درست ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنگٹھن یا اتحاد کے ساتھ کام کرنے کے لیے اختلاف کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہمارے یہاں یہ مزاج نہیں۔ ہندستانی انسان اپنی رائے دینا جانتا ہے مگر وہ اپنی رائے واپس لینا نہیں جانتا۔ جب کہ اتحاد کی یہ لازمی شرط ہے۔ اتحاد کے لیے ایسے افراد درکار ہیں جو زبان رکھتے ہوئے نہ بولیں۔ جو رائے رکھتے ہوئے اس کو ظاہر نہ کریں۔ جو اختلاف رکھتے ہوئے اس کو استعمال نہ کریں۔

☆☆☆☆☆

12 جون 1969 کو جمعیۃ علما گڑگاؤں کی مجلسِ عاملہ کا اجتماع تھا۔ ارکان عاملہ کے علاوہ ضلع کے مختلف مقامات سے دیگر علما کو بھی خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ مدرسہ فیض الاسلام کی وسیع اور پُرفضا مسجد میں نماز عشاء کے بعد نشست ہوئی۔ اس اجتماع میں مَیں نے جو باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ملت کو سربلند کرنے کے لیے سب سے پہلے خود ملّت کو بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے یہاں عالَم یہ ہے کہ ایک شخص کو کسی معاملہ میں ذرا سا بھی کسی سے اختلاف پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کا جانی دشمن بن جاتا ہے۔ جب تک ہمارے افراد میں کیریکٹر نہ ہو اور انہیں مل کر رہنا نہ آتا ہو کوئی اجتماعی کام سرے سے انجام نہیں دیا جاسکتا۔ پھر جب یہ ابتدائی چیز ہی ہمارے درمیان موجود نہیں ہے تو ہم کوئی اگلا کام کس طرح کرسکتے ہیں۔

چوتھا حصہ

تاثرات وتجربات

20 جنوری 1983

ایک صاحب نے کہا کہ دین میں اتنا زیادہ اختلاف ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ میں نے کہا کہ کس قسم کا اختلاف۔ انھوں نے کہا مثلاً ایک مولوی صاحب کہتے ہیں کہ خدا کے لیے واحد کا صیغہ ہی استعمال کرنا چاہیے۔ اگر جمع کا صیغہ استعمال کیا تو جہنم میں جانے کا اندیشہ ہے۔ یعنی خدا رزق دیتا ہے، کہنا چاہیے، نہ کہ خدا رزق دیتے ہیں۔ اسی طرح کی عجیب عجیب باتیں۔

میں نے کہا کہ اس کا حل بہت آسان ہے۔ جو شخص آپ سے اس قسم کی بات کہے، اس سے پوچھیے کہ جو بات تم کہہ رہے ہو وہ قرآن میں کہاں لکھی ہے۔ اگر وہ قرآن سے اپنی بات کا ثبوت دے تو مانیے ورنہ مت مانیے۔

انہوں نے کہا کہ اگر وہ شخص کہے کہ قرآن میں سب بات کہاں ہے۔ تو آپ کہیے کہ پھر حدیث سے ثبوت دو۔ اور اگر وہ کہے کہ حدیث میں سب بات کہاں ہے تو اس سے کہیے کہ جو بات نہ قرآن میں ہو اور نہ حدیث میں تو ایسی بات کی ہمیں ضرورت بھی نہیں۔

30 جنوری 1983

حدیث کا مطالعہ امت میں جتنے بڑے پیمانے پر کیا گیا، اتنے بڑے پیمانے پر قرآن کا مطالعہ نہیں کیا گیا۔ مگر حدیث کا وہ عملی فائدہ امت کو نہ پہنچ سکا، جو امت کو اس سے پہنچنا چاہیے تھا۔ اس کی کم از کم ایک خاص وجہ یہ ہے کہ احادیث میں بہت زیادہ اختلافات ہیں۔ امت کے علما چوں کہ ان اختلافات میں تطبیق کا کوئی متفقہ معیار دریافت نہ کر سکے، اس لیے حدیث کا مطالعہ بہت بڑے پیمانہ پر اختلافات پیدا کرنے کا سبب بن گیا۔

حدیث کے اختلافات میں تطبیق کا میرے نزدیک واحد قابلِ عمل معیار یہ ہے کہ اس

کو حالات کے اختلاف پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ انسانی حالات چوں کہ ہمیشہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں، اس لیے حدیثوں میں بھی اختلاف پیدا ہو گیا۔ کیوں کہ حدیثیں زیادہ تر وہ نصیحتیں ہیں جو مختلف حالات کے اعتبار سے مختلف اوقات میں لوگوں کو دی گئیں۔

ایک مثال لیجیے۔ آپ اگر حدیث کی کتابوں میں "اشربہ" کا باب پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ مختلف روایتوں میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً بخاری اور دوسری کتب حدیث میں یہ روایتیں موجود ہیں کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پیا، اسی طرح صحابہ کرام نے کھڑے ہو کر پانی پیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 5615)۔

دوسری طرف ایسی بھی حدیثیں ہیں جن میں واضح لفظوں میں کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع کیا گیا ہے۔ مثلاً مسلم اور ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر پانی پینے سے منع فرمایا۔: نَهَى عَنِ الشُّرْبِ قَائِمًا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2025)۔ اس مضمون کی روایتیں مختلف کتبِ حدیث میں الفاظ کے فرق کے ساتھ آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے: لَا يَشْرَبَنَّ أَحَدُكُمْ قَائِمًا (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 14641؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2026)۔

اس اختلاف کی توجیہ وتطبیق میں بڑی بڑی بحثیں کی گئی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ایک نوعیت کی حدیث کی تضعیف کر کے دوسری نوعیت کی حدیث کو تسلیم کیا ہے۔ کسی نے ایک کو ناسخ اور دوسرے کو منسوخ قرار دیا ہے۔ امام نووی نے ممانعت کو کراہت تنزیہی پر محمول قرار دیا ہے، اور رسول اللہ اور صحابہ کرام کے کھڑے ہو کر پانی پینے کو جواز کے درجہ میں رکھا ہے (شرح النووی علی صحیح مسلم، جلد 13، صفحہ 195)۔

مگر میرے نزدیک ان میں سے کوئی توجیہ بھی درست نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ فرق حالات کی بنا پر ہے۔ نارمل حالات میں ایک شخص خواہ بیٹھ کر پانی پیے یا کھڑے ہو کر۔ اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ مگر ایک شخص مثلاً بھاگا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ آتا ہے اور

ہانپتے ہوئے کہتا ہے کہ پیاس لگ رہی ہے، پانی لاؤ۔ اب اس کے سامنے پانی لایا جاتا ہے۔ وہ کھڑے کھڑے وہیں پینے لگتا ہے۔ تو ایسے شخص کے بارے میں یہی کہا جائے گا کہ بیٹھ کر پانی پیو۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب دو قسم کا حکم ہے تو لازماً ایک مطلوب ہوگا اور دوسرا غیر مطلوب۔ حالانکہ یہ مفروضہ غلط ہے۔ یقیناً بعض اوقات اس بنا پر بھی فرق ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بیک وقت دونوں حکم مطلوب ہوتے ہیں، کوئی حکم ایک قسم کے حالات میں، اور کوئی حکم دوسرے قسم کے حالات میں۔

9 اپریل 1983

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لَا تَخْتَلِفُوا فَتَخْتَلِفَ قُلُوبُكُمْ (مسند احمد، حدیث نمبر 18516)۔ یعنی، اختلاف نہ کرو، ورنہ تمہارے دل باہم مختلف ہو جائیں گے۔ دوسری روایت یہ ہے: اختلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ یعنی، میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

اہل علم کی ایک تعداد نے دوسری روایت کو موضوع یا کم از کم غیر معتبر بتایا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس کی اسناد کمزور ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں تضاد ہے۔ ابن حزم لکھتے ہیں کہ اگر ہم یہ مان لیں کہ اختلاف رحمت ہے تو یہ بھی ماننا ہوگا کہ اتفاق زحمت ہے (لَوْ الِاخْتِلَافُ رَحْمَةً كَانَ، لَكَانَ الِاتِّفَاقُ سُخْطًا) الاحکام فی اصول الاحکام لابن حزم، جلد 5، صفحہ 64۔

مگر ابن حزم اور دوسرے حضرات کی یہ تنقید صحیح نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں روایتوں میں اختلاف دو الگ الگ معنوں میں ہے۔ پہلی روایت میں اختلاف کا لفظ اپنے آخری معنی کے اعتبار سے استعمال ہوا ہے اور دوسری روایت میں صرف ابتدائی معنی میں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ پہلی روایت میں اختلاف کا لفظ اختلاف میں اصرار کی حد تک جانے کے معنی میں ہے اور دوسری روایت میں مجرد اظہارِ اختلاف کے معنی میں۔

جس معاشرہ میں اظہار رائے کی آزادی ہو، اس کے ساتھ لوگ یہ بھی جانتے ہوں کہ اختلاف کے باوجود انھیں ہر حال میں جماعت کے ساتھ متحد رہنا ہے، ایسے ماحول میں اختلاف رحمت بن جاتا ہے۔ مگر جہاں ہر آدمی اپنی رائے پر اصرار کرنے لگے، اختلاف کے بعد وہ کسی طرح متحد ہونے کے لیے تیار نہ ہو تو ایسے ماحول میں اختلاف صرف بربادی تک پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔ پہلے اختلاف کی ایک حد ہے۔ اور وہ حد یہ ہے کہ جب تک وہ رحمت کا باعث ہے، اس وقت تک اختلاف، اس کے بعد اختلاف نہیں۔ اس کے برعکس، دوسرا اختلاف کسی حد کو نہیں جانتا۔ وہ شروع ہونے کے بعد برابر جاری رہتا ہے، خواہ اس کے بعد مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آپس میں لڑنے لگیں۔

18 اپریل 1983

میں نے ایک عرب عالم کا مضمون پڑھا۔ ان کی یہ بات مجھے پسند آئی کہ اختلاف (difference) برا نہیں، البتہ مخالفت (opposition) برا ہے۔ اختلاف ایک طبیعی امر ہے اور وہ اسلام کے دور اول میں ہی موجود تھا، مگر وہ مخالفت تک نہیں پہنچا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب صحابہ کو بنو قریظہ کی بستیوں کی طرف روانہ کیا تو بتاکید فرمایا کہ تم لوگ بنو قریظہ میں پہنچ کر ہی عصر کی نماز پڑھنا — لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ الْعَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 946)۔ صحابہ میں سے کچھ لوگوں نے اس حکم کے الفاظ کو لیا اور بنو قریظہ میں پہنچ کر تاخیر کے ساتھ نماز پڑھی۔ کچھ لوگوں نے اس کو معنی پر محمول کیا اور اس کو تیز قدمی (الاسراع لبلوغ الہدف) کے معنی میں لیتے ہوئے راستہ میں نماز پڑھ لی۔ اور رسول اللہ نے دونوں کی تصدیق فرمائی۔

یہ واقعہ (اور اس طرح کے دوسرے واقعات) اس کا کھلا ہوا ثبوت تھے کہ بعض امور میں تنوع ایک فطری امر ہے، اس لیے ان میں توحّد پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرنا

چاہیے۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگ (خاص طور پر فقہا) اس حقیقت کو ملحوظ نہ رکھ سکے، اور امت میں بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئیں۔

صحابہ اور تابعین تک یہی صورت حال قائم رہی۔ میرے علم کے مطابق عمر بن عبد العزیز اس امت میں آخری قابل ذکر شخص تھے جو اس راز کو جانتے تھے:

فَقَدْ ذَكَرَ ابْنُ القَيِّمِ فِي إِعْلَامِ الْمُوَقِّعِينَ عَنْ سَيِّدِنَا عُمَرَ وَابْنِ مَسْعُودٍ أَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِي100مَسْأَلَةٍ، وَذَكَرَ عَدَدٌ مِنَ الْمُؤَلِّفِينَ فِي تَارِيخِ التَّشْرِيعِ الإِسْلَامِي،السايس السبكي البربري، أَنَّ هُنَاكَ عِشْرِينَ مَسْأَلَةً اخْتَلَفَ فِيهَا الصَّحَابَةُ. لَمْ يَسْتَنْكِرْ أَحَدٌ هَذَا الْخِلَافَ، إِنَّمَا اعْتَبَرَهُ الْجَمِيعُ أَمْرًا طَبِيعِيًّا لَا يَقْطَعُ وُدًّا وَلَا يُفَرِّقُ صَفًّا. وَلِهَذَا أَيَّدَهُ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ، كَمَا يَذْكُرُ الشَّاطِبِيُّ فِي الاعْتِصَامِ، وَقَالَ: مَا أُحِبُّ أَنْ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ لَا يَخْتَلِفُونَ، لِأَنَّهُ لَوْ كَانَ قَوْلًا وَاحِدًا لَكَانَ النَّاسُ فِي ضِيقٍ، وَإِنَّهُمْ أَئِمَّةٌ يُقْتَدَى بِهِمْ. فَلَوْ أَخَذَ رَجُلٌ بِقَوْلِ أَحَدِهِمْ لَكَانَ سُنَّةً۔

ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان ایک سو مسائل میں باہم اختلاف تھا۔ تاریخ تشریع اسلامی نے مصنفین سے 20 مسائل شمار کیے ہیں جن میں صحابہ ایک دوسرے سے مختلف رائے رکھتے تھے۔ اس اختلاف کو کسی نے بھی برا نہیں مانا۔ تمام لوگوں نے اس کو طبعی معاملہ سمجھا جس سے نہ باہمی محبت ختم ہوئی اور نہ جماعتی انتشار پیدا ہوا۔ اسی لیے حضرت عمر بن عبد العزیز نے اس کی تائید فرمائی ہے۔ جیسا کہ شاطبی نے لکھا ہے، انھوں نے کہا: مجھے یہ پسند نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب اختلاف نہ کرتے۔ اس لیے کہ اگر صرف ایک ہی قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے۔ اور صحابہ ہی وہ رہنما لوگ ہیں جن کی پیروی کی جاتی ہے۔ ان کے اختلاف کی وجہ سے یہ ہے کہ آدمی ان کے جس قول کو بھی لے لے وہ سنت ہوگا۔

8 جون 1983

شیخ تاج الدین سبکی (وفات 1270ء) نے اپنی کتاب طبقات الشافعیہ الکبری میں لکھا ہے کہ امت کے ہر امام کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ لوگوں نے ان کو نشانۂ ملامت بنایا، اور اس کے نتیجہ میں ہلاک ہونے والے ہلاک ہوئے — مَا مِنْ إِمَامٍ إِلَّا وَقَدْ طُعِنَ فِيهِ طَاعِنُونَ، وَهَلَكَ فِيهِ هَالِكُونَ (طبقات الشافعیۃ الکبری للسبکی، جلد 2، صفحہ 9)۔

ایک چیز ہے اختلاف رائے اور دوسری چیز ہے طعن۔ دلیل کے ساتھ اختلاف رائے کرنا عین جائز بلکہ مفید ہے۔ مگر بے دلیل الزام لگانا اور شخصی عیب جوئی کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اس کا نام طعنہ زنی ہے۔ اور وہ بلاشبہ ایمان کے منافی ہے۔

ہر زمانہ کے امام (بڑی شخصیتوں) کے ساتھ طعنہ زنی کیوں کی گئی۔ اس کا واحد سبب حسد ہے۔ انسان اپنے سوا کسی اور کو بڑا ماننا نہیں چاہتا، اس لیے جب وہ کسی کو بڑا ہوتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کی عیب جوئی کرکے اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ جس سے وہ حسد کرتا ہے اس کو وہ عملی طور پر چھوٹا نہیں کر پاتا تو لفظوں میں اسے چھوٹا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ منفی نفسیات کے زیر اثر وہ بھول جاتا ہے کہ اس طرح وہ خود اپنے آپ کو چھوٹا کر رہا ہے، نہ کہ کسی دوسرے کو۔

5 جولائی 1983

حضرت عمر فاروق اور حضرت عبد اللہ بن مسعود کے درمیان سو سے زیادہ مسائل میں اختلاف رائے تھا (اعلام الموقعین لابن القیم، جلد 2، صفحہ 167)۔ دونوں اپنی اپنی رائے پر مصر بھی تھے۔ اس کے باوجود دونوں کے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ حضرت عمر فرماتے تھے کہ "ابن مسعود علم وفقہ کا خزانہ ہیں"— كُنَيْفٌ مُلِئَ فِقْهًا وعلْمًا (الطبقات الکبریٰ لابن سعد، جلد 2، صفحہ 297)۔ اور جب حضرت عمر شہید ہوئے تو حضرت عبد اللہ بن مسعود نے کہا: عمر اسلام کا مضبوط قلعہ تھے۔ جو اس میں داخل ہوتا وہ باہر نہ جاتا۔ جب وہ نہ رہے تو اسلام کے

قلعہ میں دراڑ پڑ گئی — إِنَّ عُمَرَ كَانَ لِلْإِسْلَامِ حِصْنًا حَصِينًا، يَدْخُلُ فِيهِ الْإِسْلَامُ وَلَا يَخْرُجُ مِنْهُ، فَلَمَّا قُتِلَ عُمَرُ انْثَلَمَ الْحِصْنُ (مصنف ابن ابی شیبہ، اثر نمبر 31977)۔

6 جولائی 1983

امام احمد بن حنبل خون نکلنے کو ناقض وضو سمجھتے تھے۔ دوسری طرف امام مالک اور سعید بن مسیب کا مسلک تھا کہ ایک شخص وضو کرے اور کسی وجہ سے اس کے بعد اس کے جسم سے خون نکل آئے تو وضو نہیں ٹوٹے گا، وہ اسی سابقہ وضو سے نماز پڑھ سکتا ہے۔ اس اختلاف کی روشنی میں امام احمد بن حنبل سے پوچھا گیا کہ "اگر وضو کے بعد امام کے جسم سے خون نکل آئے اور وہ دوبارہ وضو کے بغیر نماز پڑھائے تو کیا اس کے پیچھے نماز ادا کی جاسکتی ہے۔" امام احمد بن حنبل نے جواب دیا: میں مالک بن انس اور سعید بن مسیب کی اقتدا میں کیسے نماز ادا نہ کروں (المغنی لابن قدامۃ، جلد 1، صفحہ 247)۔

اسی طرح امام ابو یوسف خون نکلنے کی صورت میں وضو کے جاتے رہنے کے قائل تھے۔ ان کی موجودگی میں ہارون رشید نے نماز پڑھائی جب کہ اس نے وضو کے بعد پچھنا لگوایا تھا۔ مگر امام ابو یوسف نے اعتراض نہیں کیا۔ انھوں نے ہارون رشید کے پیچھے نماز ادا کر لی اور پھر اس کو نہیں دہرایا۔

اس سے اجتماعیت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ "امام" سے اگر ایسا فعل صادر ہو جو مقتدی کے نزدیک نماز کو فاسد کر دینے والا ہو، تب بھی مقتدیوں کو اپنی نیت کے مطابق اس کے پیچھے نماز ادا کرنا چاہیے۔ حتی کہ بعد کو اپنی نماز کو دہرانا بھی نہیں چاہیے۔ کیوں کہ نماز کا دہرانا بھی غیر ضروری خلفشار کا باعث ہو سکتا ہے۔

30 جولائی 1983

محمد بن اسحاق تابعی (150-85ھ) قدیم ترین سیرت نگار ہیں۔ ان کی اصل کتاب اگرچہ اب موجود نہیں، مگر ابن ہشام کی موجودہ سیرت میں ان کی پوری کتاب شامل ہے۔

ابن اسحاق علم الانساب کے بہت بڑے ماہر تھے۔ وہ امام مالک کے ہم عصر تھے۔ انہوں نے اپنی معلومات کے مطابق امام مالک کے بارے میں یہ کہہ دیا کہ وہ قبیلہ ذی اصبح کے آزاد کردہ غلاموں میں سے ہیں۔ مگر خود امام مالک اپنے آپ کو حمیر کی شاخ اصبح میں سے خیال کرتے تھے۔ اس اختلاف کی بنا پر دونوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔

امام مالک نے جب حدیث کی کتاب موطا تیار کی تو کہا جاتا ہے کہ محمد بن اسحاق نے کہا کہ اس کو میرے پاس لے آؤ، اس کا معالج میں ہوں — اِيتُونِي بِهِ فَأَنَا بَيْطَارُهُ۔ یہ بات امام مالک تک پہنچی تو وہ سخت برہم ہوئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ دجالوں میں سے ایک دجال ہے، یہود سے روایتیں نقل کرتا ہے — هَذَا دَجَّالٌ مِنَ الدَّجَّالِينَ، يَرْوِي عَنِ الْيَهُودِ) الثقات لابن حبان جلد 7، صفحہ 382۔ ابن حبان نے کتاب الثقات میں لکھا ہے کہ محدثین کو محمد بن اسحاق پر یہ اعتراض تھا کہ خیبر، قریظہ، نضیر کی جنگوں کے حالات وہ ان یہودیوں کی اولاد سے لے کر کتاب میں درج کرتے تھے، جن کے آباء واجداد مسلمان ہو گئے تھے۔ اور چونکہ یہ باتیں انہوں نے یہود سے سنی ہوں گی، اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا (الثقات لابن حبان جلد 7، صفحہ 383-382)۔

امام مالک نے ابن اسحاق کی تردید میں جو الفاظ کہے، وہ تنقید سے بھی آگے کے ہیں۔ مگر اتنی سخت تنقید کے باوجود کسی نے اس کو برا نہیں سمجھا۔ دور اول میں جب مسلمان زندہ تھے تو اس قسم کا اختلاف رائے یا تنقیدیں عام تھیں۔ موجودہ زمانہ کے مسلمان تنقید کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بالکل مردہ ہو چکے ہیں، ان کے اندر زندگی کی قسم کی کوئی چیز باقی نہیں۔

21 ستمبر 1983

حج کے ارکان حنابلہ کے نزدیک چار ہیں: الإِحْرَامُ، وَالْوُقُوفُ بِعَرَفَةَ، وَطَوَافُ الْإِفَاضَةِ، وَالسَّعْيُ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ شافعیہ کے نزدیک حج کے ارکان پانچ ہیں۔ چار

مندرجہ بالا اور پانچواں: الحَلْقُ وَالتَّقْصِيرُ۔ احناف کے نزدیک حج کے ارکان صرف دو ہیں: الْوُقُوفُ بِعَرَفَةَ، وَمُعْظَمُ طَوَافِ الْإِفَاضَةِ۔

یہ تو صرف بڑے اختلاف کی مثال ہے۔ ورنہ حج کی تفصیلات (اور اسی طرح دوسری عبادتوں کی تفصیلات) میں بے شمار اختلافات ہیں، جن کی گنتی کرنا بھی مشکل ہے۔ میرے نزدیک یہ سب غیر ضروری ہے۔ مثلاً مذکورہ فرق کو لیجیے۔ فقہا کے درمیان اگرچہ ارکانِ حج کی تعداد مقرر کرنے میں اختلاف ہے، تاہم اس میں سب متفق ہیں کہ مذکورہ ارکان میں سے کسی ایک رکن کا ترک بھی حج کو باطل کر دیتا ہے — كُلُّهُمْ مُتَّفِقُونَ عَلَى أَنَّ تَرْكَ رُكْنٍ مِنْ أَرْكَانِ الْحَجِّ يُبْطِلُ الْحَجَّ۔ جب حج کی صحیح ادائیگی کے لیے مذکورہ تمام ارکان پر عمل کرنا ضروری ہو تو پھر غیر ضروری فنی بحثیں نکال کر ان کی تعداد میں فرق کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

29 اکتوبر 1984

خلیفہ منصور عباسی نے حج کیا تو دیکھا کہ لوگ طرح طرح سے مراسم حج ادا کر رہے ہیں۔ اس نے چاہا کہ امام مالک کی کتاب کی بہت سی نقلیں تیار کر کے تمام بلاد وامصار میں روانہ کرے اور لوگوں کو ہدایت کر دے کہ وہ اسی کتاب (موطا) کے مطابق حج کے مراسم ادا کریں۔ خلیفہ نے جب اپنے اس ارادہ کا ذکر امام مالک سے کیا تو انھوں نے کہا: يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا تَفْعَلْ هَذَا (طبقات ابن سعد، جلد 7، صفحہ 573)۔ یعنی، اے امیر المومنین ایسا نہ کیجیے۔

اس کے بعد خلیفہ ہارون الرشید کا زمانہ آیا۔ اس نے بھی سفر حج میں مذکورہ منظر دیکھا تو مدینہ پہنچ کر دوبارہ امام مالک سے وہی بات کہی جو خلیفہ منصور نے کہی تھی۔ امام مالک نے دوبارہ جواب دیا: لَا تفعل فَإِنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اخْتَلَفُوا فِي الْفُرُوعِ وَتَفَرَّقُوا فِي الْبُلْدَانِ وَكُلٌّ مُصِيب (المیزان الکبریٰ للشعرانی، جلد 1، صفحہ 215)۔ یعنی، اے امیر المومنین ایسا مت کیجیے۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب فروعی امور میں مختلف تھے اور وہ شہروں میں پھیل گئے اور ان میں سے ہر ایک درست ہے۔

یہ محدثین کا نقطہ نظر تھا۔ وہ صحابہ کے اختلاف کو توسع پر محمول کرتے تھے۔ امام سفیان ثوری کا قول ہے: لَا تَقُولُوا اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي كَذَا اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي كَذَا قَدْ وَسَّعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى الْأُمَّةِ بِكَذَا (المیزان الکبریٰ للشعرانی، جلد 1، صفحہ 162)۔ یعنی، یہ نہ کہو کہ علما نے اس میں اختلاف کیا بلکہ یہ کہو کہ اس میں علما نے امت پر توسع کیا ہے۔

فروعی امور میں صحابہ کے اختلافات جن کو محدثین نے توسع قرار دیا تھا، انھیں اختلافات پر فقہا نے اپنی اپنی فقہ کی بنیاد رکھ دی۔ فقہا نے ان اختلافات کو لے کر یہ بحث شروع کردی کہ کون صحیح ہے اور کون غیر صحیح۔ کون اولیٰ ہے اور کون غیر اولیٰ۔ کون افضل ہے اور کون غیر افضل۔ یہ بحثیں یقینی طور پر بدعت تھیں۔ انھیں بحثوں کے نتیجہ میں امت کے اندر وہ اختلافات وانتشار پیدا ہوا جو پھر کبھی ختم نہ ہوا۔ فقہا اگر ان فروعی اختلافات کو محدثین کی طرح توسع کے خانہ میں رکھتے تو امت بے شمار لایعنی جھگڑوں سے بچ جاتی۔

14 جنوری 1985

انڈیا کے ایک عالم دین لندن کی ایک مسجد میں امام ہیں۔ وہ لندن جاتے ہوئے مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ "پاکستان کے فلاں عالم صاحب بہت بڑے عالم تھے۔ جزئیاتِ فقہ پر ان کی نظر جتنی وسیع تھی شاید ہی ہندو پاک میں کسی دوسرے عالم کی ہو"۔ گویا جزئیاتِ دین کے عالم ہونے کا نام عالم ہے، اساسات دین کا عالم ہونے کا نام عالم نہیں۔

فقہ جب ابتداءً بنی تو اساساتِ دین کے مطالعہ کے لیے نہیں بنی بلکہ مسائل دین کے مطالعہ کے لیے بنی۔ اس طرح فقہ پر جزئیاتی ذہن غالب آ گیا۔ اسی فقہ پر ہمارے موجودہ مدارس کی بنیاد قائم ہے۔ ہمارے مدارس میں جزئیاتی مسائل پر زبردست بحثیں ہوتی ہیں۔ حتی کہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ جزئیاتی مسائل کے عالم ہونے کا نام عالم ہے۔ اس طریقۂ تعلیم نے ملت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ موجودہ زمانے کے دینی اختلافات کی

سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے مدارس کا تعلیمی نظام فقہ پر قائم ہے۔ اگر مدارس کا نظام قرآن وحدیث پر قائم کیا جائے تو اس قسم کے جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔

2 مارچ 1985

حُمید بن عبدالرحمن کہتے ہیں کہ میں یزید کی ولی عہدی کے وقت حضرت بُشیر کے پاس گیا، جو صحابہ میں سے تھے۔ میں نے ان سے یزید کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے کہا۔ انھوں نے کہا: يَقُولُونَ: إِنَّما يَزِيدُ لَيسَ بِخَيْرٍ لأُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَأَنَا أَقُولُ ذَلِكَ، وَلَكِنْ لأَنْ يَجْمَعَ اللّٰهُ أُمَّةَ مُحَمَّدٍ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْ أَنْ تَفْتَرِقَ (تاریخ الاسلام للذہبی، جلد 4، صفحہ 87)۔ یعنی، لوگ کہتے ہیں کہ یزید امت محمد کے بہتر لوگوں میں سے نہیں ہے، اور میں بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن امتِ محمدی کا اتفاق سے رہنا، مجھے افتراق کی بنسبت زیادہ پسند ہے۔

جس وقت امیر معاویہ نے اپنے بیٹے یزید کو ولی عہد بنایا اس وقت ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام زندہ موجود تھے۔ مثلاً حسین بن علی، عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن عمر، عبد اللہ بن زبیر، اور عبدالرحمن بن ابی بکر اور دوسرے بہت سے جلیل القدر افراد ملت کے اندر موجود تھے۔ ایسی حالت میں یزید کو خلیفہ بنانا سخت قابل اعتراض ہوسکتا تھا۔ مگر تمام صحابہ نے اس پر سکوت اختیار کیا۔ حضرت حسین کے سوا کسی نے بھی یزید کے خلاف کوئی مہم نہیں چلائی۔ اصحابِ رسول کی یہ خاموشی یقینی طور پر بزدلی کی بنا پر نہ تھی، بلکہ اسلامی حکمت کی بنا پر تھی۔

7 مارچ 1985

ایک مضمون نظر سے گزرا۔ یہ مضمون مصافحہ کے شرعی طریقہ کے بارے میں ہے۔ اس میں "احادیث نبوی" کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کرنا افضل ہے۔ تاہم ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ ایک

حنفی عالم کا مضمون ہے۔ دوسری طرف اہلِ حدیث علما یہ ثابت کرتے ہیں کہ ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنا افضل ہے، اوران کے پاس بھی حدیث موجود ہے۔

اس طرح کے امور میں افضل اور غیر افضل کی بحث چھیڑنا سراسر خلاف سنت ہے۔ جس معاملے میں بھی ایک سے زیادہ طریقہ حدیثوں میں موجود ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں توسع ہے۔ یعنی یہ بھی درست ہے اور وہ بھی درست ہے۔ ایسے تمام امور میں دونوں ثابت شدہ طریقوں کو درست قرار دینا چاہیے، نہ کہ ایک کو افضل اور دوسرے کو غیر افضل ثابت کیا جائے۔

اسی لیے حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ میں یہ پسند نہیں کرتا ہوں کہ اصحابِ رسول اختلاف نہ کرتے۔ کیوں کہ اگر صرف ایک قول ہوتا تو لوگ تنگی میں پڑ جاتے۔ وہ لوگ نمونہ تھے۔ ان کی اقتدا کی جاتی ہے، اگر کوئی آدمی ان میں سے کسی کے بھی قول کو اختیار کرلے تو وہ آسانی میں ہے: مَا أُحِبُّ أَنَّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَخْتَلِفُوا، لِأَنَّهُ لَوْ كَانَ قَوْلًا وَاحِدًا كَانَ النَّاسُ فِي ضِيقٍ وَإِنَّهُمْ أَئِمَّةٌ يُقْتَدَى بِهِمْ وَلَوْ أَخَذَ رَجُلٌ بِقَوْلِ أَحَدِهِمْ كَانَ فِي سَعَةٍ (جامع بيان العلم وفضله، جلد 2، حدیث نمبر 1689)۔

بعد کے لوگوں میں جو فقہی اختلافات ہوئے ان سب کا ابتدائی سبب صحابہ کے یہاں موجود تھا۔ مگر فرق یہ ہے کہ صحابہ کا ذہن ان اختلافات میں یہ تھا کہ یہ بھی درست ہے اور وہ بھی درست۔ مگر بعد کے لوگوں نے یہ بدعت کی کہ ان اختلافات میں افضل اور غیر افضل تلاش کرنے لگے۔ بس یہیں سے شدت پیدا ہوئی، اور اختلاف آخر کار نااتفاقی بن گیا۔ اختلافی امور میں توسع کا ذہن ہو تو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ مگر جب افضل اور غیر افضل کی بحث چھیڑ دی جائے تو وہیں سے تباہ کن اختلاف کا آغاز ہو جاتا ہے۔

13 مارچ 1985

جب کوئی خلاف مزاج بات پیش آئے تو اُس کے مقابلہ میں آدمی کی روش کی دو مختلف

صورتیں ہوتی ہیں۔ایک جذباتی ردعمل کا طریقہ،اور دوسرا غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ۔جو لوگ منفی ردعمل کی بنیاد پر جمع ہوتے ہیں، ان کی مثال بالکل جوار بھاٹا(tide) کی ہے۔جوار بھاٹا جتنی تیزی سے اوپر اٹھتا ہے،اسی تیزی سے وہ نیچے بھی اتر جاتا ہے۔

یہی معاملہ ان لوگوں کا ہے جو کسی مخالفانہ نعرے کی بنیاد پر اکٹھا ہوں۔کیوں کہ اس طرح اکٹھا ہونے والے لوگ منفی سوچ رکھتے ہیں۔وہ اگر اقتدار پر قبضہ پالیں تب بھی کوئی مثبت کام نہیں کرسکتے۔وہ جتنی تیزی سے جمع ہوتے ہیں اتنی ہی تیزی سے دوبارہ منتشر ہوجاتے ہیں۔اس قسم کا منفی اتحاد مسلمانوں میں بھی کثرت سے دیکھا جاسکتا ہے۔جذباتی ردعمل عین وہی چیز ہے جس کو میڈیکل اصطلاح میں الرجی (allergy) کہا جاتا ہے۔الرجی کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے کہ الرجی نام ہے معتدل حالات میں غیر معتدل ردعمل کا:

Abnormal reaction to normal things.

مثلاً مخالفانہ نعرہ کوسُن کر مشتعل ہوجانا،توہین کے کسی معاملہ پر بھڑک اُٹھنا، اپنی سوچ کے خلاف سوچ کو برداشت نہ کرسکنا، یہ سب جذباتی ردِعمل کی صورتیں ہیں۔ایسے لوگ ہمیشہ دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدد میں پڑے رہتے ہیں۔وہ زندگی کے مثبت اور تعمیری رخ کا تجربہ کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا طریقہ غیر جذباتی ردعمل کا طریقہ ہے۔اسی کو قرآن میں ہجر جمیل کہا گیا ہے(73:10)۔یعنی جب اپنے مزاج کے خلاف کوئی بات پیش آئے تو مشتعل نہ ہو کر ٹھنڈے ذہن کے ساتھ اس پر غور کرنا، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت معتدل انداز میں تعمیری اقدام کرنا۔

19 مارچ 1985

صحابی رسول بشیر بن خصاصیہ کا واقعہ ہے کہ لوگوں نے ان سے کہا کہ سرکاری عمال صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتے ہیں— إِنَّ أَهْلَ الصَّدَقَةِ يَعْتَدُونَ عَلَيْنَا، کیا ہم اپنے مال میں سے زیادتی کے بقدر چھپالیں، بشیر بن خصاصیہ نے کہا: نہیں (سنن ابو داؤد،

حدیث نمبر 1586)۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص کی ایک روایت میں ہے: ادْفَعُوهَا إِلَيْهِمْ مَا صَلَّوُا الْخَمْسَ (المعجم الاوسط للطبرانی، حدیث نمبر 343)۔ یعنی، جب تک وہ پانچ نمازیں پڑھتے ہیں، زکوٰۃ انھیں دیتے رہو۔

بنوامیہ کے زمانہ میں جب نظامِ خلافت بدل گیا اور حکام ظلم وتشدد پر اتر آئے، تو بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں۔ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انھیں کو دینی چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کس کو دیں۔ کہا: وقت کے حاکموں کو۔ انھوں نے کہا: وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں پر خرچ کرڈالتے ہیں (إِذًا يَتَّخِذُونَ بِهَا ثِيَابًا وَطِيبًا)۔ ابن عمر نے کہا: وَإِنِ اتَّخَذُوا ثِيَابًا وَطِيبًا (مصنف ابن ابی شیبہ، حدیث نمبر 10191)۔ یعنی، اگرچہ وہ کپڑے اور عطر لے لیں (پھر بھی تم انھیں کو زکوٰۃ دو)۔

صحابہ نے یہ جو کہا، یہ کسی بزدلی کی وجہ سے نہیں کہا۔ درحقیقت یہی اسلام کا حکم ہے۔ مسلمان کی قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت کرنا اسلام میں جائز نہیں۔ اگر مسلم حکمرانوں میں خرابی نظر آئے تو صرف یہ حکم ہے کہ ان کو دردمندی اور خیر خواہی کے ساتھ سمجھاؤ۔ موجودہ زمانہ کی طرح ایجی ٹیشن چلانا، ان کے خلاف عوامی ہنگامے کرنا سراسر ناجائز فعل ہے۔ جو لوگ اسلام کے نام پر اس قسم کی سیاست چلا رہے ہیں، وہ بلاشبہ مجرم ہیں۔

21 ستمبر 1985

اجتماعی زندگی میں وہ انسان بہت قیمتی ہوتا ہے جو بلا شرط کسی مشن کا ساتھ دے۔ جو ساتھ دینے کے بعد مسائل کا جنگل نہ کھڑا کرے۔ صحابہ کرام نے تاریخ کا سب سے بڑا انقلاب برپا کیا۔ ان کی تحریکی صفات کو اگر ایک لفظ میں بتانا ہو تو کہا جا سکتا ہے — وہ بے مسئلہ لوگ (no-problem person) تھے۔ وہ اختلاف کو بھول کر مشن سے وابستہ

رہتے تھے۔ وہ ذاتی شکایت کو نظر انداز کرکے قیادت کے حکم کی پابندی کرتے تھے۔ وہ انفرادی احساسات کو کچل کر اجتماعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ بے مسئلہ انسان ہوں، وہی دنیا کا مسئلہ حل کرتے ہیں۔ جو لوگ خود مسائل میں مبتلا ہو جائیں، وہ صرف دنیا کے مسائل میں اضافہ کرتے ہیں، وہ کسی بھی درجے میں دنیا کے مسائل کو کم نہیں کرتے۔

27 جنوری 1986

پروفیسر علی اشرف (جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی) سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا: میں ہر مہینہ باقاعدہ الرسالہ پڑھتا ہوں۔ اس سے پہلے 1980ء میں آپ کی تمام کتابیں خرید کر پڑھ چکا ہوں۔ بعض کتابیں ایک سے زیادہ بار بھی پڑھی ہیں۔

انہوں نے کہا کہ آپ نے اپنی تحریروں میں جو فکر پیش کیا ہے اس سے مجھے صد فی صد اتفاق ہے۔ اب تک کے مطالعے میں مجھے آپ کی صرف ایک بات کھٹکی ہے اور وہ آپ کا وہ مضمون ہے، جس کا عنوان ہے: حسنین: تاریخ کے دو علامتی کردار (ظہور اسلام، صفحہ 90)۔

اس مضمون کو پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آپ یہ تلقین کر رہے ہیں کہ انسان کو برائی کے مقابلے میں کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ اس کو برائی کے مقابلے میں اپنا سر جھکا کر بیٹھ جانا چاہیے۔

میں نے کہا کہ مجھے برائی کے خلاف اقدام کرنے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ ایسے اقدام پر اعتراض ہے جب کہ اقدام سے نقصان ہو جائے مگر برائی وہیں کی وہیں باقی رہے۔

میں نے کہا کہ میرا اختلاف برائی کے خلاف اقدام سے نہیں ہے بلکہ میرا اختلاف ایسا اقدام سے ہے جو نتیجہ خیز ہونے والا نہ ہو۔ قبل از وقت اقدام یا تیاری کے بغیر اقدام ہمیشہ بے فائدہ ہوتا ہے۔ اور اقدام کی یہی وہ قسم ہے جس سے مجھے اختلاف ہے۔ برائی کے خلاف عملی اقدام صرف اس وقت کرنا چاہیے جب کہ اقدام کے ضروری اسباب فراہم ہو گئے ہوں۔ بصورتِ دیگر برائی کے خلاف نصیحت اور تلقین کی سطح پر کام کیا جانا چاہیے، نہ کہ

عملی اقدام کی سطح پر۔ پروفیسر علی اشرف صاحب نے میری اس وضاحت سے اتفاق کیا۔

26 فروری 1986

ڈاکٹر عبد الاحد صاحب (بنگلور) ملنے کے لیے تشریف لائے۔ وہ الرسالہ کے قاری بھی ہیں اور دس پرچہ منگا کر تقسیم کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ الرسالہ کے بعض قارئین کا کہنا ہے کہ الرسالہ میں تنقید نہیں رہنا چاہیے۔

میں نے کہا کہ تنقید تو کسی قوم کی زندگی کی علامت ہے۔ صحابہ کرام عام طور پر ایک دوسرے کے خلاف سخت تنقید کرتے تھے۔ مثلاً حضرت ابن عمر نے ایک بار حضرت ابوہریرہ کے بارے میں کہا: كَذَبَ أَبُو هُرَيْرَةَ (قبول الاخبار ومعرفة الرجال لابی القاسم بلخی، جلد 1، صفحہ 184)۔ یعنی، ابوہریرہ نے جھوٹ کہا۔ اس جملے کو اگر خالص لفظی معنیٰ میں لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ابوہریرہ ساقط الروایۃ ہیں۔ کیوں کہ جو شخص جھوٹ بولے اس سے روایت نہیں کی جاتی۔ مگر یہ صرف شدت کلام ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام ایک دوسرے کے خلاف تنقید کرنے میں کتنے شدید الفاظ استعمال کرتے تھے۔

حدیث میں آیا ہے: اِخْتِلَافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ، حدیث نمبر 39)۔ اس حدیث میں لوگ اختلاف کو انتشار کے معنیٰ میں لے لیتے ہیں۔ اس لیے انھیں اس کی تاویل میں سخت مشکل پیش آتی ہے۔ حتیٰ کہ کچھ لوگ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سند کے اعتبار سے یہ روایت لینے کے قابل نہیں ہے۔ مگر اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ اس حدیث میں اختلاف کا لفظ انتشار کے معنیٰ میں نہیں ہے۔ بلکہ اختلافِ رائے (dissent) کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب ہے، ایک رائے کی جگہ دوسری رائے کو دلیل کے ذریعے پیش کرنا ہے، نہ کہ مختلف گروہوں میں بٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اختلاف رائے کی فضا کا ہونا کسی قوم کے لیے رحمت ہے۔ جس قوم میں اختلاف رائے ہوگا اس کے اندر جمود نہیں ہوگا۔ اگر ان کے اندر کوئی غلطی واقع ہوگی تو

وہ بذریعہ تنقید اپنی اصلاح کرتی رہے گی۔ کسی غلط روش کا برقرار رہنا اس کے اندر ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے اندر یہ ذہن ہوگا کہ چیزوں کو ان کے جوہر (merit) کی بنیاد پر اہمیت دی جائے، نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔ موجودہ دور میں سائنس کی ترقی اسی اختلاف کی بنیاد پر ہوئی ہے۔ سائنس دانوں کے درمیان اختلاف رائے اگر ممنوع ہوتا تو کبھی سائنس ترقی نہ کرتی۔

26 اپریل 1986

مولانا کبیر الدین فاران (ہماچل پردیش) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ذہین آدمی ہیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ میرے اندر تنقیدی مزاج ہے۔ مجھے کسی رائے سے اختلاف ہوتا ہے تو میں فوراً اس کا اظہار کر دیتا ہوں۔

میں نے کہا کہ یہ مزاج بذات خود صحیح مزاج ہے۔ مگر مسلمان عام طور پر ''اختلافِ رائے'' اور ''اختلافِ امر'' میں فرق نہیں کرتے۔ اختلافِ رائے یعنی سوچ کا فرق اور اختلافِ امر یعنی عملی مخالفت۔ میرے نزدیک اختلافِ رائے ایک جائز عمل ہے، مگر اختلافِ امر بالکل ناجائز ہے۔ اختلافِ رائے اور اختلافِ امر میں فرق کی مثالیں اصحابِ رسول کے یہاں بھی موجود ہیں۔ حضرت عثمان کے زمانے میں صحابیِ رسول ابوذر رضی اللہ عنہ حج کے لیے گئے۔ وہاں ان کو معلوم ہوا کہ خلیفہ ثالث عثمان رضی اللہ عنہ نے حج کے دوران چار رکعتیں پڑھی ہے، قصر نہیں کیا۔ ابوذر رضی اللہ عنہ نے سخت الفاظ میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کہا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج میں نماز پڑھ چکا ہوں۔ آپ نے صرف دو رکعت نماز پڑھی۔ پھر ابوبکر وعمر کے ساتھ بھی میں نے دو رکعت نماز پڑھی۔ اس کے بعد ابوذر رضی اللہ عنہ اٹھے اور چار رکعت نماز ادا کی۔ لوگوں نے کہا: آپ نے امیر المومنین پر چار رکعت کے لیے اعتراض کیا اور خود وہی کر رہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا: الْخِلَافُ أَشَدُّ (مسند احمد، حدیث نمبر 21460)۔ یعنی عملی مخالفت اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔

اسی قسم کا واقعہ مشہور صحابیِ رسول عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بھی ہے۔ انھوں نے

عثمان رضی اللہ عنہ کے منیٰ میں چار رکعت پڑھنے پر بہت ہی سخت الفاظ میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور پھر خود چار رکعت پڑھی ۔ جب پوچھا گیا تو فرمایا: اختلاف کرنا برا ہے (الْخِلاَفُ شَرٌّ) سنن ابوداؤد، حدیث نمبر 1960۔ اس کے برعکس، مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ جب انہیں رائے کے معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ امر اور نظم (system) سے اختلاف کرنا بھی ان کے لیے درست ہے۔ اسی کمزوری کی وجہ سے مسلمانوں سے کوئی متحدہ کام نہیں ہو پاتا۔

حدیث "اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ" (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39) کا مطلب بھی یہی ہے۔ یعنی میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ اس حدیث میں اختلافِ رائے کے اظہار کو رحمت کہا گیا ہے، نہ کہ عملی اختلاف وانتشار کو۔ افراد کو ہر کام میں اجتماعی نظم کا پابند رہنا چاہیے۔ البتہ اختلافِ رائے کو مثبت طریقے سے ظاہر کرنے کے معاملہ میں ان پر کوئی پابندی نہیں۔ انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ کسی بھی شخص سے رائے کے معاملہ میں اختلاف کر سکتے ہیں خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا۔

23 جون 1986

مجھے اپنی زندگی میں بار بار ایک ہی تجربہ ہوا ہے۔ اس تجربہ میں ابھی تک کوئی استثنا ثابت نہ ہو سکا۔ مزید یہ کہ تجربات کی اس لمبی مدت میں اکابر کے نام بھی موجود ہیں اور اصاغر کے نام بھی۔

وہ تجربہ یہ ہے کہ ایک شخص ابتدائی تعلقات میں میرے ساتھ خوش اخلاقی برتتا ہے، وہ بڑے بڑے الفاظ میں میرا اعتراف کرتا ہے، وہ میرے مشن میں بھرپور ساتھ دینے کا اقرار کرتا ہے۔ اس کے بعد جب تعلقات بڑھتے ہیں اور کوئی اختلافی بات سامنے آتی ہے یا کسی وجہ سے اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہی آدمی دوسرا آدمی بن جاتا ہے۔

میری تعریف کرنے والا میری برائی کرنے لگتا ہے۔ میرا ساتھ دینے والا میرا دشمن بن جاتا ہے۔ جو شخص پہلے میرے مقابلے میں خوش اخلاقی کا پیکر تھا، اب وہ میرے

مقابلہ میں بداخلاقی کا مجسمہ نظر آنے لگتا ہے۔ حتیٰ کہ میری تخریب کاری اس کا محبوب مشغلہ بن جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان اخلاق کے اعتبار سے عین اس مقام پر ہیں جہاں پہلے یہود تھے۔ معمول کے حالات میں اچھا بنے رہنا اور غیر معمول والے حالات پیدا ہوتے ہی کچھ سے کچھ ہو جانا، یہ یقینی طور پر یہودیت ہے۔ اور یہی یہودیت ہے جس پر آج کے مسلمان قائم ہیں۔

مومن و مسلم وہ ہے جو اللہ سے ڈرے، اور اللہ سے ڈرنے والا آدمی ایسا نہیں کرسکتا کہ وہ دوستی کے وقت اچھا بنا رہے اور اختلاف کے وقت تخریب کاری کا نمونہ پیش کرے۔

24 جنوری 1989

جمادی الاولی (1409ھ) میں کویت میں ایک نہایت اہم اجتماع ہوا۔ اس کی کاردائیاں کویت کے ہلٹن ہوٹل میں انجام پائیں۔ اس میں عرب سربراہ اور مسلم حکومتوں کے نمائندے شریک تھے۔ پاکستان سے شمس الدین پیرزادہ نے شرکت کی جن کی حیثیت وزیر کی ہے۔ اس اجتماع میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ اعلیٰ پیمانہ پر مجمع الفقہ الاسلامی قائم کی جائے جس کا ہیڈ کوارٹر جدہ ہو۔

اعلان کردہ مقاصد کے اعتبار سے یہ ایک نہایت اہم ادارہ ہے۔ مگر یقینی ہے کہ اس کا کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ اس کے ''المادۃ السابعۃ'' کے مطابق، مجمع الفقہ الاسلامی میں المؤتمر الاسلامی سے تعلق رکھنے والی ہر مسلم مملکت کا ایک ممبر ہوگا اور اس ممبر کا تعین متعلقہ حکومت کرے گی — يَكُونُ لِكُلِّ دَوْلَةٍ مِنْ دُوَلِ مُنَظَّمَةِ الْمُؤْتَمَرِ الْإِسْلَامِيِّ عُضْوٌ عَامِلٌ فِي الْمَجْمَعِ وَيَتِمُّ تَعْيِينُهُ مِنْ قِبَلِ دَوْلَتِهِ (صفحہ 121)۔

جو ادارہ مسلم حکومتوں کے نامزد کردہ افراد پر مشتمل ہو، وہ یقینی طور پر ایک رسمی ادارہ بن کر رہ جائے گا، وہ کوئی زندہ کام نہیں کرسکتا۔ مگر دوسری مشکل یہ ہے کہ مسلمانوں کے جو غیر

حکومتی ادارے ہیں وہ اختلافات کا شکار ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے اجتماعی ادارے دو میں سے کسی ایک کمزوری میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ حکومت کی سر پرستی میں ہیں تو وہ رسمی ہو کر رہ گئے ہیں اور اگر وہ آزاد ہیں تو اندرونی اختلافات کا شکار ہیں۔

2 مارچ 1989

ایک صاحب نے کہا کہ اس وقت امت کی اصل ضرورت اتحاد ہے، اور اس کے لیے آپ کچھ نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ آپ کے خیال سے کیا کرنا چاہیے۔ اس کے لیے انھوں نے کہا کہ تمام مسلم اکابر کو جمع کیجیے اور اتحاد کے مسئلہ پر لوگوں کو توجہ دلائیے۔ میں نے کہا کہ کانفرنسوں سے اگر اتحاد قائم ہوسکتا تو اب تک اسے قائم ہو جانا چاہیے تھا کیوں کہ ملت کے اندر اتحاد کانفرنسیں اتنی زیادہ ہو چکی ہیں کہ ان کی گنتی نہیں کی جا سکتی۔

انھوں نے کہا کہ پھر اتحاد کی تدبیر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اتحاد کے لیے اتحاد کا شعور پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت اصل مسئلہ یہ ہے کہ ملت کے اندر وہ استعداد موجود نہیں جس پر اتحاد کی تعمیر ہوتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ استعداد سے آپ کی مراد کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سے مراد ہے ملت کے افراد کے اندر اس شعور کی موجودگی کہ اتحاد اس وقت آتا ہے جب کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا راز جان گئے ہوں۔ صحابہ کرام بلاشبہ اتحاد کی غیر معمولی مثال ہیں۔ مگر ان کا اتحاد اختلاف کے باوجود متحد ہونے کی زمین ہی پر قائم ہوا تھا۔

میں نے کہا کہ حضرت عمر نے خلیفۂ اول ابوبکر صدیق کا ایک فرمان برسرعام پھاڑ کر پھینک دیا (فضائل الصحابہ لاحمد بن حنبل، حدیث نمبر 383)۔ مگر وہاں کوئی کہرام نہیں مچا۔ آج اگر کوئی شخص کسی بڑے دینی ادارہ میں جائے اور وہاں کے اکابر کی ایک کتاب پھاڑ کر پھینک دے تو وہاں ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ آج اگر کوئی شخص ایک اسلامی ادارہ میں ایسا کرے تو وہ وہاں سے نکال دیا جائے گا۔

اس تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے اندر اتحاد کی استعداد تھی، آج کے مسلمانوں میں اس کی استعداد نہیں۔ ایسی حالت میں پہلا کام ذہنی استعداد پیدا کرنا ہے، نہ کہ کوئی جذباتی اشو کھڑا کرکے بھیڑ جمع کرنا۔ بھیڑ اور اتحاد کے فرق کو نہ جاننے والے ہی بھیڑ پر خوش ہو سکتے ہیں۔

16 مارچ 1989

ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اس دنیا کا نظام "باوجود" کے اصول پر قائم ہے۔ یہاں برے اخلاق کا جواب اچھے اخلاق سے دینے کا نام اخلاق ہے۔ یہاں اشتعال انگیزی کے باوجود مشتعل نہ ہونے کا نام صبر ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو رکاوٹوں کے باوجود کامیابی کا راستہ نکالنا پڑتا ہے۔ یہاں اتحاد اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا راز جان گئے ہوں۔

14 مئی 1989

دھولیہ (مہاراشٹر) میں مارچ 1989 میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ دھولیہ کے دو آدمیوں نے بتایا کہ ہولی کے موقع پر ہندوؤں نے مسجد کی دیوار پر پانی پھینکا تھا۔ مگر جب دونوں فرقوں میں جھگڑا ہو گیا تو مسلمانوں نے معاملہ کو بھیانک بنانے کے لیے خود رات کے وقت مسجد کی دیواروں پر رنگ ڈال کر اس کو رنگین کر دیا تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ ہندوؤں نے مسجد کی دیوار پر ہولی کا رنگ ڈالا تھا۔

میں نے کہا کہ میں اپنی رپورٹ میں یہ بات لکھ دیتا ہوں۔ مگر دھولیہ والوں نے سخت اختلاف کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہماری تمام رپورٹیں، تمام کاغذات اور مقدمہ کے بیانات، سب میں یہی بتایا گیا ہے کہ ہندوؤں نے رنگ پھینکا۔ اب اگر آپ لکھ دیں کہ ہندوؤں نے پانی پھینکا تھا اور مسلمانوں نے اپنی طرف سے رنگ ڈال دیا تو ہمارا کیس بگڑ جائے گا۔

میں نے کہا کہ ہندستانی مسلمانوں کا یہی مزاج ہے جس نے انھیں خدا کی مدد سے محروم کررکھا ہے اور وہ مسلسل بربادی کی طرف چلے جارہے ہیں۔ میں نے کہا کہ خدا کی مدد ہمیشہ سچ پر آتی ہے۔ جھوٹ پر کبھی خدا کی مدد نہیں آتی، آپ لوگ جھوٹ پر خدا کی مدد اتارنا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ آج تک آپ کے اوپر نہیں اتری۔

12 جون 1989

موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ اتحاد کی باتیں کرتے ہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان سب سے زیادہ اختلاف کی حالت میں مبتلا ہیں۔ اس کے سبب پر غور کرتے ہوئے میری زبان سے نکلا مسلمان اتحادیوں کے ساتھ متحد ہو کر رہنا چاہتے ہیں۔ حالاں کہ اختلافیوں کے ساتھ متحد ہو کر رہنے کا نام اتحاد ہے۔ اتحاد کی یہی وہ اہم ترین حقیقت ہے جس سے ہمارے اصاغر بھی ناآشنا ہیں اور ہمارے اکابر بھی ناآشنا۔

16 جون 1989

مکہ سے ایک عربی ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام الرابطۃ ہے۔ اس کے شمارہ ذوالقعدہ 1409ھ میں مدینہ کا مسجد نبوی کے امام الشیخ علی عبد الرحمٰن الحذیفی کا ایک خطبہ نقل کیا گیا ہے جو انھوں نے وہاں کی مسجد نبوی میں دیا تھا۔ انھوں نے کہا: يَا أُمَّةَ الْإِسْلَامِ، لِمَاذَا الِاخْتِلَافُ وَالدِّينُ وَاحِدٌ، إِلَى مَتَى الشِّقَاقُ وَالْأُمَّةُ وَاحِدَةٌ، إِلَى مَتَى التَّفَرُّقُ وَأَنْتُمْ تُدْرِكُونَ مَا فِيهِ مِنَ الضَّرَرِ وَالْفَسَادِ (صفحہ 6)۔ یعنی، اے مسلم امت باہمی اختلاف کیوں، جب کہ دین ایک ہے۔ باہمی جھگڑے کب تک، جب کہ امت ایک ہے۔ باہمی تفریق کب تک حالاں کہ تم جانتے ہو کہ اس میں کتنا زیادہ نقصان اور بگاڑ ہے۔

مسلمانوں کے اندر اتحاد واتفاق کے لیے اس قسم کی جذباتی اپیلیں سو سال سے بھی زیادہ عرصہ سے کی جارہی ہیں۔ مگر عملی صورت حال آج اس سے بھی زیادہ خراب ہے جتنا کہ سو سال یا

پچاس سال پہلے تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر آدمی یہ فرض کر کے بول رہا ہے کہ امت اسلام واقعہ میں موجود ہے۔ جب کہ خود امت اسلام سرے سے موجود نہیں۔ مسلمانوں کی موجودہ بھیڑ کو امت اسلام سمجھنا ایسا ہی ہے جیسے کسی قدیم شہر کے کھنڈروں کو دیکھ کر سمجھنا کہ خود وہ شہر زندہ حالت میں موجود ہے۔ آج سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دوبارہ ''امت اسلام'' وجود میں لائی جائے۔ اس کے بعد ہی اگلے مرحلہ کا کوئی کام کیا جاسکتا ہے۔

11 جولائی 1989

تفسیر قرطبی فقہی انداز کی تفسیر ہے۔ قرطبی امام مالک کے مسلک کے تھے۔ تاہم انھوں نے بعض مقامات پر امام مالک سے اختلاف کیا ہے۔ مثلاً حج کے موقع پر جورمی جمار کیا جاتا ہے، اس کے متعلق حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ چھوٹی کنکریاں (چنے کی دال کے برابر) ماری جاسکتی ہیں (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3029)۔ اس سلسلہ میں امام مالک نے کہا ہے کہ اس سے بڑی کنکری مجھ کو زیادہ محبوب ہے — أَكْبَرُ مِنْ ذَلِكَ أَحَبُّ إِلَيَّ۔ قرطبی نے اس پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ امام مالک کے اس قول کے کوئی معنی نہیں — وَلَا مَعْنَى لِقَوْلِ مَالِكٍ (تفسیر القرطبی، جلد 3، صفحہ 11)۔ اس تنقید میں استخفاف کا عنصر شامل ہے۔ مگر کسی نے اس کو برا نہیں مانا۔ موجودہ زمانہ میں تو لوگ تنقید کے بارے میں اتنے حساس ہو گئے ہیں کہ خالص علمی اور تجزیاتی تنقید بھی انھیں گوارا نہیں۔

15 اگست 1989

آرسی زیز (R.C. Zaehner) ایک آکسفورڈ اسکالر ہیں۔ انھوں نے مختلف مذاہب کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے جو 1970 میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام ہے۔ ہم آہنگ ناموافقت:

Concordant Discord

اس کتاب کے مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم مختلف مذاہب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان میں بہت سے اختلافات نظر آتے ہیں لیکن زیادہ گہرائی کے ساتھ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بظاہر بے آہنگی (disharmony) میں آہنگ (harmony) موجود ہے۔

بہت سے سیکولر علما (مثلاً ڈاکٹر بھگوان داس) نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ ثابت کریں کہ تمام مذاہب ظاہری اختلافات کے باوجود ایک ہیں۔ وہ اس طرح اہل مذاہب کے درمیان ٹکراؤ کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ مگر میں اس کو بے فائدہ سمجھتا ہوں۔ اہل مذاہب کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ تمام مذاہب کو ایک ثابت کیا جائے۔ اس کی واحد کارگر تدبیر یہ ہے کہ اہل مذاہب کے اندر رواداری (tolerance) کا مزاج پیدا کیا جائے یعنی اختلاف کو برداشت کرتے ہوئے ایک دوسرے کا احترام کرنا اور اختلاف کا اظہار سنجیدہ علمی دائرہ میں کرنا، نہ کہ مناظرہ اور تصادم کے دائرہ میں۔ اس دنیا میں امن قائم کرنے کا راز اختلاف کو برداشت کرنا ہے، نہ کہ اختلاف کو ختم کرنا۔ اس معاملہ میں دوسری کوئی صورت سرے سے ممکن ہی نہیں۔

20 ستمبر 1989

جھینگا مچھلی کو عربی میں اِربیان یا دود کہتے ہیں۔ کسی نادان نے مفتی صاحبان سے فتوی پوچھا کہ جھینگا حرام ہے یا حلال۔ مفتی کو کہنا چاہیے تھا کہ اس قسم کے سوال نہ کرو جب قرآن میں کہہ دیا گیا ہے: أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ (5:96)۔ یعنی، تمہارے لیے دریا کا شکار اور اس کا کھانا جائز کیا گیا۔ ایسی حالت میں اس قسم کا سوال غیر ضروری ہے۔ مگر مفتی صاحبان نے اس نادانی پر یہ اضافہ کیا کہ فوراً اس کے حلال وحرام کا فتوی دینے لگے۔

بعد کے کچھ علما نے دیکھا کہ اس معاملہ میں اصحاب فقہ کے درمیان اختلاف ہے تو انھوں نے تیسری نادانی کی۔ انھوں نے کہا کہ چوں کہ جھینگا کچھ علما کے نزدیک حرام ہے،

اور کچھ دوسرے علما اس کو حلال بتاتے ہیں، کیوں کہ اس کو مچھلی کہا جاتا ہے، اس لیے احتیاط یہ کہ اس کو نہ کھایا جائے— الدَّوْدُ الَّذِي يُقَالُ لَهُ جهينگا، حَرَامٌ عِنْدَ بَعْضِ الْعُلَمَاءِ. وَقَالَ بَعْضُهُمْ: حَلَالٌ، لِأَنَّهُ يُسَمَّى بِاسْمِ السَّمَكِ، فَالِاحْتِيَاطُ أَنْ لَا يُؤْكَلَ (حاشیۃ جلالین، المائدۃ، آیت 96)۔

فقہ اور فتاوی کی کتابوں میں اس قسم کے بے شمار مسائل ہیں۔ مگر وہ سب کے سب انتہائی حد تک نامناسب اور بے معنی۔ جن چیزوں کو خدا اور رسول نے حرام نہ کہا ہو، ان کو حرام کہنا ایسی جسارت ہے جس کے لیے دین میں کوئی گنجائش نہیں۔ صحابہ وتابعین کے زمانہ میں اس طرح حرام وحلال کی بحثیں نہیں کی جاتی تھیں۔ بعد کے علما ہر معاملہ میں حرام وحلال کی بحثیں کرنے لگے۔ یہ عین وہی غلطی ہے جس میں یہود مبتلا ہوئے۔

4 مارچ 1990

مولانا انیس لقمان ندوی کے ساتھ فجر کی نماز کالی مسجد (نظام الدین) میں پڑھی۔ نماز سے واپس آتے ہوئے میں نے کہا کہ بعد کے دور میں مسلمانوں میں اسلام کا ظاہری ڈھانچہ تو باقی رہا مگر اسلام کی اصل اسپرٹ کم ہوگئی۔ میں نے مثال دیتے ہوئے چند باتوں کا ذکر کیا۔ مثلاً مکہ اسپرٹ، حدیبیہ اسپرٹ، افْعَلْ وَلَا حَرَجَ (کرلو، کوئی حرج نہیں) اسپرٹ، حسن (بن علی) اسپرٹ، وغیرہ۔

مکہ اسپرٹ سے مراد ہے یک طرفہ صبر کرتے ہوئے لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچانا۔ حدیبیہ اسپرٹ سے مراد ہے مشکلات کو چھوڑ کر مواقع کو استعمال (avail) کرنا۔ افْعَلْ وَلَا حَرَجَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 124) اسپرٹ یہ ہے کہ جزئیاتی مسائل کے اختلاف کو توسع کے خانہ میں ڈالتے ہوئے اصل دین پر توجہ صرف کرنا۔ حسن (بن علی) اسپرٹ یہ ہے کہ باہمی اختلاف اگر دوطرفہ بنیاد پر حل نہ ہو رہا ہو تو یک طرفہ دست برداری کے ذریعہ اختلاف کو ختم کردینا۔

افْعَلْ وَلَا حَرَجَ سے اِس روایت کی طرف اشارہ ہے: حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں قیام پذیر تھے، اس وقت لوگ آپ سے مختلف مسائل کے بارے میں سوال کررہے تھے۔ چنانچہ ایک شخص آیا اور کہنے لگا: "مجھے علم نہ ہوسکا، اور میں نے قربانی سے پہلے حلق کرلیا۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قربانی کرلو، کوئی حرج نہیں۔" پھر دوسرا شخص آیا اور کہنے لگا: "مجھے علم نہ ہوسکا، اور میں نے رمی سے پہلے قربانی کردی۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رمی کرلو، کوئی حرج نہیں۔" اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بھی اعمال حج کی ترتیب کے آگے پیچھے ہونے کے بارے میں سوال کیا، تو آپ یہی فرمایا: افْعَلْ وَلَا حَرَجَ (صحیح بخاری، حدیث نمبر 83)۔ یعنی، کرلو، کوئی حرج نہیں۔

ایک دوسری روایت میں ہے: حضرت اسامہ بن شُریک کہتے ہیں کہ منیٰ میں لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے۔ کوئی شخص کہتا کہ اے خدا کے رسول، میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی۔ کوئی کہتا کہ میں نے رمی جمار سے پہلے حلق کرالیا۔ کسی نے کہا کہ میں نے پہلے قربانی کی اور اس کے بعد رمی کیا۔ اسی طرح لوگ مختلف مسائل پوچھتے رہے۔ آپ اس قسم کے سوالات کے جواب میں فرماتے: لاَ حَرَجَ، لاَ حَرَجَ (کوئی حرج نہیں، کوئی حرج نہیں)۔ حرج کی بات تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو بے عزت کرے۔ ایسا ہی شخص ظالم ہے۔ اسی نے حرج والا کام کیا اور ہلاک ہوا (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2015)۔

یکم اپریل 1990

میرے اندر سوچنے کی عادت ہے۔ میں اکثر کسی آیت یا کسی حدیث کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ آج نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے یہ بات میرے ذہن میں آئی کہ

صف بندی کے لیے حدیث میں جو حکم آیا ہے اس کا مطلب کیا ہے، ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ نماز کی صف میں خوب مل کر کھڑے ہو۔ کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ شیطان صف کے درمیان میں بکری کے بچہ کی طرح داخل ہو رہا ہے — إِنِّي لَأَرَى الشَّيْطَانَ يَدْخُلُ مِنْ خَلَلِ الصَّفِّ كَأَنَّهَا الْحَذَفُ (سنن أبي داود، حدیث نمبر 667)۔

اس حدیث میں خلل کا مطلب مجرد جگہ (space) نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ جب لوگ پاؤں کو پھیلا کر ایک دوسرے سے ملیں گے تو خود ایک آدمی کے دونوں پیروں کے درمیان میں اتنی جگہ ہو جائے گی کہ اس کے اندر سے "بکری کا بچہ" گزر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں خلل سے مراد دو آدمیوں کے درمیان خلل ہے، نہ کہ دو پیروں کے درمیان خلل۔

اس حدیث میں اصل زور باہم مل کر کھڑے ہونے پر ہے۔ باہم مل کر کھڑا ہونا اتفاق کی علامت ہے اور منتشر انداز میں کھڑا ہونا اختلاف کی علامت۔ چنانچہ یہی بات دوسری روایت میں ان لفظوں میں ہے: اسْتَوُوا وَلَا تَخْتَلِفُوا فَتَخْتَلِفَ قُلُوبُكُمْ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 432)۔ یعنی، صفوں میں برابر کھڑے ہو جاؤ اور آگے پیچھے نہ ہو، ورنہ تمہارے دلوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا۔

23 مئی 1991

قرآن میں ہے کہ بچہ والی عورتیں اپنے بچوں کو دو برس کامل دودھ پلائیں (2:233)۔ دوسری جگہ قرآن میں ہے کہ ماں کا اپنے بچہ کو دودھ چھڑانا دو برس میں ہوتا ہے (31:14)۔ اسی طرح حدیث میں ہے: لَا رَضَاعَ إِلَّا مَا كَانَ فِي الحَوْلَيْنِ (سنن الدارقطنی، حدیث نمبر 4364)۔ رضاعت صرف وہ ہے جو دو سال میں ہو۔

قرآن و حدیث میں دو سال کی واضح صراحت کی بنا پر جمہور کے نزدیک رضاعت کی

مدت دو سال ہے۔ مگر امام ابو حنیفہ اس کی مدت ڈھائی سال بتاتے ہیں، اور امام زفر نے اس کی مدت تین سال بتائی ہے — قَالَ أَبُو حَنِيفَةَ : ثَلَاثُونَ شَهْرًا، وَقَالَ زُفَرُ: ثَلَاثُ سِنِينَ (التفسیر المظہری، جلد 1، صفحہ 323)۔

قدما کے یہاں اس طرح کا اختلافِ رائے کثرت سے پایا جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے اختلافات کی بنیاد پر وہ لوگ ایک دوسرے کو مطعون نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ تاویل سے کام لیتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں اگر کوئی شخص اس طرح اپنی مختلف رائے ظاہر کرے تو فوراً اس کی تنقیص و تفسیق کی مہم شروع کر دی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قدما زندہ لوگ تھے اور آج کل کے لکھنے اور بولنے والے مردہ لوگ۔

15 جون 1991

بعد کے دور میں جو فقہی مذاہب بنے، ان میں حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں سے ہر ایک کے علما کا کہنا ہے کہ انھیں کا فقہی مسلک صحیح ہے اور دوسرے مسالک غلط ہیں۔ تاہم چوں کہ حدیث کی کتابوں میں ہر قسم کی روایتیں ہیں۔ کسی روایت سے ایک مسلک کی تائید ہوتی ہے اور کسی روایت سے دوسرے مسلک کی۔ اس لیے ان میں سے کوئی مسلک کامل یقین کا دعوی نہیں کر سکتا۔

اس نزاکت کی بنا پر ایک فقیہ نے فقہا کی پوزیشن کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے: مَذْهَبُنَا صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطأَ وَمَذْهَبُ مُخَالِفِينَا خَطأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (الاشباہ والنظائر لابن نجیم، صفحہ 330)۔ یعنی، ہمارا فقہی مذہب درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور دوسرے کا فقہی مذہب نادرست ہے احتمال صحت کے ساتھ۔

یہ تطبیق دین یسر (آسان) کو دین عسر (مشکل) بنانا ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مسالک کا اختلاف تنوع کی بنا پر ہے، نہ کہ اس بنا پر کہ ایک صحیح ہے اور دوسرا غلط۔

17 ستمبر 1991ء

اسلام کے علمی مطالعہ کے سلسلہ میں بہت بڑا مسئلہ اختلافات کا ہے۔ میں نے اپنے مطالعہ میں پایا ہے کہ تقریباً تمام امور میں علمائے اسلام کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح ہر ایک کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عالم کے حوالے سے اپنی بات کہہ سکے۔

مثلاً ابن مسعود اور معوذتین کے مسئلہ کو لیجیے۔ جولوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن مسعود معوذتین کو قرآن سے خارج سمجھتے تھے وہ ابن حجر عسقلانی کا حوالہ دیتے ہیں جنھوں نے صحیح بخاری کی شرح میں امام احمد اور امام ابن حبان کی روایت سے یہ لکھا ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو اپنے مصحف میں نہیں لکھتے تھے (فتح الباری لابن حجر، جلد 8، صفحہ 742)۔ اور جو لوگ اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں ان کا کہنا ہے کہ محدث ابن حزم نے لکھا ہے کہ یہ ابن مسعود پر ایک الزام ہے اور یہ ایک موضوع قول ہے کہ ابن مسعود معوذتین کو داخل مصحف نہیں سمجھتے تھے — مَا رُوِيَ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ مِنْ أَنَّ الْمُعَوِّذَتَيْنِ وَأُمَّ الْقُرْآنِ لَمْ تَكُنْ فِي مُصْحَفِهِ فَكَذِبٌ مَوْضُوعٌ لَا يَصِحُّ (المحلی بالآثار، جلد 1، صفحہ 32)۔ اسی طرح امام نووی لکھتے ہیں کہ معوذتین کو داخل قرآن نہ سمجھنے کے بارے میں ابن مسعود کا جو قول نقل کیا گیا ہے وہ سراسر باطل ہے — مَا نُقِلَ عَنْ ابْنِ مَسْعُودٍ فِي الْفَاتِحَةِ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ بَاطِلٌ لَيْسَ بِصَحِيحٍ عَنْهُ (المجموع شرح المہذب للنووی، جلد 3، صفحہ 396)۔

4 نومبر 1991ء

4 نومبر کو میں پونے (مہاراشٹر) میں تھا۔ وہاں انعام دار صاحب ایک بلڈر ہیں۔ انھوں نے وقف کی ایک جائداد کو لے کر اس کے اوپر تعلیمی ادارہ بنانے کا ارادہ کیا۔ نقشہ یہ تھا کہ کئی منزلہ عمارت بنا کر اس کے اندر مختلف تعلیمی کلاس چلائیں گے۔ اس دوران وہ رقم

حاصل کرنے کے لیے دبئی گئے۔ وہاں وہ شیخ کے یہاں پہنچے تو چندہ مانگنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ ان کو بھی قطار میں بٹھا دیا گیا اور باری آنے پر دوسروں کی طرح انھیں ایک معمولی رقم دے دی گئی۔ انعام دار صاحب نے اس تجربہ کے بعد طے کیا کہ وہ چندہ کا طریقہ ختم کر دیں۔ انھوں نے مجوزہ عمارت کا پورا حصہ کرایہ پر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح لوگوں سے بڑی قم بطور ایڈوانس حاصل کی اور اس سے بلڈنگ تیار کی۔ اب اوپر کی منزلوں میں تعلیمی ادارے ہیں اور نیچے کے تمام حصے کرایہ پر ہیں جن سے 30 لاکھ روپیہ سالانہ کرایہ آئے گا۔

اس تبدیلی پر کچھ ممبران نے مخالفت کا ہنگامہ کھڑا کر دیا کہ پہلے پوری عمارت تعلیم میں لینے کا منصوبہ تھا۔ پھر آپ نے اس کے نیچے کے حصوں کو کرایہ پر کیوں دے دیا۔ میں نے مخالفین سے کہا کہ آپ اتنی سی بات پر مخالفت کا جھنڈا اٹھا رہے ہیں۔ صحابہ کرام نے اس سے بہت زیادہ بڑے قسم کے اختلافات کو برداشت کیا۔ اس کے بعد ہی اسلام کی تاریخ بن سکی۔

8 دسمبر 1991ء

فقہ کا ایک اصول وہ ہے جس کو استحسان کہا جاتا ہے۔ فقہائے اربعہ میں سے تین نے اس کو مانا ہے۔ خاص طور پر احناف نے اس کو بہت استعمال کیا ہے۔ استحسان سے مراد یہ ہے کہ ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس طریقہ کو اختیار کرنا جو لوگوں کے لیے زیادہ مناسب ہو: الاِسْتِحْسَانُ تَرْكُ القِيَاسِ وَالأَخْذُ بِمَا هُوَ أَوْفَقُ لِلنَّاسِ (المبسوط للسرخسی، جلد 10، صفحہ 145)۔

مثلاً ایک آدمی کسی جوتا ساز کے یہاں جاتا ہے۔ وہ اس سے جوتے کی قیمت طے کرتا ہے اور اپنا ناپ دے کر اس کو اپنے لیے ایک جوتا بنانے کا آرڈر دیتا ہے۔ قیاس کے اعتبار سے دیکھیے تو یہ درست نہیں۔ کیوں کہ حدیث کے مطابق، شریعت کا اصول یہ ہے کہ سودے کی موجودگی اس کی بیع کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ اور مذکورہ مثال میں سودا (جوتا) ابھی

موجود نہیں۔ مگر عرف عام کی بنا پر اس کو درست قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا نام استحسان ہے۔

مگر امام شافعی اس کے سخت خلاف ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ جس آدمی نے استحسان سے کام لیا اس نے نئی شریعت بنائی: مَنِ اسْتَحْسَنَ فَقَدْ شَرَعَ، أَيْ وَضَعَ شَرْعًا جَدِيدًا (بیان المختصر شرح مختصر ابن الحاجب، جلد 3، صفحہ 280)۔

اس قسم کے بے شمار اختلافات فقہا کے یہاں پائے جاتے ہیں۔ مگر آج ایسا کوئی اختلاف کیا جائے تو اس کو نہایت برا سمجھا جاتا ہے۔

9 دسمبر 1991ء

قرآن میں ہے: قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَى شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَى سَبِيلاً (17:84)۔ یعنی، کہو کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی شاکلہ سے مطابقت کی بنا پر سمجھ لیتا ہے کہ یہ حق ہے۔ حالاں کہ حق وہ ہے جو علم الٰہی کے مطابق حق ٹھہرے۔

ہر آدمی کا ایک مزاج (mindset) ہوتا ہے جو اس کے حالات کے تحت اس کے اندر بن جاتا ہے۔ اسی کا نام شاکلہ ہے۔ اپنے اس شاکلہ کی بنا پر کوئی چیز اس کے لیے قابل قبول ہوتی ہے اور کوئی چیز نا قابل قبول۔ اپنے مخصوص مزاج کے تحت وہ کسی مسلک کو اختیار کر لیتا ہے اور آخر کار اس سے اتنا مانوس ہو جاتا ہے کہ سمجھنے لگتا ہے کہ یہی حق و صداقت ہے۔ مگر کسی کا ایک چیز سے مانوس ہو جانا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ حق بھی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اپنے ذاتی شاکلہ سے اپنے آپ کو نکالے اور یہ جاننے کی کوشش کرے کہ وہ کیا چیز ہے جو علم الٰہی کے مطابق صحیح ہے۔

6 جنوری 1992ء

موجودہ زمانہ میں اختلاف کو ایک بھیانک چیز سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ دورِ اول میں

اختلاف بالکل ایک عام بات تھی۔ مثال کے طور پر قرآن کی سورہ التکاثر امام بخاری کے نزدیک مدنی ہے، جب کہ تمام مفسرین اس کو مکی قرار دیتے ہیں (الجامع لاحکام القرآن تفسیر القرطبی، جلد 20، صفحہ 168)۔ اس طرح کے بے شمار اختلافات ہیں۔ مگر دور اول میں اس قسم کے اختلاف کو برا نہیں مانا جاتا تھا۔ موجودہ زمانہ میں اختلاف کا نام آتے ہی لوگ بھڑک اٹھتے ہیں۔ یہ زوال کی علامت ہے۔

16 جنوری 1992ء

امام شافعی اور ان کے پیروؤں کا مسلک یہ تھا کہ نماز میں بسم اللہ پڑھنا واجب اور ضروری ہے۔ اس کے مقابلہ میں امام مالک اور ان کے پیروؤں کا مسلک یہ تھا کہ نماز میں بسم اللہ پڑھنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ اس قسم کے اختلافات ہمیشہ استنباطی ہوتے ہیں اور استنباط میں اختلاف سے بچنا ممکن ہی نہیں۔ اس لیے استنباطی امور میں یہی صحیح مسلک ہے کہ ذاتی طور پر ایک رائے رکھنے کے باوجود دوسرے کی مختلف رائے کا احترام کیا جائے۔ اسی کو ایک مشہور قول میں ان لفظوں میں کہا گیا ہے: رَأْيِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (الجواہر من فقہ الحنفیۃ، صفحہ 574)۔

12 اگست 1992ء

ایک صاحب سے گفتگو کرتے ہوئے میں نے کہا کہ مسلمانوں کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ انھوں نے اجتہاد کا مزاج کھو دیا ہے۔ وہ صرف تقلید کے اوپر قائم ہیں۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ مسلمان عام طور پر تنقید کو برداشت نہیں کرتے۔ میں نے کہا کہ تنقید اور اختلاف رائے سے ذہنی ترقی ہوتی ہے۔ اور جہاں تنقید اور اختلاف کا ماحول ختم ہو جائے وہاں صرف ذہنی جمود باقی رہ جائے گا اور آج مسلمان پوری طرح ذہنی جمود کا شکار ہو چکے ہیں۔

7 دسمبر 1992ء

دارالعلوم دیوبند کے تحت ایک عربی جریدہ نصف شہریہ 16 سال سے نکل رہا ہے۔ اس کے شمارہ 25 نومبر 1992 کے صفحہ اول پر ایک مضمون ہے۔ اس کا عنوان ہے: أَهْلُ الْبَاطِلِ يَتَّحِدُونَ، وَأَهْلُ الْحَقِّ يَخْتَلِفُونَ (اہل باطل متحد ہیں اور اہل حق مختلف ہو رہے ہیں)۔

دو صفحہ کے اس مضمون میں بڑے جذباتی انداز میں مسلمانان عالم کے موجودہ مسائل، مثلاً فلسطین، افغانستان، برما، سری لنکا، صومالیہ، بوسنیا اور ہندستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ہر جگہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ مسلمانوں کے دشمن متحد ہیں مگر مسلمانوں کے درمیان اتحاد نہیں، مثلاً ہندستان میں مسلمان بابری مسجد تحریک کے عنوان پر متحد نہ ہو سکے۔ مگر ہندو بابری مسجد۔رام جنم بھومی کے سوال پر متحد ہو گئے۔

مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے کہ یہ عجیب مسئلہ ہے کہ باطل والے باطل میں متحد ہو رہے ہیں۔ مگر حق والے حق میں متحد نہیں۔ ایک معمہ ہے جس کو ہم اہل دانش کے اوپر چھوڑتے ہیں کہ وہ اس کا مطالعہ کریں اور اس کا حل معلوم کریں: إِنَّهَا قَضِيَّةُ اتِّحَادِ أَهْلِ الْبَاطِلِ فِي بَاطِلِهِمْ وَاخْتِلَافِ أَهْلِ الْحَقِّ فِي حَقِّهِمْ — قَضِيَّةٌ عَجِيبَةٌ أَوْ لُغْزٌ مِنَ الْأَلْغَازِ، نَتْرُكُهُ لِلْعُقَلَاءِ أَنْ يَدْرُسُوهُ وَيَحُلُّوهُ۔

یہ سارا معاملہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ یہ کہ جن مسلمانوں کو اہل حق کہا جا رہا ہے، وہ دراصل اخلافِ اہل حق ہیں۔ موجودہ مسلم نسلیں حقیقتاً ایک ایسا گروہ ہیں جو قرآن کے الفاظ میں قساوت اور موت کے مرحلہ کو پہنچ چکے ہیں (57:16-17)، اور جو گروہ ایسے مرحلہ کو پہنچ جائے اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو آج ہم کو نظر آ رہا ہے۔

زندہ انسان کی صفت برداشت ہے، اور مردہ انسان کی خاص صفت یہ ہے کہ وہ برداشت کو کھو دیتا ہے۔ اتحاد کی لازمی قیمت برداشت ہی ہے۔ اختلاف کو برداشت

کرنے سے اتحاد پیدا ہوتا ہے اور اختلاف کو برداشت نہ کیا جائے تو اس کا نام اختلاف ہے۔ زندہ انسان چوں کہ برداشت کی صفت کے حامل ہوتے ہیں اس لیے ان میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ اور مردہ انسان چوں کہ برداشت سے خالی ہوتے ہیں اس لیے وہ بہت جلد اختلاف کا شکار ہو جاتے ہیں۔

10 مئی 1993

جمیل اختر صاحب مدینہ میں کام کرتے ہیں۔ آج کل چھٹی پر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے ایک مولوی صاحب کو آپ کی کتاب ''تجدید دین'' پڑھنے کے لیے دی۔ اس کو پڑھنے کے بعد میں نے ان کا تاثر پوچھا۔ انھوں نے کہا: سب ہفوات (بکواس) ہے۔ یہ شخص تو مجھے دشمنان اسلام کا ایجنٹ معلوم ہوتا ہے۔

میں نے کہا کہ میرے مخالفین اکثر اسی قسم کا تبصرہ کرتے ہیں۔ وہ بلا دلیل محض الزامی الفاظ بولتے ہیں۔ اس طرح کسی کو مطعون کرنے کی اسلام میں اجازت نہیں۔ کسی مومن کی عزت پر حملہ کرنا اسلام میں ناجائز ہے۔ اور اس قسم کے تبصرے بلا شبہ عزت پر حملہ کے ہم معنی ہیں — اسلام میں اختلاف جائز ہے مگر دشنام طرازی بلا شبہ حرام ہے۔

24 اگست 1993

آج دہلی کے تالکٹورہ اسٹیڈیم میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی طرف سے ایک جلسہ تھا۔ وسیع ہال پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ بہت بڑی تعداد میں دہلی اور دہلی کے باہر کے بی جے پی سے تعلق رکھنے والے ہندو جمع تھے۔ منچ پر ان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر موجود تھے۔ مجھے بھی تقریر کے لیے بلایا گیا تھا۔

میں نے کہا کہ زندگی کے دو طریقے ہیں: الگاؤ واد اور ملاپ واد۔ اسلام کا طریقہ ملاپ واد کا ہے۔ چنانچہ قرآن میں کہا گیا ہے: وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (4:128)۔ یعنی، اور صلح بہتر

ہے۔ اور فرمایا: وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ (10:25)۔ یعنی، اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے۔

میں نے کہا کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن مارکاٹ کی کتاب ہے، وہ قرآن سے انجان ہیں۔ وہ اپنے گیان کو قرآن کے آئینہ میں دیکھ رہے ہیں۔ مسٹر نراد چودھری (مقیم لندن) کا انٹرویو ٹائمس آف انڈیا اگست 1993 میں چھپا ہے۔ وہ بجا طور پر کہتے ہیں قرآن کے ٹکسٹ میں مجھ کو کوئی بے ٹھیک بات نہیں ملی۔ جو بے ٹھیک باتیں ہیں وہ سب کمنٹری میں ہیں۔ سلمان رشدی نے اپنی کتاب (The Satanic Verses) کمنٹری کی بنیاد پر لکھی ہے، نہ کہ قرآن کے ٹیکسٹ کی بنیاد پر۔

میں نے کہا کہ کمنٹری ہر آدمی کا اپنا انٹرپریٹیشن ہوتا ہے۔ اور انٹرپریٹیشن میں ہمیشہ اختلاف ہوتا ہے۔ چنانچہ گیتا کے متعلق کچھ ہندو شارحین کا کہنا ہے کہ وہ جنگ کی کتاب ہے۔ مگر اسی گیتا کو مہاتما گاندھی نے امن کی کتاب بتایا ہے۔

8 ستمبر 1993

ایک ہندو جرنلسٹ مسٹر یشونت دیش مکھ انٹرویو کے لیے آئے۔ ان کے مختلف سوالوں میں سے ایک سوال یہ تھا کہ اسلام میں آلوچنا (تنقید) کو برداشت نہیں کیا جاتا؟ میں نے کہا کہ یہ تو الٹی بات ہے۔ اسلام میں تو تنقید یا اختلاف کو پسند کیا جاتا ہے۔ ایک حدیث ہے کہ: اخْتِلافُ أُمَّتِي رَحْمَةٌ (المقاصد الحسنۃ للسخاوی، حدیث نمبر 39)۔

اس میں اختلاف سے مراد وہی چیز ہے جس کو انگریزی میں ڈسنٹ (dissent) کہا جاتا ہے یعنی اختلاف رائے۔ اسلام کے دور اول میں اختلاف رائے یا تنقید عام تھی۔ کوئی بھی آدمی کسی شخص پر تنقید کرسکتا تھا۔ اس سلسلہ میں میں دور اول کے کئی واقعات بتائے۔

مذکورہ جرنلسٹ بہت خوش ہوا۔ جاتے ہوئے اس نے کہا کہ اسلام کے بارے میں میرے بہت سے شبہات تھے۔ آج سب ختم ہوگئے۔

28اپریل 1994

حدیث میں منافق کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے: وَإِذا خاصَمَ فَجَرَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 34؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 58)۔ یہ حدیث صحیح البخاری اور صحیح مسلم دونوں میں کتاب الایمان کے تحت آئی ہے۔ ابن حجر اور نووی دونوں نے فاجر کی تشریح: مَالَ عَنِ الْحَقِّ کے لفظ سے کی ہے۔ اس کے مطابق، حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص منافق ہے کہ جب اس سے اختلافی بحث پیش آئے تو وہ انصاف سے ہٹ جائے (فتح الباری لابن حجر، جلد 1، صفحہ 90؛ شرح النووی علی مسلم، جلد 2، حدیث نمبر 48)۔

حقیقت کا علم تو اللہ کو ہے۔ مگر مجھ سے اختلاف کرنے والے تمام مسلمان انصاف سے ہٹ گئے۔ میں نے کہا کہ مسلمان صبر و اعراض کا طریقہ اختیار کریں تو مخالفین نے کہا کہ وہ بزدلی کی تعلیم دے رہے ہیں۔ 2 دسمبر 1992 کے بعد میں نے کہا کہ مسلمان بابری مسجد کے مسئلہ پر اپنا ایجی ٹیشن ترک کر دیں تو مخالفین نے کہا کہ وہ کہتے ہیں مسلمان بابری مسجد کو ہندوؤں کے حوالے کر دیں۔ میں نے کچھ مفکرین پر علمی تنقید کی تو کہا گیا کہ دیکھو، یہ علما پر کیچڑ اچھال رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ہندو مسلم نزاعی معاملات میں مسلمان پر امن جدوجہد کا طریقہ اختیار کریں تو کہنے والوں نے میرے بارے میں کہا کہ وہ ملی تشخص سے دست برداری کی دعوت دے رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ موجودہ قومیں مسلمانوں کی حریف نہیں ہیں انسانی رشتہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی خیر خواہی کے مستحق ہیں، تو کہا گیا کہ یہ اسلام دشمنوں کو خوش کرنا چاہتے ہیں، وغیرہ۔

میں کسی کو منافق نہیں کہہ سکتا، مگر حدیث کی روشنی میں یہ ضرور کہوں گا کہ مذکورہ قسم کی باتیں بلاشبہ منافق والی باتیں ہیں۔ یہ مخلصانہ ایمان والی باتیں نہیں۔

21 جون 1994

آج اپنے گھر کی تمام خواتین کو دفتر میں بٹھا کر سمجھایا کہ تم لوگوں کو مل جل کر رہنا چاہیے۔ کیوں کہ باہمی اختلاف سے برکت اٹھ جاتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ میں اعتکاف میں تھے۔ آپ کو شب قدر کا علم دیا گیا۔ آپ مدینہ کی مسجد سے باہر نکلے کہ مسلمانوں کو اس کی متعین تاریخ بتا دیں۔ اس دوران انصار کے دو آدمی لین دین کی بات پر جھگڑنے لگے۔ اس پر شب قدر کا علم اٹھا لیا گیا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 49)۔ اسی طرح احد کی جنگ میں مسلمانوں کی فتح ہو گئی۔ اس کے بعد کچھ مسلمان آپس میں نزاع کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیتی ہوئی جنگ دوبارہ ہار میں تبدیل ہو گئی۔ اس طرح کی مختلف مثالیں دے کر میں نے کہا کہ آپ لوگ مل جل کر رہیں تو یہاں برکت اور رحمت برسے گی۔ اور اگر جھگڑا اور نزاع شروع کر دیا تو آئی ہوئی برکت ختم ہو جائے گی۔

تمام خواتین رونے لگیں۔ دل سے یہ عہد کیا کہ سب کی سب مل جل کر محبت کے ساتھ رہیں گی۔ اختلاف یا شکایت ہو تب بھی ان کے باہمی تعلق میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ میرا خیال ہے کہ ہر گھر میں ایسا ہونا چاہیے کہ گھر والوں کا ہفتہ وار یا ماہوار اجتماع گھر کے اندر ہو۔ اس میں گھر کا بڑا مرد یا بڑی عورت لوگوں کو نصیحت کرے۔ اس سے گھر کے ماحول کو درست رکھنے میں بہت مدد ملے گی۔

3 اگست 1994

ابن ماجہ (کتاب الفتن) میں ایک روایت کے تحت آیا ہے: فَإِذَا رَأَيْتُمُ اخْتِلَافًا فَعَلَيْكُمْ بِالسَّوَادِ الْأَعْظَمِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3949)۔ یعنی، پھر جب تم اختلاف دیکھو تو تم سواد اعظم کے ساتھ رہو۔ اس حدیث کا مفہوم عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اختلاف کے وقت سواد اعظم کا جو مسلک ہو وہی مسلک حق ہوگا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں۔ اس کی غلطی

اس سے واضح ہے کہ آج برصغیر ہند میں 75 فیصد سے زیادہ لوگ اہل بدعت ہیں۔ پھر کیا اہل بدعت کا مسلک درست قرار دیا جائے گا۔ اس حدیث کا تعلق فتنہ کے مسئلہ سے ہے، نہ کہ حق کے مسئلہ سے۔ فتنہ کے وقت سواد اعظم کے ساتھ رہنا اسی طرح وقتی مصلحت کے معنی میں ہے جس طرح وقتی مصلحت کے تحت حضرت ہارون علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں شرک کرنے والوں سے تعلق کو برداشت کیا تھا (طٰہٰ، 20:94)۔ ایسے موقع پر اصل سوال چھوٹے شر اور بڑے شر کے درمیان انتخاب کا ہوتا ہے اور فتنہ کے وقت سواد اعظم کے ساتھ رہنا اسی لیے ہے کہ اس سے ٹکراؤ زیادہ بڑے شر کا باعث ہوگا۔

سواد اعظم اگر اس وقت حق پر ہو تو معاشرہ میں فساد کی نوبت ہی نہ آئے۔ کیوں کہ اقلیت ہمیشہ اکثریت کے تابع ہوتی ہے، نہ کہ جو اکثریت ہے وہ اقلیت کے تابع ہو جائے۔

14 اگست 1994

شیخ محمد اکرام آئی سی ایس سرسید کے تذکرہ کے تحت لکھتے ہیں: سرسید کی تصانیف میں کئی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے نہ صرف مخالف بلکہ ان کے موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے۔ سرسید نے جب بائبل کی نامکمل تفسیر لکھی تو نواب محسن الملک کو اس کی عبارت اتنی شاق گزری کہ اس وقت سرسید سے تعارف نہ ہونے کے باوجود انھوں نے اس کے خلاف سرسید کو ایک طویل خط لکھا اور جب تک ان سے نہ ملے انھیں یقین نہ آتا تھا کہ سرسید قبلہ رو ہو کر نماز پڑھتے ہیں (موج کوثر، صفحہ 91)۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف اور غلط فہمی میں کتنا قریبی تعلق ہے۔ نواب محسن الملک کو سرسید کی تفسیر بائبل سے اختلاف ہوا۔ مگر یہ اختلاف یہاں تک پہنچ گیا کہ انھوں نے سمجھ لیا کہ سرسید نماز بھی اگر پڑھتے ہیں تو اسلامی قبلہ کی طرف رخ کر کے نہیں پڑھتے ہیں۔ حالاں کہ یہی نواب محسن الملک اختلاف کے بعد سرسید کے اتنے گرویدہ ہو گئے کہ ان کے قریبی رفیق بن گئے۔

7 دسمبر 1994

عبدالحسیب خاں صاحب ملاقات کے لیے آئے۔ وہ کراچی (گلشن اقبال) میں رہتے ہیں۔ ان کا دواؤں کا بزنس ہے۔

گفتگو کے دوران انھوں نے کہا کہ بھوپال میں میرے عزیز ہیں۔ ان سے ملنے کے لیے آیا ہوں۔ مگر میں صرف چار دن رہ سکوں گا۔ کراچی میں میرے بچے ہیں۔ اور وہاں زندگی اس قدر غیر محفوظ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ اس لیے یہاں زیادہ ٹھہرنا ممکن نہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کراچی میں ہر روز ایک درجن آدمیوں کے قتل کا اوسط ہے۔

میں نے کہا کہ 1947 سے پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہمیں پاکستان کی ضرورت ہے۔ پھر پاکستان میں مسلمان کیوں نہیں مل کر رہ رہے ہیں۔ وہ اس کا کوئی خاص جواب نہ دے سکے۔ میں نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ اختلاف زندگی کا ایک حصہ ہے۔ مثلاً میاں بیوی کے تعلق کو لیجیے۔ شہزادہ چارلس سے لے کر اب تک کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کے اور اس کی بیوی کے درمیان بار بار اختلاف نہ ہوتا ہو۔ مگر ہم اس کو ایڈجسٹمنٹ کا مسئلہ بناتے ہیں، نہ کہ تفریق کا مسئلہ۔ اگر اختلاف کو تفریق کا مسئلہ بنایا جائے تو ہر شادی آخر کار طلاق پر ختم ہوگی۔

ہندو اور مسلمان کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ قانون فطرت کے تحت دونوں میں اختلافات واقع ہوں گے۔ مگر ان اختلافات کو ہمیں ایڈجسٹمنٹ کا اشو بنانا تھا، نہ کہ تقسیم ملک کا اشو۔ اختلافات کو تفریق کا اشو بنانے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ پاکستان کے مسلمانوں میں ایڈجسٹمنٹ کا ذہن نہیں۔ پہلے وہ ہندوؤں سے لڑتے تھے، اب خود آپس میں لڑتے ہیں۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ لوگوں کی سوچ کو بدلا جائے۔

17 جنوری 1995

المیزان الکبری میں عبد الوہاب شعرانی (وفات 973ھ) نے سفیان ثوری (وفات 161ھ) کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے: قَالَ سُفْيَانُ الثَّوْرِيُّ: ”لَا تَقُولُوا: اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي كَذَا، وَقُولُوا: قَدْ وَسَّعَ الْعُلَمَاءُ عَلَى الأُمَّةِ بِكَذَا **(المیزان الکبریٰ للشعرانی، جلد 1، صفحہ 162)۔** سفیان ثوری نے کہا کہ یہ نہ کہو کہ اس مسئلے میں علما نے اختلاف کیا ہے۔ بلکہ یہ کہو کہ علما نے ایسا کر کے امت کے لیے گنجائش پیدا کر دی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں اہل علم کی کئی رائیں ہوتی ہیں۔ ایسے معاملے میں ایک صورت یہ ہے کہ اس کو محض اختلاف قرار دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس اختلاف کو توسع اور تنوع کے معنی میں لیا جائے۔ پہلی صورت میں لوگوں کے اندر منفی ماحول بنتا ہے اور دوسری صورت میں مثبت ماحول۔

26 اپریل 1995

بعد کے زمانہ میں جو فقہ مرتب ہوئی اس میں ایک عجیب وغریب برائی یہ داخل ہوگئی کہ فرضی مثالیں وضع کرکے اس کی بنیاد پر احکام بتائے جانے لگے۔ مثلاً کسی زرخیز دماغ نے یہ سوال کیا کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھائے کہ ہر وہ عورت جس سے میں نکاح کروں تو اس کو طلاق ہے (قَالَ كُلُّ امْرَأَةٍ أَتَزَوَّجُهَا فَهِيَ طَالِق) تو ایسے آدمی کے لیے شرعی مسئلہ کیا ہوگا۔

اب فقہا نے ”الجواب“ کہہ کر اس کا شرعی مسئلہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ حنابلہ اور شوافع نے کہا کہ اگر وہ آدمی یہ بیان دے کہ میری مراد صرف فلاں بستی یا فلاں محلہ کی عورتوں سے تھی تو دوسری بستیوں سے نکاح اس کے لیے جائز ہوگا۔ کیوں کہ لفظ عام کی تخصیص نیت کے ذریعہ جائز ہے (الحاوی الکبیر للماوردی، جلد 10، صفحہ 25؛ مسائل حرب الکرمانی،

جلد 1، صفحہ 382)۔ مگر احناف نے کہا کہ نہیں، اس آدمی کی نیت دیانۃً تسلیم ہوسکتی ہے مگر وہ قضاءً تسلیم نہیں۔ وہ دنیا کی جس عورت سے بھی نکاح کرے گا، اس پر از خود ایک طلاق واقع ہوجائے گی (البحر الرائق، جلد 4، صفحہ 18)۔

اس قسم کے فرضی مسائل نے صرف امت کے اختلافات میں اضافہ کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہی کبھی کسی مرد نے ایسی قسم کھائی ہوگی۔ مگر اس کو فرض کرکے مسائل وضع کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر ضروری بحثیں پیدا ہوئیں، اور اختلاف واقع ہوگیا۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ فرضی سوالات کو ہرگز فتویٰ کا موضوع نہ بنایا جائے، نیز بہت کم مسائل پر فتویٰ دیا جائے۔ بیشتر مسائل کو اسْتَفْتِ قَلْبَكَ (مسند احمد، حدیث نمبر 18006) پر چھوڑ دیا جائے۔ یعنی، اپنے دل سے فتویٰ پوچھو۔

10 جون 1995

آج ٹائمس آف انڈیا میں جواہر لال نہرو کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ باہم مل کر رہنے کا واحد بدل یہ ہے کہ باہم ایک دوسرے کو تباہ کردیا جائے:

The only alternative to co-existence is co-destruction.

یہ بات صاف ہے۔ یہ دنیا اختلافات کی دنیا ہے۔ اس دنیا میں لازماً ایسا ہوگا کہ ایک دوسرے کے درمیان شکایت کی بات ہوجائے۔ یہاں باہمی شکایتوں کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ اس لیے عقلمند آدمی کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسندی سے کام لے اور قابلِ شکایت باتوں کو نظر انداز کرکے جینے کی کوشش کرے۔ اس کے برعکس اگر وہ ہر ایک شکایت پر بلڈوزر چلانا چاہے تو اس غیر فطری کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو تباہ کرلے گا۔

29 ستمبر 1995

قرآن میں ہے: وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ (11:119)۔ یعنی، اور اس نے اسی لیے ان کو پیدا

کیا ہے۔اس کی تفسیر کرتے ہوئے امام حسن بصری نے کہا: وَلِلاختِلَافِ خَلَقَهُمْ (تفسیر ابن کثیر، جلد 4، صفحہ 485) یعنی، خدا نے ان کو اختلاف کے لیے پیدا کیا ہے۔

سیاق وسباق کے اعتبار سے یہ نہایت صحیح تفسیر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ پھر جو لوگ اختلاف کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ یا اختلاف رائے پر غصہ ہوتے ہیں، وہ گویا کہ خود فطرت سے لڑنا چاہتے ہیں۔ اور فطرت سے لڑنے والا کبھی برسرحق نہیں ہوسکتا۔

25 جنوری 1996

ہندستان کے ایک معروف عالم دین نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ تاریخ اسلام پر نظر رکھنے والے ایک طالب علم کی یہ بات سن لیجیے کہ ہم نے ہمیشہ اپنے اندرونی اختلافات سے شکست کھائی ہے۔ (بانگ درا، لکھنؤ، جنوری 1996) ۔عرب دنیا کے مشہور عالم الشیخ محمد الغزالی نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا: إِذَا عَجزَ المُسْلِمُونَ عَنْ الوَحْدَةِ وَالِاتِّفَاقِ فَلَيْسُوا أَهْلًا لِلْبَقَاءِ (العالم الاسلامی، مکہ، 17-13 شعبان 1406) ۔یعنی، مسلمان جب اپنے درمیان اتحاد واتفاق قائم نہ کرسکیں تو وہ اس دنیا میں قیام وبقا کے اہل نہیں رہتے۔

آج تمام دنیا کے مسلمان یہی بات کہہ رہے ہیں۔ سارے لوگ مسلمانوں کو پیغام دے رہے ہیں کہ اختلافات کو فتح کرکے متحد ہوجائیں تاکہ وقت کے چیلنج کا مقابلہ کرسکیں۔ مگر یہ بات ادھوری ہے۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے متحد ہوجائیں۔ کیوں کہ انسانوں کے درمیان اختلافات کا ختم ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہی کہ اختلافات کو نظر انداز کرکے اتحاد پیدا کیا جائے۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں جو اتحاد تھا وہ اسی طرح تھا اور آئندہ جب بھی اتحاد ہوگا اسی طرح ہوگا۔ اتحاد ہمیشہ صبر کی قیمت پر حاصل ہوتا ہے، نہ کہ خاتمہ اختلاف کی قیمت پر۔

5 جون 1996

الاحنف بن قیس تابعی حلم و بردباری کے لیے مشہور ہیں۔ لوگوں کی سختیوں کے مقابلہ میں وہ اتنا تحمل کرتے تھے کہ ان کو ابو بحر کہا جانے لگا۔ یعنی سمندر کا باپ۔ وہ عرب کے قبیلہ بنو تمیم سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ ہجرت سے تین سال پہلے پیدا ہوئے اور 72ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

وہ اگرچہ حلم و بردباری میں ضرب المثل بن گئے تھے۔ مگر وہ اپنے بارے میں کہا کرتے تھے کہ: إِنِّي لَسْتُ بِحَلِيمٍ وَلَكِنِّي أَتَحَالَمُ (طبقات ابن سعد، جلد 7، صفحہ 66)۔ یعنی میں بردبار نہیں ہوں بلکہ میں بہ تکلف بردباری اختیار کرتا ہوں۔

تقریباً یہی معاملہ میرا بھی ہے۔ میں گھر سے باہر تک ہر جگہ تحمل کا طریقہ اختیار کرتا ہوں۔ حتیٰ کہ میں اس کا مشن چلا رہا ہوں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میرے اندر بے پناہ غصہ ہے۔ اصول کے خلاف معمولی بات پر بھی مجھے غصہ آجاتا ہے۔ مگر دو چیزوں نے مجھے ٹھنڈا کر رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ اللہ کو تحمل پسند ہے۔ دوسرے یہ کہ موجودہ دنیا میں یہی واحد قابل عمل روش ہے۔ عدم تحمل کا طریقہ موجودہ دنیا میں سرے سے چلنے والا نہیں۔

12 جون 1996

جابر بن سلیم ایک صحابی ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلیم سے کہا کہ مجھے کوئی نصیحت کیجیے۔ آپ نے فرمایا: لَا تَسُبَّنَّ أَحَدًا (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4084)۔ یعنی کبھی کسی شخص کو گالی نہ دینا۔

یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کیا کوئی شخص نارمل حالت میں کسی کو گالی دیتا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ گالی کسی کے منھ سے صرف اس وقت نکلتی ہے جب اس کو اشتعال دلادیا جائے۔ گالی دراصل جوابی اشتعال ہے۔ اس اعتبار سے رسول اللہ کی نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی اشتعال انگیزی کرے تب بھی تم مشتعل نہ ہونا۔ تم اپنے آپ کو منفی ردعمل سے مکمل طور پر بچانا۔

17 جون 1996

تحریک ہمیشہ متحدہ طاقت سے کامیاب ہوتی ہے، اور کسی تحریک کے متحدہ قوت بننے کی واحد شرط یہ ہے کہ اس کے افراد شکایت اور اختلاف سے اوپر اٹھ کر متحد ہونا جانتے ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کے اصحاب: بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ (سیسہ پلائی ہوئی دیوار) کی طرح متحد ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہاں اختلاف یا شکایتیں نہ تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہاں بھی ہر قسم کی انسانی شکایتیں موجود تھیں۔ مگر اصحاب رسول نے ان سے اوپر اٹھ کر ہر جہاں میں اپنا اتحاد برقرار رکھا۔

مثلاً غزوہ بدر کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا دشمنوں کی طرف سے آئے ہوئے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی ان کو قتل نہ کرے۔ ابو حذیفہ صحابی نے کہا، کیا ہم اپنے باپ اور اپنے بیٹوں، اپنے پوتوں، اپنے بھائیوں کو قتل کریں اور عباس کو چھوڑ دیں۔ یہ لمبا قصہ ہے جو سیرۃ ابن ہشام (جلد 2، صفحہ 197) میں دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی طرح حضرت علی جن کے عقد میں فاطمہ بنت محمد تھیں، انہوں نے بنو مخزوم کی لڑکی سے دوسرا عقد کرنا چاہا تو رسول اللہ نے نہایت سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ اس کی تفصیل صحیح مسلم فضائل فاطمہ کے تحت دیکھا جا سکتا ہے (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2449)۔

دورِ اول میں اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو جماعت مسلمین میں زبردست اختلاف وانتشار پیدا کرنے کے لیے کافی تھے۔ مگر ہر بار ایسا ہوا کہ اصحابِ رسول تمام شکایتوں کو پی گئے اور اللہ کی رضا کے لیے اپنے اتحاد کو آخر وقت تک برقرار رکھا۔ موجودہ زمانہ میں خود میرے ساتھ بار بار ایسا پیش ہوا ہے کہ لوگ میرے مشن کے ساتھ جڑے اور پھر معمولی شکایت پیش آنے پر ساتھ چھوڑ کر چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں نہ مسلمانوں کا اتحاد قائم ہوتا اور نہ کوئی بڑا کام انجام پاتا۔

30 ستمبر 1996

مکہ سے نکلنے والا عربی ہفت روزہ العالم الاسلامی (2-13 ربیع الاولا1417ھ) کا صفحہ 2 میرے سامنے ہے۔ اس میں ایک مضمون السید علی احمد الصوری کے قلم سے ہے۔ اس کا عنوان ہے: السَّبِیلُ إِلَی الخُرُوجِ مِمَّا نَحْنُ فِیهِ۔ یعنی ہم جس حالت میں پھنسے ہوئے ہیں اس سے نکلنے کا راستہ۔ مضمون نگار کے نزدیک یہ راستہ توحید صفوف ہے۔ یعنی مسلمانوں کے درمیان اتفاق واتحاد۔

یہ بات کم از کم سوسال سے کہی جارہی ہے۔ مگر آج تک مسلمانوں میں اتحاد قائم نہ ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لکھنے اور بولنے والے اتحاد، اتحاد تو کرتے ہیں مگر یہ نہیں بتاپاتے کہ اتحاد پر کس طرح قائم رہیں۔ تمام لکھنے اور بولنے والے اتحاد کا راز یہ سمجھتے ہیں کہ لوگ اختلاف کرنا چھوڑ دیں۔ وہ اختلاف کو ختم کر کے اتحاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مگر یہ ایک ممکن چیز کو ناممکن تدبیر کے ذریعہ حاصل کرنا ہے۔ کیوں کہ اختلاف تو خود فطرت میں شامل ہے، پھر اس کو کیوں کر ختم کیا جاسکتا ہے۔ امت سے کہنے کی اصل بات یہ تھی کہ اختلاف کے باوجود متحد ہونا سیکھو۔ مگر رہنمایانِ امت لوگوں کو یہ بات بتا نہ سکے۔ پوری کی پوری ملت شعوری طور پر اتحاد کے اس راز سے بے خبر ہے۔ پھر اس کے اندر اتحاد آئے تو کس طرح آئے۔

26 جنوری 1997

ہندوستان کے لیڈر لوکمانیہ تلک نے 1944 میں کہا تھا۔ انگلینڈ کی مشکل ہماری آسانی ہے۔ یہی عام طور پر لوگوں کا نظریہ ہے۔ لوگوں کو جس شخص یا قوم سے اختلاف ہوجائے وہ اس کے لیے دشواریاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کو اپنے لیے سہولت کا

باعث سمجھتے ہیں۔ مگر یہ پالیسی نہایت مہلک ہے۔ یہ ایک بوم رینگ سیاست ہے جو مخالف کو نقصان پہنچانے کے ساتھ خود اپنے لیے بھی نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔

اس کے مقابلہ میں زیادہ صحت مند سیاست یہ ہے کہ دشمن تمہارے خلاف منفی کارروائی کرے تو تم اس کے مقابلہ میں مثبت کارروائی کرو۔ وہ نفرت کی فصل اگائے تو تم محبت کی فصل اگاؤ۔ تم دشمن کے مقابلہ میں ردعمل کا طریقہ نہ اختیار کرو بلکہ اپنی پالیسی خود اپنی ٹھنڈی سوچ کے تحت بناؤ۔ یہی دوسری پالیسی کامیابی کی پالیسی ہے۔

16 مارچ 1997

مولانا وارث مظہری سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ تنقید اور اختلاف کا حق ہر آدمی کو حاصل ہے۔ آپ کسی بھی شخص کے خلاف تنقید کر سکتے ہیں۔ آپ کا ایسا کرنا اپنے جائز حق کو استعمال کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ مگر اسی کے ساتھ دوسری سنگین حقیقیت یہ ہے کہ دلیل سامنے آجانے کے بعد آدمی کو اپنا اختلاف ختم کر دینا چاہیے۔ میں نے کہا کہ دلیل اس دنیا میں خدا کی نمائندہ ہے۔ دلیل کو نہ ماننا گویا خدا کے سامنے سرکشی کرنا ہے۔ ایسا آدمی بلاشبہ خود اپنا نقصان کرتا ہے، نہ کہ دلیل پیش کرنے والے کا۔

9 مئی 1997

مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ) 92 سال کی عمر میں 5 مئی 1997 کو انتقال کر گئے۔ مجھے ان کے افکار ونظریات سے مناسبت نہیں تھی۔ مگر ان کی شخصیت میں ذاتی تجربہ کے تحت میں نے ایک ایسی خوبی پائی جو کسی اور عالم میں مجھے نہیں ملی۔ 15 اپریل 1967 میں لکھنؤ کی مسجد (کچہری روڈ) میں ان سے میری ایک سخت اختلافی گفتگو ہوگئی۔ اس زمانہ میں مولانا منظور نعمانی (1997-1905)، مولانا ابوالحسن علی ندوی (1999-1913)، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی (1974-1913) جو مسلم سیاست چلا رہے تھے اس سے مجھے سخت اختلاف

تھا۔ میں نے ڈھائی گھنٹہ تک اس پالیسی پر تنقیدی گفتگو کی مگر وہ اپنی رائے پر قائم رہے۔ آخر کار میں اٹھا۔ میرا حال یہ تھا کہ میں رو رہا تھا۔ میں نے ان کو رخصتی سلام نہیں کیا۔ صرف یہ شعر پڑھ کر باہر نکل آیا:

إِذَا كَانَ الْغُرَابُ رَئِيسَ قَوْمٍ　　سَيَهْدِيهِمْ إِلَى دَارِ الْبَوَارِ

اس سخت تنقید کے باوجود ان کے دل میں میرے خلاف نفرت پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے بعد بھی وہ میرے بارے میں معتدل رہے۔ بعد کو انہوں نے خود ہی مذکورہ مسلم سیاست سے علیحدگی اختیار کرلی۔

4 جون 1997

حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا کہ بیشک حق لوگوں سے نہیں پہچانا جاتا ہے، بلکہ لوگ حق کے ذریعہ پہچانے جاتے ہیں (إِنَّ الحَقَّ لَا يُعْرَفُ بِالرِّجَالِ، وَإِنَّمَا يُعْرَفُ الرِّجَالُ بِالحَقِّ) جامع المسائل لابن تیمیہ، جلد 7، صفحہ 466۔ اسی طرح مولانا رشید احمد گنگولی نے اپنے شیخ طریقت حاجی امداد اللہ صاحب پر ایک فقہی مسئلہ پر تنقید کی۔ کسی نے کہا کہ آپ اپنے شیخ پر تنقید کر رہے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ شیخ ہم کو محبوب ہیں لیکن حق ہم کو اس سے بھی زیادہ محبوب ہے۔

5 جون 1997

دمشق کے مشہور عالم دکتور محمد سعید البوطی (2013-1929) اور دکتور احسان بعدرانی (پیدائش 1947) کے درمیان ایک مباحثہ ہوا۔ دکتور بعدرانی نے کہا کہ فقہ کی تدوین جدید ہونی چاہیے۔ دکتور البوطی نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی یہ فقہ ظاہر ہے کہ قرآن اور سنت ہی سے مستنبط ہوگی اور جب ایسا ہوگا تو وہ محض ایک تکرار ہوگی۔ کیوں کہ قدیم فقہ قرآن وسنت میں سے مستنبط کر کے مدون کی گئی ہے۔ گویا جدید فقہ محض ایک حاصل شدہ

چیز کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش ہوگی۔

میں کہوں گا کہ قدیم فقہ عہد عباسی میں مدون کی گئی۔ یعنی عہدِ نبوی، عہدِ خلفائے راشدین، عہد بنی امیہ کے بعد۔ اگر عہد عباسی میں مدون کی جانے والی فقہ وہی تھی جو اسلام کے ابتدائی تین عہدوں میں موجود تھی تو وہ محض تکرار تھی اور اگر تکرارِ اول درست ہو تو تکرار ثانی کیوں کر نادرست قرار پائے گی۔ اور اگر قدیم فقہ اس لیے مدون کی گئی کہ عہد عباسی میں اسلامی معاشرہ کو نئے نئے مسائل پیش آ گئے تھے۔ تو دور جدید کے مسلم معاشرہ کو اس کے مقام میں ہزار گنا زیادہ نئے مسائل پیش آ گئے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر پہلی تبدیلی کے موقع پر فقہ کی از سرِ نو تشکیل و تدوین ضروری تھی تو وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر دوسری تبدیلی کے موقع پر فقہ کی دوبارہ تشکیل و تدوین غیر ضروری ہوگی۔

6 جون 1997

ابن القیم نے اپنی کتاب مدارج السالکین میں اپنے استاذ شیخ ابن تیمیہ سے اختلاف کیا ہے۔ پھر اپنی اس روش کو درست قرار دینے کے لیے لکھا ہے کہ ہد ہد اور اللہ کے نبی سلیمان کے درمیان درجہ کے اعتبار سے کتنا زیادہ فرق ہے۔ اس کے باوجود قرآن کے مطابق، ہد ہد نے سلیمان سے کہا کہ میں ایک ایسی بات جانتا ہوں جو آپ کو معلوم نہ تھی (27:22)۔ چنانچہ شیخ الاسلام اللہ کے نبی سے زیادہ بڑے عالم نہیں۔ اور شیخ الاسلام پر اعتراض کرنے والا ہد ہد سے زیادہ کم علم نہیں: فَكَمْ بَيْنَ الْهُدْهُدِ وَنَبِيِّ اللّٰهِ سُلَيْمَانَ؟ وَهُوَ يَقُولُ لَهُ: أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ (النمل، 22)۔ وَلَيْسَ شَيْخُ الْإِسْلَامِ أَعْلَمَ مِنْ نَبِيِّ اللّٰهِ۔ وَلَا الْمُعْتَرِضُ عَلَيْهِ بِأَجْهَلَ مِنْ هُدْهُدٍ (مدارج السالکین، جلد 2، صفحہ 52)۔

28 جولائی 1997

ایک ندوی عالم نے کہا کہ میں نے آپ کی کتاب فکر اسلامی پڑھی۔ اس میں آپ نے

عصر حاضر کے اکابر امت پر تنقید کی ہے۔ ہم کو تنقید سے اختلاف نہیں مگر آپ تو ہمارے اکابر کی جڑ اکھاڑ رہے ہیں۔ آخر اس کو کس طرح برداشت کیا جائے۔

میں نے سوچا کہ مذکورہ ندوی عالم نے ایسا کیوں کہا۔ میں نے جن شخصیتوں پر تنقید کی ہے اس میں ان کی نیت، ایمان، اخلاص، عبادت، اخلاق، تقویٰ اور دیانت داری پر کوئی تنقید نہیں کی۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ ان حضرات نے موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو نہیں سمجھا اور اس کے مطابق امت کو رہنمائی نہ دے سکے۔

یہ ان کی شخصیت پر صرف ایک جزئی تنقید ہے پھر مذکورہ ندوی عالم نے ایسا کیوں کہا کہ آپ ہمارے اکابر کی جڑ اکھاڑ رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ یہ تنقید کی غلطی نہیں ہے بلکہ اکابر کے معتقدین کی سوچ کی غلطی ہے۔ اگر وہ ان اکابر کو ایمان و اخلاص اور عبادت و تقویٰ کے اعتبار سے اونچا درجہ دیے ہوئے ہوتے تو ان کو میری تنقید پر مذکورہ شکایت نہ ہوتی۔ اس کے بجائے وہ ان اکابر کی حیثیت امتیازی یہ قرار دئے ہوئے ہیں کہ وہ عصر حاضر کے مجدد ہیں۔ انہوں نے دور جدید کے لحاظ سے امت کو رہنمائی دی۔ اور چونکہ میری تنقید سے ان کی یہ حیثیت امتیازی مشتبہ نظر آئی اس لیے ان کو محسوس ہوا کہ میں ان کی جڑ اکھاڑ رہا ہوں۔

17 فروری 1998

کسی کا قول ہے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم سب لوگ یکساں سوچ رہے ہوں۔ سوچ میں فرق سوچ میں ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ بلاشبہ نہایت صحیح بات ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی فکری پسماندگی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اختلاف رائے کو پسند نہیں کرتے۔ وہ صرف اتحاد رائے سے خوش ہوتے ہیں۔ ایسے کسی گروہ کے درمیان کبھی فکری ارتقا ممکن نہیں۔

20 مارچ 1998

برادرم محمد خالد عطاء اللہ ندوی سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اختلاف اور مشورہ دونوں ایک ہی چیز کے دو الگ الگ نام ہیں جب آپ اختلاف کو کھلے طور پر سنیں اور بشرط صحت اس کو مان لیں تو اسی کا نام مشورہ ہے۔ اور جب آپ اختلاف پر بھڑک اٹھیں اور اس کو ذاتی وقار کا مسئلہ بنالیں تو اس کا نام جھگڑا ہے۔ صحت مند ماحول میں اختلاف یا تنقید مشورہ کی صورت اختیار کر کے عبادت بن جاتا ہے اور جب ماحول غیر صحت مند ہو تو اختلاف یا تنقید صرف باہمی نزاع بن کر رہ جائے گا۔

30 جولائی 1998

ایک صاحب نے ایک بات یہ کہی کہ آپ دوسرے اکابر سے کٹ کر اپنا مشن چلا رہے ہیں، آپ کے لیے زیادہ بہتر یہ تھا کہ آپ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرتے۔ میں نے کہا کہ میں نے ہمیشہ مل کر کام کرنا چاہا اور آج بھی مل کر ہی کام کرنا چاہتا ہوں مگر اس سلسلہ میں میرے تجربات بے حد تلخ ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک مثال دیتے ہوئے میں نے کہا کہ انڈیا کے ایک معروف عالم دین کے ایک قریبی ساتھی سے عین اس موضوع پر میری گفتگو ہوئی۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھ کو مذکورہ عالم دین کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ میں اس کے لیے تیار ہوں مگر اس سلسلہ میں میری ایک شرط ہے۔ وہ یہ کہ فطری طور پر ایسا ہوگا کہ مجھ کو مذکورہ عالم دین سے اختلاف رائے پیش آئے گا۔ ایسے موقع پر میں منافق نہیں بن سکتا۔ میں ضرور اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ مذکورہ عالم دین اگر میرے اظہارِ اختلاف کو برداشت کرسکیں تو میں ان کے ساتھ کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اس کے جواب میں مذکورہ عالم دین کے ساتھی نے کہا کہ جب آپ کو حضرت مولانا سے اختلاف ہو تو آپ اس کا اظہار کرنے کے بجائے اپنے آپ کو متہم کرلیا کریں۔

If you find yourself in disagreement with the Hazrat Maulana, do not voice it. Instead, take the blame upon yourself.

میں نے کہا کہ یہ تو ایسی چیز ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ عام انسان تو درکنار خود اللہ تعالیٰ نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس کی مخلوق پیشگی طور پر اپنے آپ کو متہم کرلیا کرے۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو پیدا کرنے کا ارادہ کیا تو فرشتوں کو ایک اشکال پیش آیا تو انہوں نے کہا: أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ (2:30)۔ یعنی، کیا تو زمین میں ایسے لوگوں کو بسائے گا جو اس میں فساد کریں اور خون بہائیں۔

فرشتوں نے ایسا نہیں کیا کہ اپنے آپ کو متہم کرکے چپ ہو جائیں۔

17 ستمبر 1998

مولانا شبلی نعمانی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے — فطرت انسانی جس قدر اختلاف کے لیے موزوں ہے، اتفاق کے لیے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف کی حالت میں جس طرح تمام جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، اتفاق کی حالت میں نہیں ہوتے (مقالات شبلی، جلد 8، صفحہ 170)۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان اختلاف کے وقت زیادہ بھڑک اٹھتا ہے۔ کیوں کہ اختلاف کے وقت اس کی انا (ego) جاگ اٹھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا امتحان سب سے زیادہ اختلاف کے وقت ہوتا ہے، اتحاد کے وقت نہیں۔ اختلاف کے وقت ہی یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان کیا ہے اور کیا نہیں۔

6 دسمبر 1998

کوئی آدمی کیسا ہے اس کو پہچاننے کا سب سے زیادہ صحیح وقت وہ ہے کہ اس آدمی سے آپ کا اختلاف ہو جائے۔ اختلاف پیدا ہونے سے پہلے تو ہر آدمی ٹھیک ہی رہتا ہے۔ اس

لیے بے اختلافی کی حالت کسی آدمی کو پہچاننے کے لیے کارآمد نہیں۔

8 ستمبر 2000

عباسی خلافت کے زمانہ میں فقہائے اسلام نے ایک بہت اچھا اصول وضع کیا۔ فقہ کے جزئیاتی مسائل میں ان کے درمیان بہت اختلاف تھا۔ اس اختلاف کو قابلِ برداشت بنانے کے لیے انہوں نے ایک اصول مقرر کیا: مَذْهَبِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ، وَمَذْهَبُ الْخَصْمِ خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (الردود والنقود للبابرتی الحنفی، جلد 1، صفحہ 636)۔ یعنی، میری رائے درست ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ غلط بھی ہو۔ فریق ثانی کی رائے غلط ہے اس احتمال کے ساتھ کہ وہ صحیح بھی ہو۔

اس اصول کا یہ فائدہ ہوا کہ فقہا اختلافات کے باوجود اجتماعیت پر قائم رہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید جمہوریت، اسی اصول کے سیاسی انطباق کا نام ہے۔ موجودہ جمہوریت میں ہر آدمی اپنی ایک سیاسی رائے رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ وہ دوسرے کو بھی یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی رائے کو درست سمجھے اور یکساں طور پر اقتدار میں شرکت کا حقدار ہو۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں مذکورہ اصول فقہی جزئیات کے دائرے میں محدود رہا، وہ سیاسی دائرے میں رائج نہ ہوسکا۔ اس کا یہ نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان شخصی حکمرانی یا بادشاہت والی سیاست تو دنیا میں چلا سکے، مگر وہ جمہوری سیاست کو اختیار کرنے میں ناکام رہے۔ خلافت راشدہ کے بعد جمہوری سیاست مسلمانوں میں نہ پہلے کبھی تھی اور نہ آج ہے۔ سیاسی اعتبار سے یہ مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کمزوری کے ساتھ وہ جدید دور میں کبھی بھی کوئی طاقت ور سیاسی نظام نہیں بنا سکتے۔

11 جنوری 2001

قرآن کے بعد حدیث اسلام کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ پچھلے چودہ سو سال میں سب سے زیادہ کام حدیث پر ہوا ہے۔ مگر جو شخص بھی حدیث پڑھتا ہے اس کو حدیث سے کنفیوزن

کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قرآن ایک فکری کتاب ہے۔ اس میں عملی تفصیلات نہیں۔ اس لیے قرآن کے مضامین میں فرق واختلاف کا سوال نہیں۔ مگر حدیث میں اسلامی زندگی کی عملی تفصیلات ہیں۔ اس لیے حدیث میں ہزاروں کی تعداد میں فرق اور اختلاف پائے جاتے ہیں۔

حدیث میں یہ فرق واختلاف فطری تنوع کی بنا پر تھا۔ مگر علما اور فقہا نے غلط طور پر یہ سمجھا کہ حدیث کو قرآن کی طرح ہونا چاہیے۔ تمام حدیثوں سے ایک ہی مسلک اور ایک ہی مسئلہ نکلنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے حدیث میں لامتناہی بحثوں کا سلسلہ چھیڑ دیا۔ ہر عالم اور ہر فقیہ حدیث میں وحدتِ مسلک تلاش کرنے لگا۔ اس کے نتیجہ میں وحدت تو حاصل نہیں ہوئی البتہ علم حدیث اختلافات کا ناقابلِ عبور جنگل بن گیا۔

میں نے اللہ کی توفیق سے یہ دریافت کیا کہ حدیثوں میں فرق واختلاف فطری تنوع کی بنا پر ہے۔ یعنی ہر ثابت شدہ مسلک اپنی جگہ پر درست ہے۔ ان میں نہ کوئی افضل ہے اور نہ کوئی غیر افضل، ان میں نہ کوئی راجح ہے اور نہ کوئی مرجوح، ان میں نہ کوئی ناسخ ہے اور نہ کوئی منسوخ۔ اس دریافت کے بعد میں نے اپنی زندگی کا مشکل ترین کام شروع کیا ہے۔ یعنی آج کل مطالعہ حدیث (شرح مشکاۃ) کے نام سے میں شاید اپنی آخری کتاب لکھ رہا ہوں، جس میں تقریباً 7000 حدیثوں کی تشریح ہوگی۔ آج کی تاریخ تک 1211 حدیثوں کی تشریح ہو چکی ہے اور 610 صفحات لکھے جا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کام کی تکمیل کا انتظام فرمائے۔

یکم فروری 2001

دورِ سائنس میں جو اچھی چیزیں ظہور میں آئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ دو اختلافی رائے رکھنے والے میز پر بیٹھ کر سنجیدہ تبادلۂ خیال کریں۔ یہی طریقہ مذہب میں بھی جاری کرنا

چاہیے۔مختلف مذاہب کو ایک ثابت کرنے کے بجائے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان سنجیدہ بحث کو رواج دیا جائے۔لوگ جذبات اور تعصّبات سے الگ ہوکر خالص علمی انداز میں ایک دوسرے سے گفتگو کریں۔ہر ایک اپنے نقطۂ نظر کو خالص دلیل کی زبان میں بیان کرے۔اور دوسرا بھی خالص دلیل کی زبان میں اس کا جواب دے۔اس طرح سنجیدہ علمی بحث کے ذریعہ سچائی کو دریافت کرنے کی کوشش کی جائے۔یہ سب کچھ علمی طریقہ پر ہو، نہ کہ مناظرانہ طریقہ پر۔

14 فروری 2001

گلبرگہ (کرناٹک) کے ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔وہ گلبرگہ کے ایک مدرسہ میں پڑھاتے ہیں اور وہاں کی مسجد میں امام ہیں۔انھوں نے کہا کہ گلبرگہ میں بدعات کا بہت زیادہ رواج ہے۔مثلاً وہ لوگ مجھ سے فاتحہ دلواتے ہیں، جو مجھ کو بالکل غلط معلوم ہوتا ہے۔میں نے ان کو مشورہ دیتے ہوئے کہا: فاتحہ دیجیے،مگر فتوی نہ دیجیے۔میں نے کہا کہ فاتحہ دینا صحیح ہے یا غلط اس کی بحث نہ کیجیے۔اپنی نیت کو درست رکھتے ہوئے جو وہ کہیں اس کو کردیجیے۔اس کے ساتھ مثبت انداز میں ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیے۔دھیرے دھیرے حالات اپنے آپ درست ہوجائیں گے۔اس کے بجائے اگر آپ نے فتویٰ کا انداز اختیار کیا تو صرف اختلاف بڑھے گا اور کچھ فائدہ نہ ہوگا۔

یکم جولائی 2001

عبادت کے مسائل میں جو اختلافات فقہا کے درمیان پائے جاتے ہیں، ان کی تطبیق امام شافعی نے اس طرح کی ہے:مَذْهَبِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ، وَمَذْهَبُ الْخَصْمِ خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ (الردود والنقود لابن محمود البابرتی الحنفی، جلد 1، صفحہ 636)۔میری رائے درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور فریق ثانی کی رائے غلط ہے احتمال صحت کے

ساتھ۔ میرے نزدیک تطبیق کا زیادہ درست فارمولا یہ ہے کہ یہ کہا جائے: رَأْيِي وَرَأْيُ غَيْرِي كِلَاهُمَا يَحْتَمِلَانِ الصَّوَابَ۔ یعنی میری رائے بھی درست اور میرے علاوہ دوسرے شخص کی رائے بھی درست۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ آمین بالجہر بھی درست اور آمین بالسر بھی درست، رفع یدین کرنا بھی درست اور رفع یدین نہ کرنا بھی درست، وغیرہ۔

19 اکتوبر 2002

بیدر سے محمد ظفر اللہ صاحب کا خط مورخہ 16 اکتوبر ملا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ آپ کی فکر اندھیرے میں مرکزِ روشنی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں یہ فکر پھیلے۔ تمام انسانوں میں رواداری، تحمل، برداشت اور اعراض آجائے تو پھر یہ زمین قابل رشک ہوجائے گی۔

اس خط کا مختصر جواب دیتے ہوئے میں نے لکھا کہ صبر وتحمل کا مقصد زمین کو قابل رشک بنانا نہیں ہے بلکہ خود اپنے آپ کو قابل جنت بنانا ہے۔

22 نومبر 2002

ایک کتاب دیکھتے ہوئے اس میں یہ کلمہ نظر سے گزرا۔ شوہر اور بیوی میں برابر تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ دونوں نے طلاق لے لیا:

The couple quarrelled constantly and finally got a divorce.

زوجین کے درمیان علیحدگی اکثر اسی طرح ہوتی ہے۔ مگر علیحدگی اور طلاق کی یہ کوئی صحیح بنیاد نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فرق زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس لیے اختلاف اور نزاع بھی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ جب بھی زوجین کے درمیان غصہ اور نزاع کی حالت پیدا ہو تو حکمت کے ساتھ اس کو ڈیفیوز (defuse) کرنا چاہیے، نہ کہ اس کو علیحدگی کا سبب بنالیا جائے۔ یہ زوجین علیحدگی کے بعد دوبارہ اسی انسانی سماج میں رہیں گے اور دوبارہ دوسرے لوگوں کے

ساتھ ان کا وہی نزاع ہو جائے گا جو اس سے پہلے میاں بیوی کی حیثیت سے ان کے درمیان ہوا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ نزاع کے مسئلہ کا حل علیحدگی نہیں ہے بلکہ نزاع کو ٹالریٹ کرنا ہے۔

16 فروری 2003

شیخ مصطفیٰ احمد الزرقاء حلب میں 1904 میں پیدا ہوئے۔ ان کی وفات 2002 میں سعودی عرب میں ہوئی۔ ان کی خاص صفت یہ تھی کہ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ چنانچہ وہ عربی کے علاوہ جرمن، فرانسیسی اور انگریزی زبانیں بھی جانتے تھے۔ انہوں نے کثرت سے کتابیں لکھی ہیں۔ فقہ کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ ان کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے:

1960 میں شام کی راجدھانی دمشق میں "فقہ اسلامی ہفتہ" منعقد کیا گیا۔ مسلم فقہا اور علمائے دین کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ ان میں شیخ مصطفیٰ الزرقاء، شیخ محمد ابوزہرہ اور ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی بھی تھے۔ ایک عصری فقہی مسئلہ میں شیخ زرقاء اور شیخ ابوزہرہ کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ مسئلہ انشورنس (بیمہ) کا تھا۔ دونوں نے اپنے اپنے دلائل پیش کیے مگر دونوں میں اتفاق نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر السباعی سے دونوں کے اختلاف رائے کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ استاذ ابوزہرہ فقہ کا کتب خانہ ہیں اور استاذ زرقاء کو فقہ میں ملکہ حاصل ہے۔ (ترجمان دارالعلوم، فروری 2003، صفحہ 43)

7 مئی 2003

دہلی کے ایک تعلیم یافتہ ہندو خاتون لورین چوپڑا ملاقات کے لیے آئیں۔ گفتگو کے دوران انہوں نے کہا کہ انڈیا میں ہندو مسلم جھگڑوں کی جڑ مذہبی اختلاف ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سب مذہب برابر ہیں اور سب مذہب یکساں طور پر سچے ہیں تو یہ آپس کا جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ میں نے کہا کہ سوامی وویکانند اور مہاتما گاندھی جیسے بہت سے لوگ یہی بات

کہتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر بھگوان داس نے اپنے لمبے مطالعہ کے بعد اس موضوع پر ایک تفصیلی کتاب تیار کی۔ وہ 929 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا نام یہ ہے:

The Essential Unity of All Religions by Bhagavan Das, Madras, 1932

میں نے کہا کہ یہ ایک غیر حقیقی اور غیر عملی نظریہ ہے۔ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ تمام مذاہب کی تعلیم ایک ہے، تب بھی موجودہ مذہبی جھگڑے ختم نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کرسکتے ہیں کہ مذہبوں کے ٹکسٹ کو یکساں ثابت کریں۔ مگر آپ انٹرپریٹیشن کے اختلافات کو ختم نہیں کرسکتے۔ مثلاً بھگوت گیتا ایک کتاب ہے۔ مگر بال گنگادھر تلک نے گیتا کا انٹرپریٹیشن ہنسا کے روپ میں دیا اور مہاتما گاندھی نے اہنسا کے روپ میں۔ ایسی حالت میں نتیجہ رخی کام تمام مذاہب کو یکساں ثابت کرنا نہیں ہے، بلکہ اہل مذاہب میں رواداری کا مزاج پیدا کرنا ہے۔

14 مئی 2003

آج مسٹر یاسر ملاقات کے لیے آئے۔ وہ ریسرچ کے طالب علم ہیں اور جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ جماعت اسلامی کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ ایک نوجوان ہیں اور تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کو اختلافی مسائل میں الجھاؤں۔ اس موضوع سے ہٹ کر آپ کو میں صرف دو چیز کا مشورہ دوں گا۔ اور وہ ہے — اخلاص اور علم۔ میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جو چیز سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ نیت کا اخلاص ہے۔ آپ اس اعتبار سے اپنا جائزہ لیتے رہیے۔ اور دوسری چیز یہ کہ آپ اپنی علمی تیاری میں کمی نہ کیجیے۔ اپنے علم میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کیجیے۔

25 مئی 2003

امام حسن بصری 21ھ میں مدینہ میں پیدا ہوئے اور 110ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ ان کے تفسیری اقوال کو لے کر پانچ جلدوں میں ایک تفسیر چھپی ہے:

ماثر المفسر الاثري تفسير الحسن البصري ،شیرعلی شاہ، کراچی، 1993

حسن بصری کے بہت سے عارفانہ قول مشہور ہیں۔ وہ انس بن مالک صحابی کے شاگرد تھے۔ ان کی روایت کردہ ایک حدیث یہ ہے: إِنَّ مِنَ السَّرَفِ أَنْ تَأْكُلَ كُلَّ مَا اشْتَهَيْتَ (سنن ابن ماجہ حدیث نمبر 3352)۔ یعنی، یہ بھی اسراف ہے کہ تم ہر وہ چیز کھاؤ جس کی تمھیں خواہش ہو۔

امام حسن بصری آج ایک معروف اور مسلّم بزرگ اور عالم جانے جاتے ہیں۔ مگر اپنے زمانہ میں وہ ایک نزاعی (controversial) شخصیت تھے۔ بہت سے لوگ ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے مشہور کیا کہ حسن بصری شیعیت کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ وہ جبر وقدر کے معاملہ میں عام علما سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ وہ حلول کے قائل ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ وہ حدیثیں وضع کرتے ہیں، وغیرہ۔

آج کسی شخص سے لوگوں کو کچھ اختلاف ہو جائے تو فوراً وہ اس کو نزاعی شخصیت قرار دے دیتے ہیں۔ حالاں کہ محض اختلاف رائے سے کوئی شخص نزاعی شخصیت نہیں بنتا۔ مثلاً جیسا کہ معلوم ہے کچھ لوگوں کو حضرت عثمان سے سخت اختلاف ہوا۔ اس طرح کچھ لوگوں کو حضرت علی سے سخت اختلاف ہوا۔ اسی طرح کچھ لوگوں کو حسن اور حسین سے اختلاف ہوا۔ اسی طرح حسن بصری، محدث البخاری، احمد بن حنبل النصرانی، ابن تیمیہ، ابن رشد اور شاہ ولی اللہ وغیرہ وغیرہ ہر ایک سے ان کے ہم عصروں نے سخت اختلاف کیا۔ مگر اس بنا پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ نزاعی شخصیت تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی کوئی شخص رواجی اسلوب سے

ہٹ کر کچھ کہے تو لوگ اس کو نزاعی شخصیت قرار دے دیتے ہیں۔

27 جون 2003

آج کل dialogue کا لفظ بہت بولا جاتا ہے یعنی اختلافی مسائل میں باہم بات چیت۔ مگر دنیا بھر میں ہزاروں dialogue کے باوجود اس کا کوئی فائدہ نہ ہوسکا۔ اس کا سبب dialogue کا غیر حقیقت پسندانہ تصور ہے۔ انگریزی لغت کی کتاب ویبسٹر میں dialogue کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

Dialogue means discusion between different ideas in seeking harmony.

فرق واختلاف فطرت کا ایک حصہ ہے، اس کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں فرق واختلاف کو ختم کرنے کے لیے dialogues کرنا ایک بے معنی بات ہے۔ صحیح یہ ہے کہ فرق واختلاف کو اپنے موافق استعمال کرنے کے لیے dialogue کیا جائے۔

10 جولائی 2003

امام ابو یوسف (وفات 182ھ) اور امام محمد دونوں امام ابوحنیفہ کے شاگرد ہیں۔ ان کے درمیان صرف چند سالوں کا فرق ہے۔ امام ابوحنیفہ کی وفات 153ھ میں اور امام محمد کی 189ھ میں ہوئی۔ یعنی ان کے درمیان صرف ایک تہائی صدی کا فرق ہے۔ اس کے باوجود ان دونوں (ابو یوسف اور محمد) نے ایک تہائی مسائل میں امام صاحب سے اختلاف کیا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ جو حالات ان دونوں نے دیکھے وہ امام صاحب نے نہیں دیکھے تھے اور جو چیزیں انہوں نے سنیں وہ امام صاحب نے نہیں سنی تھیں۔ امام محمد نے فرمایا: اگر میرے استاد نے وہ کچھ دیکھا اور سنا ہوتا جو میں نے دیکھا اور سنا ہے تو وہ بھی وہی کہتے کہ جو میں نے کہا ہے۔ اگر تیس سال سے اتنا فرق ہوسکتا ہے تو تیرہ صدیوں سے کتنا فرق ہو جائے گا۔

24دسمبر 2001 کو کویت میں ایک سمینار ہوا۔ اس کا موضوع تھا: اسلامی ثقافت میں اعتدال اور میانہ روی (ثَقَافَةُ الْأُمَّةِ الْوُسْطِ)۔ مذکورہ موضوع پر لکچر دیتے ہوئے ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے یہ بات کہی۔

30جولائی2003

دو صاحبان ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ ایک خاص مشن پر انڈیا آئے ہیں۔ ان میں سے ایک برونئی کے تھے اور دوسرے ملیشیا کے۔ ان کے نام یہ ہیں:

Seah Ling Pau (Brunoi)

Dr. Happy Tong Chan Wah M.D (Malaysia)

انھوں نے کہا کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہر مذہب کا پیغام صرف ایک ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس مشترک مقصد کے اوپر تمام مذاہب کو متحد کریں۔ ان کے بیان کے مطابق، دنیا بھر میں تقریباً دس ملین آدمی ان کے حامی بن چکے ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ نظریہ بہت سے لوگ پیش کر چکے ہیں۔ مگر ہر ایک اس میں ناکام ہوا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ جیسے لوگ، ہر مذہب میں کچھ منتخب اجزاء لے کر اس قسم کی یکسانیت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ حالاں کہ کسی مذہب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے اس کی ساری تعلیمات کو سامنے رکھنا ہوگا، نہ کہ صرف بعض تعلیمات، میں نے کہا کہ اختلاف فطرت کا حصہ ہے اور یہ اختلاف مذاہب کے درمیان بھی موجود ہے۔ آپ ان اختلافات کو ختم نہیں کر سکتے۔ اس لیے اتحاد کا صحیح فارمولا یہ ہے:

Follow one and respect all.

8اپریل2004

مزماریہ کی پیدائش پولینڈ میں ہوئی۔ وہ ایک عیسائی ہیں مگر اسلام کا انھوں نے کافی

مطالعہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک سکھ نوجوان سے شادی کی اور دہلی میں رہتی ہیں۔ انہوں نے جامعہ سے اسلامک اسٹڈیز میں ایم اے کیا ہے اور اب جامعہ سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ پولینڈ میں مختلف مذاہب کی ایک کانفرنس ہوئی اس میں کئی عرب علما بھی شریک تھے۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم اسلام کو ایک تاریخی subject کے طور پر لیتے ہیں:

We take Islam as a historical subject.

ماریہ نے بتایا کہ پروفیسر کے اس بیان پر عرب علما نے سخت احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ اسلام ایک تاریخی subject نہیں ہے۔ اسلام ایک عقیدہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس معاملہ میں غلطی عرب علما کی تھی، نہ کہ مذکورہ پروفیسر کی۔ مسلم علما کو اگر یہ حق ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کو محرف مذاہب یا منسوخ مذاہب قرار دیں تو دوسرے اہل علم کو بھی یہ حق دینا ہوگا کہ وہ اپنے نظریہ کے مطابق اسلام اور دوسرے مذاہب کو تاریخی مظاہرہ (historical phenomenon) بتائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی بھی یک طرفہ نہیں ہوسکتی۔ اگر ہم اپنے لیے رائے کی آزادی چاہتے ہیں تو دوسروں کے لیے بھی ہمیں رائے کی آزادی دینا ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ اس طرح کے اختلافات ہمیشہ ڈائلاگ کا موضوع ہوتے ہیں، نہ کہ احتجاج یا شوروغل کا موضوع۔

26 مئی 2005

پاکستان سے ایک صاحب کا ٹیلیفون آیا۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان میں مسلک کے جھگڑے بہت زیادہ ہیں۔ فلاں مسلک والے امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔ فلاں مسلک کا آدمی مرجائے تو اس کی نماز جنازہ نہ پڑھو۔ فلاں مسلک کے خاندان میں رشتہ نہ کرو۔ فلاں

مسلک کے آدمی کے دسترخوان پر کھانا نہ کھاؤ، وغیرہ۔ انہوں نے پوچھا کہ اس معاملے میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

میں نے کہا کہ میں اس قسم کے اختلافات کو غلو سمجھتا ہوں۔ اور غلو اسلام میں سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس قسم کی غلو آمیز تحریکیں انگریزی نوآبادیات کے زمانے کی دین ہیں، اس سے پہلے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ چوں کہ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کیا تھا، اس لیے مسلمانوں کے اتحاد کو توڑنے کے لیے انگریزوں نے مختلف پہلوؤں سے تفریقی کوشش کی گئیں۔ انگریزوں کا یہ فعل اسلام دشمنی کی بنا پر نہ تھا جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ اپنے دفاع کے طور پر تھا۔

میں نے کہا کہ ان اختلافات کا کوئی تعلق اسلامی شریعت سے نہیں ہے، بلکہ وہ انگریزوں کی وراثت ہے۔ آج بھی یہ جھگڑے صرف برصغیر ہند میں پائے جاتے ہیں۔ عرب ملکوں میں ان جھگڑوں کا کوئی وجود نہیں۔ عرب ملکوں میں اخوان المسلمین نے سیاسی جھگڑے ضرور کھڑے کیے ہیں۔ مگر جہاں تک مسلکی جھگڑوں کا تعلق ہے وہ عرب ملکوں میں موجود نہیں۔

2 ستمبر 2005

دارالعلوم دیوبند کے پڑھے ہوئے دو عالم ملاقات کے لیے آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم لوگ الرسالہ پڑھتے ہیں۔ آپ کی اکثر باتوں سے ہم کو اتفاق ہے البتہ کچھ باتوں میں اختلاف ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ اختلاف تو ہر ایک سے ہوسکتا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے امام مالک کا یہ قول دہرایا: كُلُّ أَحَدٍ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهِ وَيُتْرَكُ إِلَّا صَاحِبَ هَذَا الْقَبْرِ (سیر اعلام النبلاء للذہبی، جلد 8، صفحہ 93)

میں نے کہا کہ اس موقع کے لیے آپ کا یہ حوالہ درست نہیں۔ امام مالک نے یہ بات جزئیات شرع کے لیے کہی ہے، ان کی یہ بات کلیات شرع کے لیے نہیں تھی۔ اور اگر آپ

الرسالہ پابندی سے پڑھتے ہیں تو آپ کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہم جزئیاتی مسائل کو اپنا موضوع نہیں بناتے۔ ہم صرف اساسی مسائل دین کو اپنا موضوع بناتے ہیں اور اساسی مسائل دین میں اختلاف کا کوئی سوال نہیں۔

میں نے کہا کہ ایک بے حقیقی اختلاف اور دوسرا غلط فہمی کی بنا پر اختلاف۔ الرسالہ سے کسی کو حقیقی بنیاد پر اختلاف نہیں ہوسکتا۔ البتہ غلط فہمی کی بنیاد پر اختلاف ہوسکتا ہے اور اس کا حل یہ ہے کہ آپ صاحب تحریر سے رجوع کر کے اس معاملے کی وضاحت معلوم کر لیں۔

16 ستمبر 2005

ایک لمبی حدیث ہے جس کے اندر یہ الفاظ آئے ہیں: الْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ، وَالْفُرْقَةُ عَذَابٌ (مسند احمد، حدیث نمبر 18449)۔ جماعت رحمت ہے، اور نا اتفاقی عذاب ہے۔ اس حدیث میں عام طور پر لوگ جماعت کو تنظیم کے معنی میں لے لیتے ہیں، یعنی تنظیمی گروہ۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس حدیث میں جماعت سے مراد ملّی اتحاد ہے۔ اور فرقہ سے مراد ملّی انتشار ہے۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب ملت کے اندر اتحاد ہوگا تو وہ ہر اعتبار سے کامیاب ہوگی اور جب اس کے اندر انتشار ہوگا تو وہ بے عزت اور ناکام ہوجائے گی۔

29 ستمبر 2005

CPS ٹیم کے ایک صاحب سے میں نے کہا کہ مجھے ٹیم کے لوگوں میں ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیت نظر آتی ہے۔ مگر یاد رکھیے کسی بھی انسانی گروہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ صرف ایک ہوتا ہے۔ اور وہ ہے اختلاف کے وقت برداشت کا ثبوت نہ دینا۔ اختلاف کو نظر انداز کر کے بدستور متحد نہ رہنا۔ اس صلاحیت کو میں آرٹ آف ڈفرینس مینجمنٹ کہتا ہوں۔

میں نے کہا کہ ڈفرینس یا اختلاف ایسی چیز ہے جو ہمیشہ پیدا ہوتی ہے۔ اصحاب رسول میں اختلافات پیدا ہوئے۔ یہاں تک کہ ایک زمانے میں دو پیغمبر ہوں تو ان میں بھی اختلاف

پیدا ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ اور ہارون کے درمیان اختلاف پیدا ہوا اور وہ صورت پیش آئی جس کو قرآن میں حضرت ہارون کی زبان سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي (20:40)۔ یعنی، تم میری داڑھی نہ پکڑو اور نہ میرا سر۔

3 مارچ 2007

2 مارچ 2007 کو اردو صحافت کے پندرہ صاحبان آئے۔ یہ لوگ مولانا آزاد اُردو یونیورسٹی (حیدر آباد) کے شعبہ صحافت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے ساتھ پروفیسر عبدالرحیم بھی تھے جو یونیورسٹی میں صدر شعبہ صحافت ہیں۔ ان لوگوں سے دیر تک بات ہوئی۔ گفتگو کے دوران ایک صاحب نے کہا کہ آپ مسلمانوں کے درمیان متنازعہ شخصیت بن گئے ہیں۔ زیادہ اچھا یہ تھا کہ آپ اپنے آپ کو اس سے بچاتے ہوئے کام کرتے۔

میں نے کہا کہ اختلاف اور نزاع میں فرق ہے۔ مجھ سے بعض معاملات میں لوگ اختلاف کرتے ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں مسلمانوں کے درمیان متنازعہ شخصیت ہوں۔ مجھ سے جن لوگوں کو اختلاف ہے، وہ صرف بعض امور میں طریقِ کار کو لے کر ہے۔ متنازعہ شخصیت بننے کے لیے ضروری ہے کہ اُس سے کسی مسئلہ عقیدے کے بارے میں اختلاف کیا گیا ہو، جب کہ میرے بارے میں ایسا نہیں ہے۔ اگر محض اختلاف سے کوئی شخص متنازعہ شخصیت بنتا ہو تو مسلم تاریخ کی تمام شخصیتیں متنازعہ شخصیت بن جائیں گی۔ کیوں کہ پوری مسلم تاریخ میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں جس سے کسی نہ کسی معاملے میں اختلاف نہ کیا گیا ہو۔

7 مئی 2007

قرآن کی سورہ نمبر 2 میں یہ آیت آئی ہے: فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ (2:102)۔ یعنی، وہ ان سے وہ چیز سیکھتے جس سے مرد اور اس کی عورت کے درمیان جدائی ڈال دیں۔

ہمارے مفسرین عام طور پر اِس آیت کو یہود سے جوڑتے ہیں۔ اِس کو پڑھ کر لوگ صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں صرف یہود کی ایک برائی کا ذکر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک توسیعی مفہوم بھی ہے، وہ یہ کہ ایک عورت اور ایک مرد جب نکاح کر کے میاں بیوی بن جائیں تو ایسی کوئی حرکت کرنا، سخت شیطانی کام ہے جس سے دونوں کے درمیان تعلق بگڑتا ہو اور طلاق کی نوبت آتی ہو۔

11 جولائی 2007

ایک بڑے عالم دین کا اسی مہینہ میں انتقال ہو گیا۔ وہ ایک مخلص اور با اصول آدمی تھے ، ان کے بارے میں ایک مضمون ماہ نامہ الفرقان (لکھنؤ) جولائی 2007 میں چھپا ہے۔ مضمون نگار مولانا کے شاگرد ہیں۔ اُن کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''مولانا کو فقہ حنفی سے خاص مناسبت تھی۔ بلکہ اس کے بارے میں شدید تھے۔ ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میرا ذہن حنفیت کے لیے دلائل ڈھونڈنے میں ویسے چلتا ہے، جیسے ڈھال پر پانی۔ لیکن اِس کے باوجود دیگر مسالک کے علما وائمہ کے احترام اور ان کے مسالک کے بیان میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی۔'' (صفحہ 46)

حنفیت کیا ہے۔ حنفیت، دراصل جزئیات شریعت میں مختلف ترجیحات کے درمیان ایک ترجیح کو اختیار کرنے کا نام ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اِس معاملے میں تصلّب ، غلو کی تعریف میں آتا ہے۔ میری سمجھ کے مطابق ، جزئیات میں تصلّب درکار نہیں ہے، بلکہ توسّع اور تنوّع درکار ہے۔ یہ بات خود حدیث سے ثابت ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَصْحَابِي كَالنُّجُومِ بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1760)۔ یعنی، میرے اصحاب ستاروں کی مانند ہیں، تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو، تم ہدایت پر رہو گے۔ اس حدیثِ رسول سے معلوم ہوتا

ہے کہ صحابہ کے درمیان جزئیات شریعت میں اختلاف ہوگا۔ اگر اختلاف نہ ہوتو یہ کہنے کا کوئی مطلب نہیں کہ: بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (تم ان میں سے جس کی بھی پیروی کرو، تم ہدایت پر رہو گے)۔ ایسی حالت میں جولوگ فقہی جزئیات میں تشدد دکھاتے ہیں، وہ صرف یہ ظاہر کررہے ہیں کہ انھیں دین کی معرفتِ اعلیٰ حاصل نہیں ہوئی۔ میرے تجربے کے مطابق، معرفتِ اعلیٰ کے ساتھ یہ ذہن جمع نہیں ہوسکتا۔

5 جنوری 2008

آج مسٹر میگھانی (Mihir Meghani, M.D) ملاقات کے لیے آئے۔ وہ امریکا میں پیدا ہوئے اور اب وہیں رہتے ہیں۔ وہ ہندو امریکن فاؤنڈیشن کے صدر ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کی تنظیم کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ مذہب کے دائرے میں پلورلزم (pluralism) کو فروغ دینا ہے، یعنی یہ نظریہ کہ تمام مختلف مذاہب سب کے سب یکساں طور پر حق ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔

میں نے کہا کہ اِس قسم کا نظریہ مذہب کے دائرے میں ڈائلاگ کو ختم کرنے کے ہم معنی ہے۔ دوسرے تمام علمی شعبوں میں اختلاف رائے کو برداشت کرتے ہوئے ڈائلاگ کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ کیوں کہ اِس سے علمی اور ذہنی ارتقا کا عظیم مقصد حاصل ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں مذہب کے معاملہ میں یہ تضاد کیوں۔ میں نے کہا کہ اِس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسرے علمی شعبوں میں تو ارتقا (development) کا عمل جاری رہے گا، اور مذہب کے دائرے میں یہ عمل رک جائے گا۔ انھوں نے اِس کا کوئی جواب نہیں دیا۔

5 مئی 2008

آج کشمیر کے ایک صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ انھوں نے اپنا نام عبد الرحمٰن بتایا۔

انھوں نے کہا کہ امت میں اتفاق نہیں، آپ لوگ جو قوم کے رہنما ہیں، اسٹیج پر کیوں نہیں جمع ہوتے۔ آپ لوگوں کو چاہیے کہ ایک اسٹیج پر آ کر اور ایک آواز کی صورت میں سب کو اتفاق کی تلقین کریں۔

میں نے کہا کہ علما اور رہنماؤں کا ایک اسٹیج پر آنا، قوم کے اندر اتفاق پیدا نہیں کرسکتا۔ ہمارے علما اور رہنما بار بار ایک اسٹیج پر اکٹھا ہوئے ہیں۔ مثلاً آزادی سے پہلے تمام لوگ آل انڈیا مسلم لیگ کے اسٹیج پر اکٹھا ہوئے ہیں، مگر آج پاکستان میں علما اور رہنما آپس میں لڑ رہے ہیں۔ آزادی کے بعد آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت بنی۔ اُس میں بھی علما اور رہنما ایک اسٹیج پر اکٹھا ہوئے۔ اس کے بعد آپس میں لڑ کر الگ الگ ہو گئے۔ اس کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ بنا۔ اس میں بھی علما اور رہنما ایک اسٹیج پر اکٹھا ہوئے، مگر اس کے ذریعے قوم میں اتفاق نہ آسکا، وغیرہ۔ ایسی حالت میں اصل مسئلہ اتفاق کی اپیل کا نہیں ہے۔ اتفاق کی اپیل تو ہزاروں بار کی جا چکی ہے۔ اصل چیز یہ ہے کہ لوگوں کو اتفاق کا فارمولا معلوم نہیں۔ وہ فارمولا ہے — اختلاف کے باوجود متحد ہونا۔ اتحاد قائم ہوتا ہے اختلاف کو برداشت کرنے سے، نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔

23 مئی 2008

مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب انصار اور مہاجرین کے درمیان اختلاف ظاہر ہوا، تو ایک صحابی، ابوعبیدہ نے انصار کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: تم لوگ سب سے پہلے خدا کے دین کی نصرت کر کے خدا اور اس کے رسول کے انصار بنے تھے (إِنَّكُمْ أَوَّلُ مَنْ نَصَرَ)، اب تم دین میں اختلاف اور انتشار کی پہل کرنے والے نہ بنو۔ یہ سننا تھا کہ انصار اختلاف سے رک گئے (تاریخ الطبری، جلد 3، صفحہ 221)۔

یہ رول ہر زمانے میں مطلوب ہے۔ اصل یہ ہے کہ عوام مخلص ہوتے ہوئے بھی

جذبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں خواص میں سے ایک شخص کو کھڑا ہونا پڑتا ہے جو امرِ حق کی طرف ان کی رہنمائی کرے۔ مگر موجودہ زمانے کے علما نے یہ رول انجام نہیں دیا۔ بار بار ایسا ہوا کہ عوام نے جذباتی تحریکیں اٹھائیں، مگر خواص علما ایسے موقع پر خاموش رہے، غالباً اس ڈر سے کہ وہ عوام سے کٹ جائیں گے۔ خواص علما کے اِس رویے کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کو صحیح رہنمائی نہ مل سکی۔ مسجد کان پور (1913)، مسجد ایودھیا (1992)، قضیہ فلسطین (1948)، اور قضیہ کشمیر (1979) اِس کی چند مثالیں ہیں۔

19 دسمبر 2008

عباسی دور میں فقہا نے احکامِ شریعت کی تدوین کی۔ اس وقت ان کے سامنے یہ مسئلہ پیش آیا کہ عبادت کے فارم کے بارے میں صحابہ کی رائیں اور اُن کی روایتوں میں اختلاف ہے۔ فقہا نے اِس معاملے کے حل کے لیے ترجیح (preferance) کا اصول اختیار کیا، یعنی کسی ایک کو راجح قرار دے کر دوسری رایوں کو چھوڑ دینا۔

ترجیح کا یہ اصول خالص قانونی معاملات میں درست تھا، جن کا تعلق عدالت سے ہوتا ہے، نہ کہ عام انسان سے۔ مگر انھوں نے عبادت کے معاملے میں بھی ترجیح کے اصول کو اختیار کیا۔ اِس بنا پر مختلف فقہی اسکول بن گئے۔ میرے نزدیک فقہا کا یہ مسلک درست نہیں۔ عبادت کے معاملے میں فرق کو تنوع (diversity) اور توسع پر محمول کیا جائے گا، جیسا کہ حدیث میں آیا ہے: بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ (جامع بیان العلم وفضلہ، حدیث نمبر 1760)۔ یعنی، تم ان (صحابہ) میں سے جس کی بھی پیروی کرو، تم ہدایت پر رہو گے۔

21 دسمبر 2008

بعد کے زمانے میں مسلمانوں کے اندر جو اختلافات ہوئے، اُن کی دو قسمیں ہیں—

ایک وہ جو منحرفانہ گروہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے، وہ جن کی حیثیت منحرفانہ گروہ کی نہیں ہے۔ مثلاً انکارِ حدیث منحرفانہ گروہ کی مثال ہے۔ اور فقہی مسالک غیر منحرفانہ گروہ کی مثال۔ تاہم فقہی طرز فکر نے ایک بہت بڑا نقصان پیدا کیا ہے۔ اور وہ ہے شفٹ آف امفیسس (shift of emphasis)۔ یعنی عبادت کی اسپرٹ پر زور دینے کے بجائے، عبادت کے فارم پر زور دینا۔ اِس کی وجہ سے امت کے اندر فقہی عبادت کی دھوم کے باوجود اسپرٹ والی عبادت ناپید ہے۔

دوسری بڑی غلطی اجماع کو مصدرِ شریعت کی حیثیت دینا ہے۔ اجماع کسی معاملے میں صرف ایک وقتی حل ہے، وہ شریعت کا کوئی نظریاتی ماخذ نہیں۔ کیوں کہ بعد کے زمانے میں اس اجماع پر عمل ناممکن ہوجاتا ہے۔ مثلاً شاتم کے قتل پر اجماع، وغیرہ۔

30 دسمبر 2008

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر اختلافات پیدا ہوتے ہیں۔ اِس اختلاف کو لے کر لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوجاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اتحاد اُسی وقت ممکن ہے، جب کہ اختلاف نہ ہو۔ مگر یہ سوچ درست نہیں۔ اس دنیا میں اتحاد ہمیشہ اختلاف کے باوجود ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کے بغیر۔

12 جنوری 2010

عام طور پر لوگ تنقید یا اختلافِ رائے کو بری چیز سمجھتے ہیں۔ مگر میں اس کو ایک نعمت سمجھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تنقید یا اختلافِ رائے سے ذہن کو ایک نیا رخ حاصل ہوتا ہے، نیا تصور ذہن میں ایمرج کرتا ہے۔ میں اپنے مزاج کے اعتبار سے تنقید کو ہمیشہ معتدل انداز میں لیتا ہوں۔ میں تنقید کو برا نہیں سمجھتا۔

اِس کی ایک مثال آج سامنے آئی۔ آج کل میں اپنی پوتی سعدیہ سے روزانہ انگریزی آرٹکل لکھواتا ہوں۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر اس پر ٹائپ کرتی رہتی ہیں۔ آج میں قرآن کی سورہ فصلت کی اِس آیت پر لکھوار ہا تھا: ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ (41:34)۔ یعنی، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

میں نے سعدیہ کو آرٹکل کا عنوان اِن الفاظ میں بتایا:

Making Friend out of Enemy

سعدیہ نے اِس عنوان سے اختلاف کیا۔ سعدیہ نے کہا کہ یہ مضمون ہم انگریزی پرچے کے لیے لکھ رہے ہیں۔ enemy ایک نیگٹو لفظ ہے اور انگریزی پرچے والے نیگٹو لفظ کو پسند نہیں کریں گے۔ میری لڑکی ڈاکٹر فریدہ خانم اُس وقت موجود تھیں۔ انھوں نے دوسرا عنوان یہ تجویز کیا:

Transforming enmity into Friendship

اِس طرح بحث ہوتی رہی۔ میرا ذہن مزید سوچتا رہا، یہاں تک کہ انگریزی شاعر کولریج (Samuel Taylor Coleridge, 1172-1834) کی مشہور نظم کی ایک لائن (water, water everywhere) مجھے یاد آئی اور اس کے مطابق، یہ عنوان میرے ذہن میں آ گیا:

Friends, Friends Everywhere.

اِس آخری عنوان کو سب نے فوراً پسند کرلیا۔

16 جولائی 2010

حدیث میں آیا ہے کہ بعد کے زمانہ میں اسلام میں دَخَن پیدا ہو جائے گا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3606)۔ یعنی نقص یا کمزوری۔

یہ پیشن گوئی پوری طرح درست ثابت ہوئی۔ بعد کے زمانے کے مسلمانوں نے صرف ایک کام آئڈیل انداز میں کیا۔ وہ ہے قرآن کی حفاظت۔ یہ کام آئیڈیل انداز میں اس لیے ہوسکا کہ براہ راست خدا نے اس کا ذمہ لے لیا ہے۔ اس کے سوا ہر کام جو مسلمانوں نے کیا اس میں کوئی نہ کوئی نقص شامل ہے۔ بعد کے زمانے میں مسلمانوں نے قرآن کی تفسیر کی تو اس سے منصوبۂ تخلیق سے آگاہی کو حذف کر دیا۔ اسی طرح انھوں نے احادیث رسول کی تدوین کی تو اس میں ہر قسم کے ابواب موجود تھے، مگر یہاں بھی منصوبۂ تخلیق سے آگاہی کا باب حذف تھا۔ پھر مسلمانوں نے فقہ کی تدوین کی تو اختلافات کو توسع پر محمول کرنے کے بجائے اس میں ترجیح کا اصول منطبق کر دیا۔ اسی بنا پر کئی فقہی اسکول بن گئے۔ انھوں نے تاریخ لکھی تو اسلامی تاریخ کی تصغیر کر کے اس کو محض سیاست نامہ بنا کر رکھ دیا۔ بیسویں صدی میں مسلمانوں کا سیاسی زوال ہوا تو دوبارہ مسلمانوں کو سیاسی احیا پر ابھارنے کے لیے اسلام کی سیاسی تفسیر کر ڈالی۔ اس طرح وہ چیز جو ایک عملِ مسلک کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو عقیدہ کا مسئلہ بنا دیا، وغیرہ۔

16 مئی 2011

حیدرآباد سے حبیب بھائی کا ٹیلی فون آیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک عرصے سے میں نے ہر کام چھوڑ دیا ہے اور صرف کتابوں کا مطالعہ کرتا ہوں۔ میں نے پایا کہ علما اور مفسرین کی رایوں کے درمیان بہت زیادہ تضاد ملتا ہے۔ اس حالت میں صحیح رائے تک کیسے پہنچا جائے۔

میں نے کہا کہ تضاد ایک اضافی لفظ ہے۔ رایوں میں اختلاف یقیناً پایا جاتا ہے، لیکن

اس کو تضاد کہنا درست نہیں۔ دوسری بات میں نے یہ کہی کہ مطالعے کا معیار یہ نہیں ہے کہ آپ ایک اتفاقی رائے تک پہنچ جائیں۔ اتفاقی رائے ایک خارجی لفظ ہے۔ مطالعے کا صحیح معیار یہ ہے کہ مطالعے کے ذریعے خود آپ کے اندر ذہنی ارتقا ہوتا ہے یا نہیں۔

میں نے کہا کہ میری ملاقات بہت سے ایسے لوگوں سے ہوئی ہے جنھوں نے کتابوں کا بہت زیادہ مطالعہ کیا تھا۔ جب میں نے ان کا حاصلِ مطالعہ پوچھا تو وہ دوسروں پر تنقید کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ میں آپ سے یہ نہیں پوچھ رہا ہوں۔ بلکہ میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ خود آپ کو وزڈم کی کوئی بات ملی۔ بار بار پوچھنے کے باوجود وہ کوئی ایک بھی وزڈم کی بات نہ بتا سکے۔ میں نے کہا کہ مطالعے کا مقصد دوسروں کی غلطیوں کو دریافت کرنا نہیں ہے، بلکہ خود اپنے لیے کوئی مثبت حقیقت کو دریافت کرنا ہے۔

10 جون 2011

Voltaire on democracy: I disapprove of what you say, but I will defend to the death your right to say it. (*The Friends of Voltaire* by S. G. Tallentyre, London, 1960, p. 199)

یہ فرنچ فلاسفر والٹیر (1694-1778) کا قول ہے۔ اس نے کہا کہ جو تم کہہ رہے ہو، اس سے مجھے اختلاف ہے، لیکن میں مرتے دم تک تمہارے حق اختلاف کی حمایت کروں گا۔

یہی موجودہ ڈیموکریسی کی روح ہے۔ مسلم ملکوں میں ڈیموکریسی کا نظام قائم نہ ہوسکا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں یہ روحِ جمہوریت موجود نہیں۔ پاکستان اور ایران اور لیبیا جیسے کئی مسلم ممالک جمہوریت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن وہاں جمہوریت قائم نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان ملکوں کے مسلمانوں میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا مزاج نہیں۔ ان کا نظریہ برعکس طور پر یہ ہے کہ تم اپنے اختلاف کو ختم کرو، ورنہ میں تم کو گولی ماردوں گا۔

24 ستمبر 2011

فرنچ فلاسفر والٹیر (1694-1778) کا ایک قول یہ ہے:

I disapprove of what you say, but I will defend to the death your right to say it.

(*The Friends of Voltaire,* 1960, p. 199)

والٹیر کا مذکورہ قول جمہوریت کی روح کو بتاتا ہے۔ جمہوریت کی روح ایک لفظ میں یہ ہے کہ لوگوں کو اختلاف رائے کا مطلق حق حاصل ہو۔ یہ تصور فرنچ انقلاب (1789) کے بعد اپنی موجودہ شکل میں آیا۔ اس کو آج کل کی زبان میں، حق اختلاف (right to dissent) کہا جاتا ہے۔ یہ حق بہت زیادہ اہم ہے۔ قدیم زمانے میں یہ حق تسلیم شدہ نہیں تھا۔ چنانچہ اکثر ذہین لوگ مار ڈالے گئے۔ مثال کے طور پر پچھلے سو سال میں افغانستان میں ٹاپ کے بارہ لوگ محض اختلاف کی بنا پر مار ڈالے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے میں علمی اور ذہنی ارتقا مغربی ملکوں میں ہوا، وہ مشرقی ملکوں میں نہ ہو سکا۔

10 اکتوبر 2011

میں نے اپنے ایک ساتھی سے بات کرتے ہوئے کہا کہ اگر کوئی شخص میرے بارے میں تنقید یا اختلاف کرے تو آپ ہرگز اس سے بحث نہ کریں، بلکہ صرف یہ کریں کہ اس کو ہمارے مشن کی کوئی کتاب پڑھنے کے لیے دے دیں۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ جب آپ اس سے بحث کریں گے تو بہت جلد یہ بحث دو آدمیوں کے درمیان "انا" کا ٹکراؤ (ego clash) بن جائے گا۔ مگر جب آدمی کتاب پڑھتا ہے تو اس وقت کوئی دوسرا شخص اس کے سامنے نہیں ہوتا جس کے ساتھ "انا" کا ٹکراؤ پیش آئے۔ یہی طریقہ حکمت کے مطابق ہے۔ تنہائی میں جب آدمی کتاب پڑھتا ہے تو وہ اس پوزیشن میں پڑتا ہے کہ وہ معقول ذہن کے تحت کتاب کے

مضامین پر غور وفکر کرے اور معتدل ذہن کے تحت اس کے بارے میں رائے قائم کرے۔

18 نومبر 2011

نئی دہلی میں ایک کرشچین سینٹر ہے۔ اس کا نام ہے CIS ہاؤس (جنگپورہ)۔ 17 نومبر 2011 کو اس سینٹر کے ہال میں ایک پروگرام تھا۔ اس میں اعلیٰ تعلیم یافتہ عیسائی حضرات شریک تھے۔ اس میں ناروے کے تین بیس ایکٹوسٹ بھی موجود تھے۔ اس اجتماع میں صرف میری تقریر تھی۔ اس میں مجھ کو ڈیڑھ گھنٹے کا وقت دیا گیا، 45 منٹ تقریر اور 45 منٹ سوال وجواب۔ یہ پورا پروگرام انگریزی زبان میں تھا۔ اس موقع پر میرے ساتھیوں نے تمام شرکا کو تعارفِ اسلام پر مبنی لٹریچر دیا۔

اجتماع کے خاتمے پر اس کے کنوینر اور ناظم ڈاکٹر سموئل تھامس (فادر) نے ہمارے ساتھی مسٹر رجت ملہوترا کو ایک لفافہ یہ کہتے ہوئے دیا کہ آپ نے پروگرام میں جو لٹریچر تقسیم کیا ہے، یہ اس کے لیے ہے۔ اس لفافے میں 5 ہزار روپے تھے۔ یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ اس اجتماع کا پورا انتظام مسیحی حضرات نے کیا تھا۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو پورا موقع دیا کہ وہ شرکا کے درمیان اسلامی لٹریچر تقسیم کریں۔ پھر آخر میں انہوں نے تقسیم کیے جانے والے لٹریچر کی قیمت بھی شکریہ کے ساتھ ادا کر دی۔

یہ واقعہ دورِ جدید کے مزاج کو بتاتا ہے۔ دورِ جدید کے انسان کا مزاج یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود ہر ایک کا احترام اور اعتراف کرو۔ موجودہ زمانے کے مسلم علما اور رہنماؤں نے دورِ جدید کے اس مزاج کو نہیں سمجھا۔ وہ فرضی شکایتوں کو لے کر دورِ جدید کے خلاف ہو گئے۔ اپنے اس منفی مزاج کی بنا پر وہ دورِ جدید کے ذہن کو اور اس کے امکانات کو سمجھ نہ سکے۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ وہ موجودہ زمانے میں دنیا کے سامنے مذہب کا مثبت تعارف پیش نہ کر سکے۔

2 مئی 2012

انسانوں کے درمیان ایک عجیب فرق پایا جاتا ہے۔ کچھ لوگ جذباتی مزاج کے ہوتے ہیں، اور کچھ لوگ متحمل مزاج۔ اِس فرق کا ایک تجربہ ہمارے مشن میں ہوا۔ لکھنؤ میں ہمارے مشن سے وابستہ ایک گروپ ہمارے یہاں کے شائع شدہ لٹریچر کو لوگوں میں تقسیم کر رہا تھا۔ اِس پر ایک دینی ادارہ کے ذمہ دار سے ان کا اختلاف ہوا۔ چنانچہ ادارے کے ذمہ دار اور ان کے درمیان گفتگو ہوئی۔ دورانِ گفتگو لٹریچر تقسیم کرنے والے ایک صاحب نے کہا کہ آپ کے گرد جو لوگ جمع ہیں، وہ منافق قسم کے لوگ ہیں۔

میرے نزدیک یہ ایک جذباتی اور پرسنل ریمارک ہے، وہ کوئی علمی تبصرہ نہیں۔ دوسری طرف ساؤتھ انڈیا میں موجود ہمارے مشن سے وابستہ دوسرے گروپ کا ان کے ادارے سے اختلاف ہوا۔ اس وقت انھوں نے اپنے ادارے سے جواب میں صرف ایک بات کہی، وہ یہ کہ ہم کو عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر درکار ہے۔ آپ اگر سی پی ایس (نئی دہلی) کے سوا کوئی دوسرا لٹریچر دے دیں تو ہم اُسی کو استعمال کریں گے اور سی پی ایس کے لٹریچر کو چھوڑ دیں گے۔

اختلاف ایک فطری امر ہے، لیکن اختلاف کے وقت آدمی کو چاہیے کہ وہ علمی اسلوب میں اظہارِ خیال کرے۔ پرسنل ریمارک دینے سے وہ سختی کے ساتھ پرہیز کرے۔

21 دسمبر 2013

انسان کے اندر سب سے زیادہ اعلیٰ صفت وہ ہے کہ جس کو صفتِ تفکیر (thinking quality) کہا جاتا ہے۔ ہر انسان مکمل معنوں میں آزادانہ فکر کا حامل ہوتا ہے۔ انسان کی اِسی تخلیقی صفت سے اختلافِ رائے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں کے اندر اختلافِ رائے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا، وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ انسان کے لیے محفوظ موقف کیا ہے، یعنی وہ موقف جس کی بنا پر وہ اللہ کے

سامنے گرفت سے بچ جائے۔ مطالعے کے مطابق، اِس معاملے میں محفوظ موقف یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی فہم کی نسبت سے آزاد ہو، لیکن حکم لگانے کا حق کسی کو حاصل نہ ہو۔ اسی کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ آزادی ہو کہ وہ دیانت داری (honesty) کے ساتھ جس چیز کو حق سمجھے اُس پر قائم رہے۔ دوسرے شخص کے بارے میں اگر وہ محسوس کرے کہ اِس کی رائے غلط ہے تو اِس اختلاف کو صرف ذہنی اختلاف کے درجہ میں رکھے، اس کو فیصلہ (judgement) کے درجے تک نہ لے جائے۔ یہ وہی بات ہے جس کو سیکولر علما اس طرح کہتے ہیں کہ:

Everyone has right to dissent, but no one has right to pass value judgement.

14 جنوری 2015

میرے تجربے کے مطابق شاید دنیا کا سب سے زیادہ مشکل کام یہ ہے کہ جس شخص سے کسی معاملے میں اختلاف ہوجائے اس کے بارے میں آدمی درست رائے پر قائم رہے، وہ غلط رائے قائم کرنے سے اپنے کو بچائے۔ کسی کے بارے میں غلط رائے قائم کرنا بلاشبہ ایک برائی ہے۔ اگرچہ ایسے لوگ دنیا میں بہت کم ملیں گے جو اس غلطی سے اپنے آپ کو بچائیں۔

پانچواں حصہ

سوال وجواب

سوال

اگر انتشار سے ملّت کو نقصان ہو رہا ہے تو اسلام میں اس کا کیا حل ہے؟

جواب

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں میں جو تفریق اور انتشار پایا جاتا ہے، اُس کا سبب میرے نزدیک صرف ایک ہے اور وہ ہے، اختلاف اور تنقید پر غیر ضروری حسّاسیت۔ اس مسئلہ کا حل اختلاف اور تنقید کو ختم کرنا نہیں ہے، بلکہ اختلاف اور تنقید کے بارے میں اپنی غیر فطری حساسیت کو ختم کرنا ہے۔ اتحاد ہمیشہ اختلاف کو برداشت کرنے سے ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔ کیوں کہ اختلافات کا مٹنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔

سوال

میرے بھائی صاحب نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ آج کل کے مسلمانوں کو کس قسم کی رہنمائی کی ضرورت ہے؟ میں نے ان کو یہ جواب دیا کہ آج سب سے زیادہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمانوں کو حقیقت پسند بنایا جائے۔ مگر وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ براہ کرم آپ اس کا جواب عنایت فرمائیں اور اس مسئلہ کو واضح کریں۔ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)

جواب

آپ نے مذکورہ سوال کا بالکل درست جواب دیا۔ رہنمائی کے سلسلہ میں صرف یہ کافی نہیں کہ آدمی نظری یا تاریخی باتوں کو جانے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی لازمی طور پر ضروری ہے کہ وہ یہ جانے کہ زمانی حالات کیا ہیں اور زمانی حالات کے اعتبار سے لوگوں کو کس قسم کی رہنمائی دینے کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک سبق آموز حوالہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ اور

دوسرے کئی قدیم علما نے خفین پر مسح کرنا عقیدہ کے مسئلہ کے طور پر ذکر کیا ہے (الفقہ الاکبر، صفحہ 45)۔ حالاں کہ وہ عقیدہ کا مسئلہ نہیں۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے زمانہ میں کچھ لوگ خفین پر مسح کرنے میں کراہت محسوس کرنے لگے تھے، اس لیے انھوں نے اس کی اہمیت پر زور دینے کے لیے یہ فتویٰ دیا۔ اسی طرح مسلمانوں کے بارے میں بھی یہ دیکھنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں ان کے اندر کیا کمی آ گئی ہے کہ ترقی کی دوڑ میں وہ دوسری قوموں سے پیچھے ہو گئے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ حقیقت پسندانہ طرزِ فکر (realistic approach) ان کے اندر تقریباً ختم ہو گیا ہے۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان عام طور پر جذباتی انداز میں سوچنے لگے ہیں۔ وہ اکثر جذباتی فیصلہ کے تحت اقدام کرتے ہیں۔ حالات کا گہرا تجزیہ اور تعمیری منصوبہ بندی کا مزاج ان میں باقی نہیں رہا۔ یہی ان کے موجودہ مسائل کا اصل سبب ہے۔ ایسی حالت میں موجودہ مسلمانوں کے لیے جس رہنمائی کی ضرورت ہے وہ یقینی طور پر یہی ہے کہ ان کے اس مزاج کی تصحیح کی جائے۔ ان کے اندر سے جذباتیت کا مزاج ختم کیا جائے۔ اس کے بجائے ان کے اندر حقیقت پسندی کا مزاج پیدا کیا جائے۔

اس مزاج کا ایک اور تباہ کن نتیجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان عددی اعتبار سے بہت بڑی طاقت ہیں۔ مگر اپنی بے اتحادی کی بنا پر وہ صرف ایک کمزور قوم بنے ہوئے ہیں۔ اس بے اتحادی کا واحد سبب یہی جذباتیت ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ معمولی اختلاف پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اختلاف کے وقت اپنا اعتدال کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ اس شخص کے دشمن بن جاتے ہیں جو کوئی ایسی بات کہے جس سے وہ اختلاف رکھتے ہوں۔

فرق اور اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ وہ ہر سماج میں اور ہمیشہ باقی رہتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فرق اور اختلاف کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ صحابۂ کرام کے زمانہ میں بھی ان کے اندر بہت سے اختلاف تھے۔ موجودہ دنیا میں اتحاد ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ لوگوں کے اندر اختلاف کو برداشت کرنے کا مزاج ہو۔ اختلاف کے باوجود متحد ہونے کا نام اتحاد ہے، نہ کہ اختلاف کے بغیر متحد ہونے کا، کیوں کہ غیر اختلافی سماج تو دنیا میں کبھی بنایا ہی نہیں جاسکتا۔

سوال

اتحادِ ملت کے لیے وقتاً فوقتاً کوششیں کی جاتی ہیں مگر خاطر خواہ نتائج برآمد کیوں نہیں ہوتے، آپ کے خیال میں اتحادِ ملت کی راہ میں بنیادی رکاوٹیں کیا ہیں؟

جواب

اتحادِ ملت کی رکاوٹ اتحاد کا غلط فارمولا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ اختلاف کو ختم کرو تا کہ اتحاد قائم ہو۔ مگر یہ ایک غیر فطری بات ہے۔ اتحاد کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ اختلاف کو برداشت کرو، تا کہ اتحاد قائم ہو۔

اختلاف کے باوجود متحد ہونے سے اتحاد قائم ہوتا ہے، نہ کہ اختلاف کو مٹانے سے۔ کیوں کہ اختلاف کو مٹانا تو عملاً ممکن ہی نہیں۔ مزید یہ کہ اختلاف کوئی برائی (evil) نہیں، بلکہ وہ عین رحمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ذہنی ارتقا کا واحد ذریعہ ہے، اگر اختلافِ رائے نہ ہو تو ذہنی ارتقا کا عمل رک جائے گا۔ ایسی حالت میں اصل کام یہ ہے کہ اختلاف اور تنقید کے معاملہ میں لوگوں کی غیر ضروری حسّاسیت کو ختم کیا جائے، نہ کہ لاحاصل طور پر خود اختلاف کو مٹانے کی کوشش کی جائے۔

سوال

مسلمانوں کے زوال اور انحطاط کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس زوال و انحطاط کا منبع کہاں

ہے؟ اصلاحِ احوال کی ہر کوشش کیوں ناکام ہوگئی؟ اور یہ سوال کہ اس زوال وانحطاط کے منبع کو بند کرنے کی تدبیر کیا ہونی چاہیے؟ کیا اس کا سب سے بنیادی سبب ہمارے بیچ کئی لاکھ احادیث ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کے دوسو سال بعد مرتب کی گئیں یا کوئی دوسری وجہ ہے، براہِ کرم رہنمائی فرمائیں۔ (سید ثاقب علی ہاشمی، پٹنہ، بہار)

جواب

1۔ امتِ مسلمہ کا زوال کسی پر اسرار سبب کی بنا پر نہیں ہے۔ یہ ایک عام فطری قانون کی بنا پر ہے اور وہ وہی ہے جس کو ابن خلدون (وفات 1406) نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے: إِنَّ الدَّوْلَةَ لَهَا أَعْمَارٌ طَبِيعِيَّةٌ كَمَا لِلْأَشْخَاصِ۔

جن گروہ کا کوئی نظریہ (ideology) نہ ہو، جس کا مقصد صرف کھانا کمانا ہو، اُس کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ عام حالات میں زوال کا شکار نہ ہو، لیکن ایسا گروہ جو ایک نظریہ یا آئڈیالوجی کی بنیاد پر بنے، اُس کے لیے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ اس کی بعد کی نسلوں میں نظریاتی ضعف آجاتا ہے۔ وہ ایک نظریاتی گروہ کے بجائے صرف ایک قومی گروہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی حالت کا نام زوال ہے۔

یہی موجودہ زمانے میں مسلمانوں کا حال ہوا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں اسلام بطور نظریہ یا اسپرٹ باقی نہیں رہا، اب وہ صرف ایک کلچر کے طور پر باقی ہے، جیسا کہ زوال یافتہ قوموں کے درمیان ہمیشہ ہوتا ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمان ایک کلچرل گروپ کی حیثیت سے زندہ ہیں، نہ کہ ایک نظریاتی گروپ کی حیثیت سے۔

موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے درمیان بہت سی اصلاحی تحریکیں اٹھیں، مگر وہ سب کی سب اپنے نشانے کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اِس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ موجودہ

زمانے کے مسلم رہنماؤں نے اِس مفروضے کے ساتھ اپنا کام شروع کیا کہ یہاں ایک ”خیرِ امت“ موجود ہے اوراس کوزندہ کرنے کے لیے صرف یہ کرنا ہے کہ اس کے اندر جوش وولولہ پیدا کردیا جائے۔ اقبال کا یہ شعر اِسی ذہن کی نمائندگی کرتا ہے:

نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کم یابی　　　حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

یعنی اگر نغمہ کا شوق کم پاؤ تو اپنی آواز میں اور شدت پیدا کرو، اگر اونٹ پر بوجھ بھاری ہو تو حدی خوانی کو تیز کرو۔

احیائے امت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے اِس بات کو تسلیم کیا جائے کہ موجودہ زمانے کے مسلمان خیر امت نہیں ہیں، بلکہ وہ ایک زوال یافتہ امت (degenerated community) ہیں۔ اِس اعتراف کے بعد آپ کو صحیح نقطۂ آغاز مل جائے گا، یعنی لوگوں کے اندر سب سے پہلے ایمانی شعور پیدا کرنا۔ مزید یہ کہ اصلاحِ امت کا کام اصلاحِ افراد سے شروع ہوگا، اِس طرح نہیں کہ مسلمانوں کی بھیڑ جمع کرکے اسٹیج سے اُن کے سامنے پُر جوش تقریر کی جائے۔

یہ بھی صحیح آغاز نہیں کہ اسلام کے نام سے بڑے بڑے ادارے یا مسلم حکومتیں قائم کی جائیں۔ اِس قسم کی کوششوں کی مثال ایسی ہی ہے جیسے دیمک زدہ لکڑی پر کوئی عمارت کھڑی کرنا۔ ایسا منصوبہ اِس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بعض جماعتوں نے اصلاحِ ایمان کے نام سے تحریکیں چلائیں، لیکن اصل نشانے کے اعتبار سے وہ بھی ناکام ہوگئیں۔ اِس ناکامی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے فضائل کی کہانیاں سنا کر امت کو بیدار کرنا چاہا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے امانی (البقرۃ، 2:78) کی بنیاد پر کسی قوم کو اٹھایا جائے۔ مگر فضائل کی کہانیوں یا امانی کی داستانوں کے ذریعے کسی زوال یافتہ قوم کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جاسکتا۔

زوال یافتہ امت کو دوبارہ زندہ کرنے کا صحیح طریقہ وہ ہے جو کہ مبنی بر افراد ہو، نہ کہ مبنی برقوم۔ اِس طریقے کو قرآن میں بتا دیا گیا ہے۔ اِس کو سمجھنے کے لیے آپ قرآن کی سورہ الحدید کی آیت 17 کا مطالعہ کیجیے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب "قیادت نامہ" کا مضمون: احیاءِ قلب، احیاءِ حکومت)

2۔ حدیث کی بنیاد پر مسلمانوں کے درمیان اختلاف پیدا ہونا کوئی مسئلہ نہیں ہے، نہ اُس کا کوئی تعلق زوالِ امت سے ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "تجدید دین" کا مضمون: فقہ) حقیقت یہ ہے کہ اختلاف ایک امر فطری ہے، وہ ہمیشہ ہوگا، اختلاف خالق کے تخلیقی منصوبے کا لازمی حصہ ہے۔ اختلاف کو ختم کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا اصل مسئلہ اختلاف کی موجودگی نہیں ہے، بلکہ برداشت کی عدم موجودگی ہے۔

زوال یافتہ نفسیات کی بنا پر موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا حال یہ ہوا کہ وہ اختلاف کو ڈسکشن کا موضوع نہیں بناتے، اختلاف پیش آتے ہی وہ برہم ہو جاتے ہیں، یہ برہمی اتنی زیادہ بڑھتی ہے کہ ٹکراؤ اور جنگ کی نوبت آجاتی ہے۔

اگر آپ کو مسلمانوں کی اصلاح کرنا ہے تو اختلاف کے خاتمے کی ناممکن الحصول کوشش نہ کیجیے، بلکہ اُن کے اندر برداشت اور تحمل کی صفت پیدا کیجیے۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ اختلاف ان کے لیے رحمت بن گیا ہے۔ اختلاف کو اگر ڈسکشن (discussion) کا موضوع بنایا جائے تو اِس سے ذہنی ارتقا ہوتا ہے۔ اور اگر اختلاف کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے تو اختلاف تو ختم نہ ہوگا، البتہ قوم برباد ہو کر رہ جائے گی۔

سوال

کسی کی تعبیر کی غلطی کو واضح کرنا اور تکفیر و تفسیق کا حکم لگانا، ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ (حافظ سید اقبال احمد عمری، عمرآباد، تمل ناڈو)۔

جواب

تعبیر کی غلطی کو واضح کرنا، زیر بحث موضوع کا علمی تجزیہ ہے۔ اس کے برعکس، تکفیر و تفسیق کا حکم لگانا، تنقیص کا فعل ہے۔ پہلی صورت میں زیر بحث موضوع کا علمی پہلو واضح ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری صورت میں عملاً کسی شخص کی شخصی عیب زنی کا فعل انجام پاتا ہے۔

پہلی صورت علمی ارتقا کا ذریعہ ہے، اور دوسری صورت کا حاصل صرف یہ ہے کہ ایک شخص کے خلاف نفرت کے جذبات کو فروغ ملے۔ مثلاً ایک شخص جہاد کے موضوع پر ایک مضمون شائع کرتا ہے، اور اس میں لکھتا ہے کہ جہاد بمعنی قتال حسن لغیرہ ہے، حسن لذاتہ نہیں۔

یعنی وہ کوئی عقیدہ کا مسئلہ نہیں وہ ایک طریقۂ کار (method) کا مسئلہ ہے۔ جہاد بمعنی قتال صرف ضرورت (necessity) کے تحت مطلوب ہوتا ہے، نہ کہ اس اعتبار سے کہ وہ بذات خود کوئی دینی فریضہ ہے۔ اس نقطۂ نظر پر کوئی شخص قرآن و حدیث کی روشنی میں تنقید کرے، اور علمی زبان میں اس کے صحت یا سقم کو واضح کرے، تو وہ ایک جائز فعل ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ یہ شخص اسلام دشمن طاقتوں کا ایجنٹ ہے، وہ مسلمانوں کو فریضۂ جہاد سے ہٹانا چاہتا ہے۔ تو یہ صرف تنقیص یا الزام تراشی ہوگی۔ ایسی تنقید بلا شبہ ایک ناجائز فعل ہے۔ اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں۔

اگر آپ کو ایسا لگتا ہے کہ کسی نے کچھ غلط لکھا یا کہا ہے، تو آپ صرف یہ کیجیے کہ اس کی غلطی کو علمی طور پر واضح کیجیے۔ کیوں کہ اگر آپ الزام تراشی یا تنقیص کی زبان بولیں تو وہ سبّ و شتم ہوگا، جو اسلام میں جائز نہیں۔ حقیقت پسند انسان وہ ہے جو باتوں کو دلائل کے اعتبار سے دیکھے۔ جو بات دلائل سے درست ثابت ہو اس کو مانے، اور جو بات دلائل سے درست ثابت نہ ہو، اس کو رد کردے۔

سوال

باتیں دوطرح کی ہوتی ہیں یامسائل،نظریات دوطرح کے ہوتے ہیں:

(1)منصوصات،یعنی وہ باتیں جوبراہِ راست طور پر قرآن یاحدیث میں بیان کی گئی ہیں۔

(2)مستنبطات،یعنی وہ باتیں جو براہ راست طور پر قرآن و حدیث میں مذکورنہیں ہیں، بلکہ بالواسطہ طور پران کوقرآن وحدیث سے اخذ کیا گیا ہے۔

اول الذکر میں کسی کواختلاف کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔البتہ مستنبطات، یا مستخرجات میں دائرۂ اختلاف وسیع سے وسیع تر ہوتا ہے۔سلف صالحین ، ائمہ مجتہدین ، محدثین تقریباً سبھوں نے اپنے فکر پر دلائل کے ساتھ قائم رہتے ہوئے اپنے مخالف کے بارے میں اس طرح اعلان کیا ہے— نَحْنُ عَلَى الصَّوَابِ مَعَ ٱحْتِمَالِ ٱلْخَطَإِ، أَنْتُمْ عَلَى ٱلْخَطَإِ مَعَ ٱحْتِمَالِ ٱلصَّوَابِ (ہم درست راستے ہیں اگرچہ غلطی کا امکان ہے،اور دوسرے لوگ غلطی پرہیں، اگر یہ امکان ہے کہ وہی حق پر ہوں)،اور یہ کہ غیر منصوصات پر اصرار کے غیرشرعی ہونے پرفقہائے امت کا تقریباً اتفاق ہے۔

ہرصاحب فکر جسے اللہ نے فکرِ مستقل سے نوازا ہو۔اسے یہ اعلان کردینا چاہیے کہ— أَنَا عَلَى ٱلصَّوَابِ مَعَ ٱحْتِمَالِ ٱلْخَطَإِ، أَنْتَ عَلَى ٱلْخَطَإِ مَعَ ٱحْتِمَالِ ٱلصَّوَابِ (میں درست راستہ پر ہوں اگرچہ میرے لیے غلطی کا امکان ہے، اورتم غلطی پر ہو، اگرچہ یہ امکان ہے کہ تم ہی حق پر ہو)۔کیوں اختیارِ حق کے لیے راستہ صاف اور واضح ہے۔(سید احمد اللہ بختیاری،حیدرآباد)

جواب

راقم الحروف کی تحریریں زیادہ تر منصوصات سے متعلق ہوتی ہیں، نہ کہ مستنبطات سے متعلق۔ایسی حالت میں ان تحریروں پر مذکورہ قسم کے احتمال کا اصول چسپاں نہیں ہوتا۔مثلاً

میں یہ کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی حیثیت داعی کی ہے اور غیر مسلموں کی حیثیت مدعو کی۔ یہ یقینی طور پر نص کا مسئلہ ہے، نہ کہ استنباط کا مسئلہ۔

موجودہ زمانہ میں کچھ مسلم رہنما اور مسلم اخبارات ملّی مسائل کو لے کر بار بار ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ٹکراؤ کا ماحول پیدا ہو۔ اس کے مقابلے میں راقم الحروف کا کہنا یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا تعلق خیر خواہانہ رشتہ پر مبنی ہے۔ اس نسبت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے معاملات میں غیر مسلموں سے نزاع کو اوائڈ کریں تا کہ وہ معتدل ماحول قائم ہو جس میں خدائی پیغام کو سمجھنے سمجھانے (افہام وتفہیم) کا پُرامن عمل جاری رہ سکے۔ یہ نظریہ صراحۃً نص قرآنی پر مبنی ہے۔ مثلاً: فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَى رَبِّكَ (22:67)۔ یعنی، پس وہ اس معاملہ میں تم سے جھگڑا نہ کریں۔ اور تم اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو۔ ایسی حالت میں اس مسئلہ کو بیان کرتے ہوئے مجھے یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ ـــــ رَأْيِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الخَطَأَ، وَرَأْيُ غَيْرِي خَطَأٌ يَحْتَمِلُ الصَّوَابَ۔

یہی ہمیشہ خود علمائے امت کا موقف رہا ہے۔ وہ مذکورہ قسم کے جملے صرف مستنبطات کے بیان میں لکھتے ہیں نہ کہ منصوصات کے بیان میں۔ مثال کے طور پر کچھ لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں نماز پانچ وقت کی نہیں ہے بلکہ صرف دو وقت یا تین وقت کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں جب علما صالحین اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں اور یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام میں رات اور دن کے درمیان پانچ وقت کی نمازیں فرض ہیں تو وہ ایسا نہیں کرتے کہ اپنے مضمون کے آخر میں لکھیں کہ نَحْنُ عَلَى الصَّوَابِ مَعَ احْتِمَالِ الْخَطَإِ، أَنْتُمْ عَلَى الْخَطَإِ مَعَ احْتِمَالِ الصَّوَابِ (ہم درست راستے ہیں اگرچہ غلطی کا امکان ہے، اور دوسرے لوگ غلطی ہیں، اگر یہ امکان ہے کہ وہی حق پر ہوں)۔

البتہ کچھ دوسرے قسم کے مسائل جن کی بنیاد نص پر نہیں ہے بلکہ استنباط پر ہے، ان

کے بیان میں علما مذکورہ قسم کا اعتراف درج کرتے ہیں۔ مثلاً علما کا ایک طبقہ اگر یہ اصرار کرے کہ جراب پر مسح کی اجازت صرف اس جراب کے لیے ہے جو قدیم طریقہ کے مطابق چمڑے سے بنایا گیا ہو۔

اب دوسرا عالم اگر یہ کہے کہ صنعتی ریشوں سے بنے ہوئے جدید طرز کے موزوں کا بھی وہی حکم ہے اور ان پر بھی مسح جائز ہے، تو اپنے اس بیان کے ساتھ بطور احتیاط وہ مذکورہ قسم کے احتمالی الفاظ لکھ سکتا ہے، کیونکہ یہ دوسری قسم کا بیان استنباط پر مبنی ہے، نہ کہ براہِ راست نص پر۔ میں ایسے موقع پر ''غالباً'' جیسا کوئی لفظ استعمال کرتا ہوں۔

میری تحریروں کا دوسرا جزء وہ ہے جس کا تعلق جدید حالات کی نسبت سے تدبیر کار پر ہے۔ مثلاً پُرتشدد جدوجہد کے مقابلہ میں پُرامن جدوجہد۔ جلسہ جلوس کے طریقہ کے بجائے گفت وشنید کا طریقہ، اختلافی معاملات میں محاذ آرائی کے بجائے حکیمانہ انداز، خارجی اقدام سے پہلے داخلی تیاری وغیرہ۔

یہ دوسری باتیں بھی اپنی اصل کے اعتبار سے منصوصات پر مبنی ہیں۔ البتہ چونکہ ان کا تعلق خارجی حالات سے ہے اور خارجی حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان باتوں پر انطباق (application) کے اعتبار سے، ایک سے زیادہ رائیں ہوسکتی ہیں۔ اس پہلو سے ایک شخص یہ حقِ اختلاف رکھتا ہے کہ وہ دلائل کے ذریعہ یہ بتائے کہ حالات کی نوعیت اس کے نزدیک اس سے مختلف ہے جو میں نے اپنے مطالعہ سے سمجھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے معاملات میں خود سنتِ رسول میں مختلف نمونے پائے جاتے ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے جن مشرکین سے جنگ کی، اُنھیں مشرکین سے حدیبیہ کے موقع پر آپ نے صلح کرلی۔ اسی طرح آپ نے احد کے موقع پر مدینہ سے تین میل باہر جا کر مخالفین سے مقابلہ کیا، اور پھر احزاب کے موقع پر اُنھیں مخالفین سے مدینہ کے اندر رہ

کردفاع کیا، وغیرہ۔ اس لیے شریعت کا یہ متفقہ اصول ہے کہ — تَتَغَیَّرُ الأَحْکَامُ بِتَغَیُّرِ الزَّمَانِ وَالمَکَانِ۔

تدبیر کار سے متعلق میری جو تحریریں ہیں وہ اسی آخری نوعیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان تحریروں میں مسلمانوں کو جو مشورہ دیا جاتا ہے اس کے ردّ وقبول کی بنیاد یہ ہے کہ حالات کا بے لاگ مطالعہ کر کے ان کی حقیقی نوعیت کو سمجھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ قرآن وسنت کے کون سے احکام ان حالات پر منطبق ہوتے ہیں۔

اس معاملہ میں اگر کسی کو مجھ سے اختلاف ہو تو اس کو الزام تراشی اور بہتان طرازی کے بجائے دلائل اور تجزیہ کی زبان میں بتانا چاہیے کہ میرے نقطۂ نظر کے بجائے دوسرا نقطۂ نظر قرآن وسنت سے کیوں اُس کے نزدیک زیادہ قریب ہے۔

سوال

مولانا صاحب میری ایک مخصوص سوچ ہے کہ دنیا میں جس نے بھی اسلام کے لیے کام کیے، اُس کی نہ ہی تمام باتیں اِس لائق ہیں کہ اُن کو اپنایا جائے اور نہ ہی سب باتیں ایسی ہیں جن کو رد کیا جائے۔ ہمیں کسی کی نیت پر شک نہیں کرنا چاہیے۔ البتہ کسی کی بات سے ہمیں اختلاف ہوسکتا ہے اور یہ ہمارا حق ہے۔ (سہیل بشیر کار، کشمیر)

جواب

1۔ ”کسی کی ہر بات درست نہیں ہوسکتی“ یہ کوئی مطلق بات نہیں۔ اِس طرح کے مفروضے کی بنیاد پر کسی کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ کسی کو اُس وقت تک درست مانیں جب تک اس کی کسی بات کو قرآن اور سنت کی واضح دلیل سے رد نہ کرسکیں۔

اسلام میں اِس قسم کے مفروضے کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس قسم کے بے دلیل مفروضے کا نقصان یہ ہے کہ کہنے والے کے اندر یقین پیدا نہیں ہوتا۔ جب کہ یقین ہر ایک انسان کی

ایک ایمانی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں ارشاد ہوا ہے : خَيْرَ مَا وَقرَ فِي الْقُلُوبِ الْيَقِينُ، وَالِارْتِيَابَ مِنِ الْكُفْرِ (تاریخ دمشق لابن عساکر، جلد 51، صفحہ 240)۔ یعنی، بہترین چیز جو دلوں میں اثر کرتی ہے وہ یقین ہے، اور شک کفر کی علامت ہے۔

اِس مزاج کے لوگ ہمیشہ انفرادی زندگی گزاریں گے، وہ کبھی کسی اجتماعی مشن کا حصہ نہ بن سکیں گے۔ وہ یقین کے ساتھ کسی سے جُڑ نہیں سکیں گے۔ وہ شک کے ساتھ جئیں گے اور شک کے ساتھ اِس دنیا سے چلے جائیں گے۔ اِس طرح کے لوگوں کو اپنے اِس مزاج کی دو بھاری قیمت دینی پڑتی ہے۔ ایک، حق کے معاملے میں بے یقینی، اور دوسرے، اجتماعی زندگی سے محرومی۔

اس طرح کی سوچ کے لوگ اکثر امام مالک کے اس مشہور قول کا حوالہ دیتے ہیں: كُلُّ كَلامٍ يُؤْخَذُ مِنْهُ وَيُرَدُّ (نفح الطیب للمقری، جلد 1، صفحہ 109)۔ یعنی، ہر کسی سے بات لی جا سکتی ہے اور اس کی بات کو رد بھی کیا جا سکتا ہے۔

مگر مذکورہ قسم کے موقف کی تائید کے لیے یہ حوالہ غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص قرآن اور حدیث کے حوالے سے ایک بات پیش کرے تو اُس کو لینا آپ کے اوپر فرض ہو جائے گا۔ یہ فرضیت صرف اُس وقت ختم ہو گی جب کہ آپ خود قرآن اور حدیث کے دلائل سے اُس کا نادرست ہونا ثابت کر دیں۔ اگر آپ کے پاس جوابی دلیل موجود نہیں ہے تو امام مالک کے قول کا حوالہ دے کر مذکورہ قسم کی بات کرنا، میرے نزدیک ایک گناہ کا فعل ہے، وہ کوئی صحیح علمی موقف نہیں۔

سوال

آج مسلمانوں میں ایسی جماعتیں اور گروہ موجود ہیں جن کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں توحید پر زور دیا گیا ہے۔ لہٰذا جماعت اور تنظیم توحید کے اتفاقی مسئلے پر اٹھانی چاہیے اور یہ تنظیمیں

اور جماعتیں اپنے زعم کے مطابق توحید کے اتفاقی مسئلے پر کام کر رہی ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی تمام توحید والی آیتوں کو عوام کے سامنے پیش کر کے کہتے ہیں کہ اے لوگو توحید کو اختیار کرو اور شرک کو چھوڑو۔ اس کائنات میں کوئی داتا، دستگیر، حاجت روا، مشکل کشا اور غوث اعظم وغیرہ نہیں، سوائے مالکِ کائنات کے۔

اس طرح یہ لوگ قرآن کی تمام اُن آیتوں کو جن میں شرک کی مذمّت بیان ہوئی ہے، پیش کر کے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ کلمہ پڑھنے والے شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ لہذا ہم موحد لوگ ان قبر پرستوں (بریلویوں اور شیعوں، وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ ان کی نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔ مسلمانوں کے اس طرح کے دعووں کو سامنے رکھتے ہوئے چند سوالات پیش خدمت ہیں امید ہے آپ تسلی بخش جواب دیں گے:

1۔ کلمہ پڑھنے کے بعد اگر شرک ہوتا رہے تو کیا ایسے شخص پر مشرک کا اطلاق ہوگا؟

2۔ مسلم اور مشرک کی تعریف کیا ہے؟ کیا مسلمان مشرک ہوسکتا ہے؟

3۔ مسلمانوں میں جو لوگ واضح شرک کرتے ہیں اُن کی اقتداء میں صلوٰۃ پڑھنے کی کیا دلیل ہے جب کہ یہ بھی حقیقت ہے کہ مشرک کے اعمال قبول نہیں ہوتے۔

4۔ جب مشرک امام کی اپنی صلوٰۃ نہیں ہوتی تو موحّد مقتدی کی نماز کیسے ہوگی؟

5۔ امتِ مسلمہ کے بہت سے علما اس بات کے قائل ہیں کہ سورہ یوسف کی آیت 106 کی روشنی میں کلمہ پڑھنے والے بھی مشرک ہو سکتے ہیں لہٰذا ان کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔

6۔ جب شراب کا پینے والا شرابی کہلائے گا تو شرک کرنے والا مشرک کیوں نہیں کہلایا جائے گا۔

7۔ کلمہ پڑھنے کے بعد اگر ایک ہندو مندر جاتا ہے تو یہ کام اس کے مسلمان ہونے میں رکاوٹ ہوگا اور اُسے بدستور ہندو سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر دوسرا شخص کلمہ کا اقرار کرنے کے بعد

قبر کا طواف کرتا رہے تو یہ عمل اس کے اسلام میں رکاوٹ کیوں نہیں بنے گا اور ایسا شخص مشرک کیوں نہیں ہوگا؟

8۔آپ کے لٹریچر اور کتابوں میں، میں نے قبر پرستی اور شرک کے پہلوؤں پر اتنا زیادہ زور نہیں دیکھا جتنا زور توحیدی ٹائپ کے لوگ لگاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ کیا ہے، جب کہ آپ بھی شرک کے مخالف ہیں، بلکہ سخت ترین مخالف۔ (عبداللطیف، کراچی، 25دسمبر2002)۔

جواب

اختلاف کی برائی جو موجودہ مسلمانوں میں پائی جاتی ہے اُس کا سبب یہ نہیں ہے کہ مسلم جماعتیں توحید کے بجائے کسی اور عنوان پر کام کررہی ہیں۔ اختلاف کا اصل سبب صرف ایک ہے، اور وہ انتہاپسندی (extremism) ہے۔

موجودہ زمانہ کی مسلم جماعتیں کسی نہ کسی پہلو سے انتہاپسندی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کوئی اعتقادی انتہاپسندی کا شکار ہے، کوئی سیاسی انتہاپسندی کا، کوئی مسائلی انتہاپسندی کا، کوئی گروہی انتہاپسندی کا، کوئی کسی اور انتہاپسندی کا۔ یہی انتہاپسندی موجودہ نزاعات کا اصل سبب ہے۔ انتہاپسندی کو قرآن اور حدیث میں غلو کہا گیا ہے۔ رسول ﷺ نے فرمایا:

إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ بِالْغُلُوِّ فِي الدِّينِ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر3029؛ مسند احمد، حدیث نمبر 1851)۔ یعنی، تم غلو سے بچو، کیوں کہ پچھلی امتیں غلو ہی کے سبب سے ہلاک ہوئیں۔

غلو یا انتہاپسندی (extremism) کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی بات کو اُس کی آخری منطقی حد (logical extreme) تک لے جایا جائے۔ اور پھر اُس کی بنیاد پر انتہائی احکام صادر کیے جائیں۔ اُس کی ایک مثال خود آپ کی زیر نظر تحریر میں موجود ہے۔ توحید پر

زور دینا بہت اچھا ہے۔مگر یہ کہنا اتنا ہی غلط ہے کہ ”یہ کلمہ پڑھنے والے مسلمان چونکہ شرک کرتے ہیں اور شرک کی موجودگی میں نیک اعمال قبول نہیں ہوتے۔ لہٰذا ہم موحد لوگ ان قبر پرستوں (بریلویوں اور شیعوں وغیرہ) کے پیچھے نہ نماز پڑھیں گے اور نہ اُن کی نماز جنازہ میں شریک ہوں گے“۔اسی آخری بات کو حدیث میں غلو کہا گیا ہے۔ اور غلو خود ایک ہلاکت خیز عمل ہے۔ایک شخص کو علم دین حاصل ہو اور علم دین کی روشنی میں اُس نے یہ جانا ہو کہ توحید اسلام میں بنیادی عقیدہ کی حیثیت رکھتی ہے تو ایسے شخص کو حق ہے کہ وہ خیر خواہی کے جذبہ کے تحت لوگوں کو توحید کی طرف بلائے۔

لیکن اس اصلاحی دعوت کے ساتھ اگر وہ یہ حکم لگانے لگے کہ فلاں لوگ چونکہ اُس کے نزدیک مشرکانہ اعمال میں مبتلا ہیں اس لیے اُن کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔حتیٰ کہ اُن کی نماز جنازہ بھی نہیں پڑھی جائے گی تو ایسا شخص خود اسلام کی نظر میں غلط کار قرار پائے گا۔ کیوں کہ وہ غلو کر رہا ہے اور غلو کی اسلام میں گنجائش نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کا کام ایک بے حد نازک کام ہے۔اُس کی ناگزیر شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مصلح ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو جانے۔اُس کو یہ جاننا چاہیے کہ اُس کی ذمہ داری صرف پُرامن انداز میں صراط مستقیم سے باخبر کرنا ہے۔

یہ اُس کی سرے سے ذمہ داری ہی نہیں کہ وہ متعین طور پر لوگوں کے بارے میں حکم لگائے کہ فلاں شخص مشرک ہے۔مصلح کو چاہیے کہ وہ مشرک ہونے کے معاملہ کو خدا کے حوالہ کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف خیر خواہانہ نصیحت تک محدود رکھے۔جن لوگوں کے اندر فرق کرنے کی یہ صلاحیت نہ ہو، اُن کا اصلاح کے میدان میں آنا بذات خود ایک جرم کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کے سوالات کا نمبر وار جواب حسب ذیل ہے:

1۔کسی مصلح کی ذمہ داری صرف یہ ہے کہ وہ سنجیدگی اور خیر خواہی کے ساتھ شرک کے

مسئلہ کو بتائے۔ کسی مصلح کا یہ کام نہیں کہ وہ کسی متعین شخص کو مشرک قرار دے اور اُس کے اوپر شرک کے احکام نافذ کرنے کی کوشش کرے۔ پہلا کام یقینی طور پر جائز ہے مگر دوسرا کام یقینی طور پر جائز نہیں۔ جولوگ ایسا کریں وہ مفسد ہیں، نہ کہ مصلح۔

2۔ مشرک کسی قوم یا نسل کا نام نہیں۔ کسی بھی شخص سے شرک کا فعل سرزد ہو سکتا ہے۔ مگر تعین کے ساتھ کسی کو مشرک قرار دینے کا حق صرف خدا کو ہے، انسان کو نہیں۔

3۔ کوئی مقتدی امام کی نماز نہیں پڑھتا۔ ہر مقتدی خود اپنی نماز پڑھتا ہے۔ امام کے سبب سے کسی مقتدی کی نماز نہ مقبول ہوتی ہے اور نہ غیر مقبول۔ قبولیت کا تعلق تمام تر ہر آدمی کی اپنی نیت سے ہے۔ باجماعت نماز کا مقصد صرف اجتماعیت ہے۔ جس امام کے پیچھے بھی اجتماعیت کا یہ مقصد حاصل ہو جائے وہ درست قرار پائے گا۔ یہ بات حدیث میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے:

الصَّلَاةُ الْمَكْتُوبَةُ وَاجِبَةٌ خَلْفَ كُلِّ مُسْلِمٍ بَرًّا كَانَ أَوْ فَاجِرًا، وَإِنْ عَمِلَ الْكَبَائِرَ (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 594)۔ یعنی، فرض نماز ہر مسلمان کے پیچھے واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا بد اور خواہ اُس نے کبیرہ گناہ کیا ہو۔

یہاں اگر کوئی یہ نکتہ نکالے کہ حدیث میں فاجر یا مرتکب کبائر کا لفظ ہے۔ اُس میں مشرک کا لفظ نہیں تو یہ بھی اُسی غلو کی ایک صورت ہوگی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس قسم کے غلو کرنے والوں پر فرض ہے کہ وہ چُپ رہیں، نہ کہ اس قسم کے فتنہ انگیز الفاظ بول کر امت میں نزاع پیدا کریں۔

4۔ کس مصلّی کی نماز ہوئی اور کس مصلّی کی نماز نہیں ہوئی، اس کا فیصلہ کرنے کا اختیار تمام تر اللہ تعالیٰ کو ہے۔ جولوگ کسی مصلّی کی نماز پر ہونے یا نہ ہونے کا حکم لگائیں وہ اپنی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور حد سے تجاوز کرنا بلاشبہ سخت گناہ ہے۔

5۔کلمہ پڑھنا صرف اسلام میں داخلہ کا اعلان ہے۔کلمہ کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی شرک کے ارتکاب سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا۔

فتنہ کی اس دنیا میں کوئی بھی شخص شرک میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ مصلح کا کام مشرک کی نشاندہی کرنا اور اُس پر حکم لگانا نہیں ہے بلکہ عمومی انداز میں شرک کا مسئلہ بتانا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کو جب اصلاحی خطاب کرنا ہوتا تو آپ فرماتے: مَا بَالُ أَقْوَامٍ يَقُولُونَ كَذَا وَكَذَا (صحیح مسلم، حدیث نمبر 4788)۔یعنی، لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ایسا اور ایسا کہتے ہیں۔

6۔ایک شخص اگر شراب پیتا ہو تو مصلح کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ اُس کے شرابی ہونے کا اعلان کرے اور اُس کو کوڑا مارنے کا فتویٰ دے۔ مصلح کا کام صرف یہ ہے کہ وہ کامل خیر خواہی کے ساتھ شرابی کو نصیحت کرے اور برابر نصیحت کرتا رہے۔اسی طرح اگر کوئی شخص بظاہر شرک میں مبتلا ہے تو مصلح کو چاہیے کہ وہ خیر خواہانہ انداز میں اُس کو سمجھائے۔ مصلح کو اس کا حق نہیں کہ وہ برسرِ عام تعین کے ساتھ کسی کے مشرک ہونے کا اعلان کرے اور اُس کے خلاف فتویٰ جاری کرے۔یہ سب دینی اصطلاح میں غلو کے کام ہیں اور اسلام میں غلو کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

7۔اس معاملہ میں مسلم اور نومسلم دونوں کا حکم ایک ہے۔اور وہ یہ کہ اصلاح کی ہمدردانہ کوشش دونوں کے ساتھ کی جائے گی۔مگر تعین کے ساتھ شرعی حکم لگانے کا کام کسی کے خلاف بھی نہیں کیا جائے گا۔

8۔پیغمبر کا طریقہ یہ ہے کہ سارا زور روحِ دین کو زندہ کرنے پر لگایا جائے۔خارجی اعمال ہمیشہ داخلی روح کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ خارجی اعمال سے اپنے آپ داخلی روح پیدا ہو جائے۔

تکفیر وتفسیق کا موجودہ طریقہ جو مسلمانوں میں ایک عرصہ سے رائج ہے وہ سراسر باطل ہے، شریعت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مذموم طریقہ عباسی سلطنت کے زمانہ میں رائج ہوا اور ''فرق ضالّہ'' کے نام پر وہ کئی سو سال تک جاری رہا۔

یہاں تک کہ یہ نوبت آ گئی کہ ان فتووں کے مطابق، امت مسلمہ میں کوئی بھی شخص مومن ومسلم کی حیثیت سے باقی نہ رہا۔ آخر کار علما نے اتفاقِ عام کے ساتھ یہ فیصلہ کیا کہ تکفیر و تفسیق کے اس کام کو بند کر دیا جائے۔ علما نے اتفاق رائے کے ساتھ یہ اعلان کیا: لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ (الکبائر للذہبی، صفحہ 156)۔ ہم کسی ایسے شخص کو کافر نہیں کہیں گے جو قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے۔

یہی اس معاملہ میں صحیح مسلک ہے۔ قرون مشہود لہا بالخیر میں اس قسم کا تکفیری مشغلہ نہیں ملتا۔ یہ تکفیری مشغلہ عباسی دور میں قدیم عراق میں متکلمین نے پیدا کیا۔ مگر بعد کو علمائے راسخین نے اُس کو رد کر دیا اور یہ متفقہ فیصلہ کیا کہ کسی بھی حال میں اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔

اہل قبلہ کی شرط اُسی قسم کی ایک چیز ہے جس کو تعلیق بالمحال کہا جاتا ہے۔ یعنی ایک بات کسی ایسی بات کے ساتھ مشروط کر دینا جس کا واقع ہونا ناممکن ہو۔ کوئی بھی فرقہ کبھی ایسا نہیں کرے گا کہ وہ کعبہ کے بجائے کسی مندر یا چرچ کی طرف نماز پڑھے۔ پچھلے ہزار سال کے دوران کبھی کسی فرقہ نے ایسا نہیں کیا۔ ایسی حالت میں — لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ کوئی شخص جو اپنے آپ کو مسلمان کہے ہم بھی اُس کو مسلمان کہیں گے۔ ہم اپنی طرف سے کسی کو کافر نہیں بتائیں گے۔

تکفیر وتفسیق کی ممانعت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ برائی کے معاملہ میں لوگوں کو بے عمل یا غیر جانبدار بنا دیا جائے۔ اس کا مطلب عمل کے صحیح رُخ کو بتانا ہے اور وہ یہ کہ برائی کے معاملہ میں ہمارا طریقہ خیر خواہانہ نصیحت کا ہونا چاہیے۔ بقیہ چیزوں کو اللہ کے اوپر چھوڑ دینا چاہیے۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ میری امت کو قحط سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی اور میں نے دعا کی کہ وہ میری امت پر کسی خارجی دشمن کو مسلط نہ کرے۔ اللہ نے میری یہ دعا قبول کرلی اور میں نے یہ دعا کی کہ وہ اُن کو گروہوں میں نہ بانٹے کہ اُن کا ایک گروہ اُن کے دوسرے گروہ کو اپنی طاقت کا مزہ چکھائے۔ اللہ نے اس کو قبول نہیں کیا (مسند احمد، حدیث نمبر 1574)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی تحریک کے غیر مطلوب ہونے کی پہچان کیا ہے۔ وہ پہچان یہ ہے کہ کیا اس تحریک کے ذریعہ مسلمان دو حصوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ جب بھی کسی تحریک کا یہ نتیجہ نکلے کہ مسلمان دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں تو یقینی طور پر ایسی تحریک ایک غیر مطلوب تحریک ہے۔ اُس کو خدا کی مدد حاصل نہیں۔ ایسی تحریک کا اگر پھیلاؤ ہو تو یقینی طور پر یہ پھیلاؤ شیطان کی مدد سے ہوگا، نہ کہ اللہ کی مدد سے۔

دو گروہوں میں بٹنے کا یہ معاملہ سیاسی عنوان سے بھی ہوسکتا ہے اور مذہبی عنوان سے بھی یا کسی اور عنوان سے بھی۔ کسی مسلم تحریک کے مطلوب ہونے کی اصل پہچان یہ نہیں ہے کہ وہ قرآن وحدیث کے نام پر اُٹھائی گئی ہے۔ بلکہ اصل پہچان یہ ہے کہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے اندر اتحاد فروغ پا رہا ہے یا اختلاف۔ جس تحریک کے ذریعے مسلمانوں میں اتحاد فروغ پائے وہ خدا کی مطلوب تحریک ہے اور جس تحریک کے ذریعے مسلمانوں میں تفریق واختلاف فروغ پائے وہ خدا کے نزدیک غیر مطلوب تحریک ہے۔

سوال

گجرات یا ملک کے دیگر حصوں میں جب جب اور جہاں بھی فسادات ہوئے اور ہو رہے ہیں وہاں پر فرقہ پرستوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کون دیوبندی، بریلوی، یا شیعہ اور اہلِ حدیث

ہے۔ بلکہ بنام "مسلم" سب کی جان ومال کو نقصان پہنچایا اور انہیں معاشی طور پر تباہ و برباد کیا۔ تو کیا اب بھی مسلکی اختلافات سے چمٹے رہنا مسلمانوں کے لیے نقصان دہ نہیں ہے؟ اگر ہے تو کیا اس کے لیے کوئی مثبت قدم نہیں اٹھانا چاہیے؟

جواب

دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث، وغیرہ کے درمیان موجودہ قسم کے انتہا پسندانہ مسلکی اختلافات ہر حال میں غلط ہیں۔ فسادات ہوں یا نہ ہوں، انہیں بہر حال ختم ہونا چاہیے۔

جن چھوٹے چھوٹے اختلافات پر یہ گروہ بندیاں کی گئی ہیں، اس قسم کے اختلافات دورِ اول میں بھی موجود تھے لیکن وہ گروہ بندی کا سبب نہیں بنے۔ ان انتہا پسندانہ اختلافات کا سبب صرف ایک ہے اور وہ شفٹ آف ایمفیسس (shift of emphasis) ہے۔ یعنی اساسی باتوں پر زور دینے کے بجائے جزئی باتوں پر زور دینا۔ اس برائی کو ہر حال میں ختم ہونا چاہیے۔

سوال

خلفائے راشدین کو مذہب اسلام میں بنیاد یا ستون کی حیثیت حاصل ہے۔ کیا ان کا بھی کوئی مسلک تھا؟ صحابہ کرام کس مسلک سے وابستہ تھے۔ اگر وہ صرف اور صرف اسلامی قالب میں ڈھلے تھے تو پھر مسالک کو بنیادی حیثیت کیوں دی گئی۔ کیا مسلمان صرف اور صرف حضور اکرم ﷺ کے دور کا مسلمان رہ کر صحیح اور سچا مسلمان نہیں کہلا سکتا ہے؟

جواب

فقہی اختلافات کوئی دور جدید کی چیز نہیں۔ وہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں موجود تھے۔ جو فرق ہے وہ یہ کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں فقہی اختلافات کی بنیاد پر گروہی

مسالک نہیں بنے۔ جب کہ موجودہ زمانہ میں اس قسم کے اختلافات کو لے کر انتہا پسندانہ گروہی مسالک بنا دیے گئے ہیں۔ اس معاملہ کو میں نے اپنی کتاب "تجدید دین" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اسلامی شریعت کے دو بڑے حصے ہیں۔ ایک بنیادی احکام کا حصہ اور دوسرے ضمنی اور فروعی احکام کا حصہ۔ بنیادی احکام سب کے سب یکساں ہیں، اُن میں کوئی فرق و اختلاف نہیں۔ مگر ضمنی اور فروعی احکام میں بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ دونوں قسم کے احکام کے درمیان یہ فرق عین فطری ہے اور وہ ہمیشہ باقی رہے گا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ فروعی اختلافات کو توسع اور تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے۔ اُن کے معاملہ میں رواداری کا انداز اختیار کیا جائے، نہ کہ شدت پسندی کا انداز۔

سوال

سوال یہ ہے کہ جب ہم سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امّت سے ہیں، ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں، تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم نے الگ الگ فرقے اور مسلک بنا لیے ہیں۔ (ایس امین پاشا، کرناٹک)

جواب

مسلمانوں میں مسلک کی بنیاد پر جو مختلف گروہ ہیں، حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، سلفی، یہ تمام گروہ بعد کے زمانے میں بنے ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں یہ گروہ موجود نہ تھے۔ جو گروہ بندی دورِ اول میں نہ ہوئی ہو، بلکہ بعد کے زمانے میں وجود میں آئی ہو، وہ اپنے آپ میں قابلِ ردّ ہے۔ یہ مختلف گروہ فقہی مسلک کی بنیاد پر بنے ہیں، لیکن کوئی بھی گروہ کسی بنیادی اختلاف کے تحت نہیں بنا ہے، بلکہ وہ صرف جزئیات میں اختلاف کے تحت بنا ہے۔

یہ جزئی اختلافات بے اصل نہیں ہیں، وہ خود صحابہ کے درمیان موجود تھے۔ پھر کیا وجہ

ہے کہ صحابہ کے زمانے میں ان جزئیات کی بنا پر الگ الگ گروہ نہیں بنے، مگر بعد کے زمانے میں انھیں جزئیات کو لے کر الگ الگ گروہ بن گئے۔ اس فرق کا سبب جزئیات میں غلو (extremism) ہے۔

صحابہ اور تابعین کے زمانے میں یہ تصور تھا کہ جزئیات میں توسع ہے، یعنی ان میں سے جس پر چاہو، عمل کر سکتے ہو، تم ہدایت پر رہو گے (بِأَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ) جامع بیان العلم، وفضلہ لابن عبد البر: 1684۔ لیکن عباسی دور کے فقہا نے جزئیات کے معاملے میں غلو کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ان میں سے ہر ایک درست نہیں ہوسکتا، ایک درست ہوگا تو دوسرا غلط ہوگا۔ انھوں نے غیر ضروری بحثوں کے ذریعے تعدّد میں توحّد پیدا کرنے کی کوشش کی، یعنی کئی کو ایک بنانا۔ جزئیات میں اس غلو یا تشدد کی بنا پر مختلف فقہی گروہ بن گئے۔

قرآن اور حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ غلو اسلام میں نہیں ہے۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے کہ مسلمان، صحابہ اور تابعین کے دور کی طرف لوٹیں۔ وہ اس اصول کو مان لیں کہ یہ مختلف فقہی مسالک مبتدعانہ طور پر وجود میں آئے ہیں۔ وہ قابل ترک ہیں، نہ کہ قابل پیروی۔

سوال

میرے ایک عزیز نے مجھے تین سو صفحہ کی ایک کتاب دی۔ اس کا نام 'نماز نبوی' ہے۔ اس کتاب کے ٹائٹل پر یہ حدیث لکھی ہوئی ہے کہ اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6008)۔

جن صاحب نے مجھ کو یہ کتاب دی انہوں نے کہا کہ عرب میں زیادہ تر لوگ اسی طرح نماز پڑھتے ہیں۔ اس کتاب کے مطابق، مرد و عورت کے نماز پڑھنے کے طریقہ میں کوئی فرق نہیں۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ہر رکعت کے شروع میں رکوع اور سجدہ سے پہلے ''رفع یدین'' (دونوں ہاتھ کندھوں اور کانوں تک اٹھانا) کرنا ہے۔ عشا کی وتر کی تیسری رکعت میں

دعا قنوت کی جگہ ایک اور دعا کا پڑھنا ہے۔ اس طرح کے کئی طریقوں پر زور دیا گیا ہے جو ہم لوگوں کی نماز سے الگ ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کتاب میں بتایا ہوا طریقہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا طریقہ ہے اور کیا مجھ کو اپنے موجودہ حنفی طریقہ کو چھوڑ کر اس کتاب میں بتائے ہوئے طریقہ پر نماز پڑھنا چاہیے؟ (صوفیہ حیدر، بتیا، بہار)۔

جواب

یہ صحیح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ — صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6008)۔ یعنی، اس طرح نماز پڑھو جس طرح تم مجھ کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات عمومی مفہوم میں ہے، نہ کہ کلی مفہوم میں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی ادائیگی کے اعتبار سے تم لوگ میرے طریقہ پر نماز پڑھو۔ جہاں تک جزئی پہلوؤں کا تعلق ہے، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مختلف ہے۔ اس لیے رسول اللہ کے اس قول کو کلی مفہوم میں لینا ممکن ہی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح نماز پڑھتے تھے۔ اس کو معلوم کرنے کا ذریعہ آپ کے اصحاب کی روایتیں ہیں۔ اصحاب رسول کی یہ روایتیں حدیث کی مستند کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اصحاب رسول نے آپ کی نماز کے جو طریقے بتائے ہیں وہ سب کے سب یکساں نہیں ہیں، بلکہ ان میں بہت سے فرق ہیں۔

ان روایتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نماز کے کچھ اجزا کے بارے میں تمام صحابہ متفق الرائے ہیں۔ مثلاً فجر کی دو رکعت، ظہر کی چار رکعت اور مغرب کی تین رکعت۔ اسی طرح ہر رکعت میں رکوع ایک بار اور سجدہ دو بار۔ یہ اجزا وہ ہیں جن میں کسی بھی صحابی کا کوئی اختلاف منقول نہیں۔ مگر نماز کے کچھ اور اجزا ہیں جن میں خود صحابہ کی روایتوں میں اختلاف پایا جاتا

ہے۔ مثلاً کسی روایت سے آمین بالجہر کا ثبوت ملتا ہے تو کسی روایت سے آمین بالسر کا۔ کسی روایت میں رکوع اور سجدہ کے لیے ایک ذکر ہے تو دوسری روایت میں دوسرا ذکر، وغیرہ۔

آپ نے مذکورہ کتاب میں رسول اللہ کی نماز کا جو طریقہ پڑھا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حدیث کی کتابوں میں صرف اسی طریقہ کا تذکرہ ہے جو اس کتاب میں درج ہے۔

"نماز نبوی" کی یہ تصویر انتخابی طور پر بنائی گئی ہے، نہ کہ کلی طور پر۔ یعنی کچھ روایتوں کو لے کر کہہ دیا گیا کہ یہ نماز نبوی ہے اور اس کے برعکس دوسری روایتوں کو، یا تو لیا نہیں گیا، یا یہ کہہ دیا گیا کہ وہ یا تو منسوخ ہیں یا مرجوح ہیں یا غیر افضل ہیں۔ ترجیح کا یہی خود ساختہ اصول حنفی لوگ بھی استعمال کرتے ہیں اور غیر حنفی لوگ بھی۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کتب حدیث کی جن روایتوں کو منسوخ یا مرجوح یا غیر افضل قرار دیا جاتا ہے، ان کی اس نوعیت کا علم کہاں سے ہوا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ خود روایت کے متن سے ان کی یہ نوعیت ثابت نہیں ہوتی۔ یہ دعویٰ تمام تر فقہا کے اپنے قیاس پر مبنی ہے اور عبادت کے معاملہ میں قیاس قابلِ اعتبار نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، یہ قیاسی فقہ تبع تابعین کے دور میں پیدا ہوئی۔ اس سے پہلے صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں نماز نبوی کی انتخابی تصویر کا طریقہ رائج ہی نہ تھا۔ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں بھی طریق نماز میں یہ اختلافات عملاً موجود تھے۔ مگر وہ لوگ یہ نہیں کرتے تھے کہ مختلف طریقوں میں سے کسی ایک طریقے کو درست قرار دینے کی کوشش کریں، بلکہ ان کا کہنا یہ تھا کہ مختلف صحابہ میں سے جس صحابی کے طریقے کی بھی تم پیروی کرو گے تم ہدایت پر ہو گے اور تمہاری نماز درست نماز قرار پائے گی (لَقَدْ أَوْسَعَ اللَّهُ عَلَى النَّاسِ بِاخْتِلَافِ أَصْحَابِ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم، أَيُّ ذَلِكَ أَخَذْتَ بِهِ لَمْ يَكُنْ فِي نَفْسِكَ مِنْهُ شَيْءٌ) جامع بیان العلم لابن عبد البر، اثر نمبر 1685۔

اصل یہ ہے کہ ظاہری اعتبار سے نماز کے دو حصے ہیں۔ان میں سے ایک کو ارکانِ نماز اور دوسرے کو آدابِ نماز کہا جاسکتا ہے۔ ارکان سے مراد نماز کے وہ اجزا ہیں جن میں تمام صحابہ متفق ہیں اور جن میں تمام صحابہ کی روایتیں ایک ہی تصویر پیش کرتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں آداب سے مراد نماز کے وہ جزئی پہلو ہیں جن میں صحابہ کی روایتوں میں فرق واختلاف پایا جاتا ہے۔اس صورت حال کی صحیح توجیہ یہ ہے کہ ارکانِ نماز میں توحّد (یکسانیت) مطلوب ہے اور آداب نماز میں تنوع۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ مختلف روایتوں میں سے کچھ روایتوں کو چھوڑتے ہیں اور کچھ روایتوں کو لیتے ہیں اور پھر اپنی منتخب روایتوں کی بنیاد پر ایک تصویر بنا کر کہتے ہیں کہ یہ نماز نبوی (صلاۃ النبی) ہے۔ان لوگوں سے کہا جائے کہ جن ثابت شدہ روایتوں کو آپ نے چھوڑا ہے وہ بھی تو آخر نمازِ نبوی ہی کا حصہ ہیں۔اس کے جواب میں وہ یہ کہیں گے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بیان جواز" کے لیے ایسا کیا۔ بیان جواز کا مطلب یہ ہے کہ ایک عبادتی کام کو معروف طریقے کے علاوہ اس دوسرے طریقے سے بھی انجام دیا جاسکتا ہے، مگر وہ رکمنڈیڈ (recommended) نہیں ہے۔

مگر "بیان جواز" کا یہ نظریہ قیاسی ہے۔سوال یہ ہے کہ جب نماز کا کوئی واحد معین طریقہ مطلوب تھا تو اس کی کیا ضرورت تھی کہ "بیان جواز" کے لیے ایک مختلف طریقہ کا نمونہ قائم کیا جائے۔ وہ چیز جو ارکان نماز کی حیثیت رکھتی ہیں وہاں آپ نے بیان جواز کی خاطر کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ پھر بیان جواز کا جو اصول ارکانِ نماز میں غیر مطلوب تھا وہ آدابِ نماز میں کیوں مطلوب ہو گیا۔

اس معاملہ کی نوعیت امام شافعی کی طرف منسوب اس قول سے بہت اچھی طرح واضح ہوتی ہے۔یعنی اگرچہ خود بھی انہوں نے انتخابی اصول کو استعمال کرتے ہوئے نمازِ نبوی کا

ایک طریقہ اختیار کیا۔ مگر اسی کے ساتھ انہوں نے یہ بھی کہا کہ —رَأيي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ وَرَأَيُ غَيْرِي خطأٌ يَحتَمِلُ الصوابَ (میری رائے درست ہے احتمالِ خطا کے ساتھ اور دوسروں کی رائے غلط ہے احتمالِ صحت کے ساتھ)۔

انتخابی تصویر بنانے کی ساری کوشش کے بعد بھی کیا وجہ ہے کہ دونوں فریقوں کے حق میں صرف احتمالِ خطا یا احتمالِ صواب ہی حاصل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک فریق جب کچھ منتخب روایتوں کو لے کر اپنی تصویر مکمل کرتا ہے تو اُس کے بعد اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری تصویر کے علاوہ بھی بہت سی مختلف روایتیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن کو رد کرنا میرے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں تطبیق کا فارمولا وہ نہیں ہے جو امام شافعی نے اپنے مذکورہ قول میں پیش کیا۔ اس کے بجائے تطبیق کا صحیح فارمولا یہ ہے کہ آدابِ نماز میں فرق و اختلاف کے معاملہ کو تنوع (diversity) پر محمول کیا جائے۔ یعنی یہ بھی ٹھیک ہے اور وہ بھی ٹھیک۔

آخری بات یہ ہے کہ آداب نماز کے معاملہ میں روایتوں کا اختلاف کوئی نقص کی بات نہیں بلکہ وہ عین مطلوب ہے۔ نماز کوئی مشینی عمل نہیں، وہ کیفیت کے ساتھ ادا کیا جانے والا ایک روحانی عمل ہے۔ مشینی عمل میں کلی یکسانیت ہوسکتی ہے مگر کیفی عمل میں کلی یکسانیت ممکن نہیں۔ کیفی عمل میں بنیادی ارکان کے اعتبار سے تو ضرور یکسانیت ہوگی مگر اس کے جزئی پہلوؤں میں فطری طور پر کچھ نہ کچھ فرق ہوجائے گا اور یہ فرق عبادت گزار کی داخلی کیفیت کی بنا پر ہوگا۔

داخلی کیفیت کے اعتبار سے نماز کے جزئی پہلوؤں میں فرق ہونا خود احادیث سے ثابت ہے۔ مثال کے طور پر ایک صحابی کا رکوع سے اٹھنے کے بعد خلاف معمول طور پر یہ کہہ اٹھنا: رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کی تصدیق فرمانا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 799)، وغیرہ۔

سوال

احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے مسائل میں صحابہ کی روایتوں میں اختلاف ہے۔ مثلاً بعض روایتوں میں سینے پر ہاتھ باندھنے کا ذکر ہے اور بعض دوسری روایتوں میں ناف کے نیچے باندھنے کا۔ اس طرح کے اختلافات کی موجودگی میں اس فرمانِ رسول پر کس طرح عمل کیا جائے گا: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6008)۔ یعنی، تم لوگ اس طرح نماز پڑھو، جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔

(محمد امین گڈّو، سری نگر، کشمیر)

جواب

اس طرح کے اختلاف سے معلوم ہوتا ہے کہ آداب نماز میں توسع کا اصول ہے۔ اس لیے توحد کے اصول پر کوئی ایک نمونہ قائم کرنے کی کوشش درست نہیں۔ فقہا کی کثیر تعداد نے بجاطور پر کہا ہے کہ — رَأْيِي صَوَابٌ يَحْتَمِلُ الْخَطَأَ وَرَأْيُ غَيْرِي خطأٌ يَحتَمِلُ الصوابَ (میری رائے درست ہے احتمال خطا کے ساتھ اور فریق ثانی کی رائے غلط ہے احتمال صواب کے ساتھ)۔

ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں روایتوں کے اختلاف کو ایک ثابت کرنے کی ساری کوشش کے باوجود صرف احتمال ثابت ہوتا ہے تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس اختلاف کو توسع پر محمول کیا جائے اور میرے نزدیک یہی محدثین کا مسلک تھا۔

نماز اپنی حقیقت کے اعتبار سے خشوع کا ایک عمل ہے، نہ کہ محض کچھ ظواہر کی صحت ادائیگی کا عمل۔ ایسی حالت میں ظاہری آداب میں فرق ہونا ایک فطری بات ہے۔ نمازی کو چاہیے کہ اپنا سارا دھیان داخلی کیفیت پر دے، نہ کہ ظاہری ہیئت پر۔ چنانچہ ظاہری ہیئت کی صحت ادائیگی کے باوجود ایک شخص کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

تھا: اِرْجِعْ فَصَلِّ فَإِنَّكَ لَمْ تُصَلِّ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 793)۔ جاؤ پھر سے نماز پڑھو، کیوں کہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔

سوال

مجھے 1998 سے آپ کی کتب اور الرسالہ سے استفادے کا موقع مل رہا ہے۔ الحمدللہ آپ کی تحریروں سے بے بہا ایمانی و روحانی، علمی وفکری و اخلاقی منفعت حاصل کرتا رہا ہوں۔ آپ کا لٹریچر میرے بہترین فکری وعملی گائڈ میں سے ہے۔ بالخصوص اس میں روحانیت وربانیت کی جو غیر معمولی غذا ہے، اُس سے میرے اندر بندگی اور مالکِ کائنات کے استحضار کا گہرا ذوق بیدار ہوا ہے جو میری زندگی میں سب سے زیادہ قیمتی اثاثہ ہے۔

اس کے علاوہ دینِ انسانیت کی وسعت وسمائیت کا جو ادراک آپ کی تشریحات سے ملتا ہے اور زندگی کے روزمرہ واقعات سے دنیا وآخرت کی گہری حقیقتوں کی یاددہانی کا جو داعیہ بیدار ہوتا ہے اور اِس کے علاوہ عمل و کردار واخلاق سے متعلقہ دیگر فوائد جو میسر آتے ہیں، اُس پر میں بس بارگاہ ربُ العزت میں یہ دعا کرسکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو پوری امت وملت وانسانیت کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

دسمبر 2013 کا الرسالہ دیکھا۔ اُس میں صفحہ 7 پر یہ تذکرہ ہے کہ ابوبکر صدیق نے صحابہ کے مشورے سے قرآن کو ایک جلد کی صورت میں تیار کرانے کے لیے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت کو مقرر کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر موریس بکائی کے الفاظ میں ڈبل چیکنگ سسٹم کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے پورا قرآن مرتب کیا۔ کتابتِ قرآن کی تکمیل کے بعد اِن اوراق کی ایک جلد بنائی گئی۔ یہ جلد چوکور صورت میں تھی، اس لیے اس کا نام رَبعہ رکھا گیا، یعنی چوکور سائز کی کتاب۔ اِس رَبعہ کو ایک مستند نسخے کے طور پر حضرت حفصہ کے گھر رکھوا دیا گیا۔ اس رَبعہ کی تیاری کے لیے قرآن کے جو متفرق اجزا اکٹھا کیے گئے تھے، اُن کا ایک ڈھیر مسجد نبوی

میں موجود تھا۔ صحابہ کے مشورے سے اس پورے ڈھیر کو اُس کے مالکان کو واپس نہیں کیا گیا، بلکہ اُن سب کو جلا کر ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد صفحہ 8 پر آپ نے حضرت عثمان کے زمانے میں اختلاف قرأت کا حوالہ دیا ہے۔ اِس میں بتایا گیا ہے کہ بہت سے صحابہ نے بطور خود لکھ کر قرآن کے اپنے اپنے مجموعے تیار کر رکھے تھے جن میں بہت سے فرق موجود تھے۔ اِن نسخوں کی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں قرأت قرآن کے بارے میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا۔ کوئی شخص ایک انداز سے قرآن پڑھتا، اور کوئی دوسرے انداز سے۔

اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے کا تیار کردہ مستند نسخہ حضرت حفصہ کے گھر سے منگوایا۔ اُس کی بہت سی نقلیں تیار کرائیں۔ مسلم ممالک کے مرکزی شہروں میں قرآن کی یہ مستند نقلیں اور معیاری نسخے بھجوائے اور پھر صحابہ کے جمع کردہ نسخوں میں قرأتِ قرآن میں فرق کا جو مسئلہ موجود تھا، اُس کا حل یہ نکالا کہ ان تمام غیر سرکاری نسخوں کو اکٹھا کروایا اور پھر صحابہ کی موجودگی میں اُن کو جلا کر ختم کر دیا۔

میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کی رائے میں اختلافِ قرأت کا مسئلہ کیا ہے؟ ہمارے ہاں اس حوالے سے جو روایات پائی جاتی ہیں اور پھر ہمارے مدارس میں سبعہ یا عشرہ قرأت جو پڑھائی جاتی ہیں، کیا اُن کو تسلیم کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے؟ اور کیا اس طرح معنوی پہلو سے قرآن کے مطالب میں جو فرق واقع ہوتا ہو، خواہ وہ بظاہر بالکل معمولی قسم کا ہو، اِس سے قرآن کی حتمیت و حاکمیت اور لاریبَ فیہ کی حیثیت میں کوئی رخنہ پیدا نہیں ہوتا؟

(اسفندیار عظمت، پاکستان)

جواب

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے، اس کو قرأت سبعہ کی روایت

کہا جاتا ہے۔ اِس کا خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ مختلف عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ اِن قبائل کی زبان مشترک طور پر عربی تھی، لیکن ہر ایک کا لہجہ الگ الگ تھا، جیسا کہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ جب قرآن لوگوں کے درمیان پھیلا تو ہر ایک اپنے اپنے قبیلے کی زبان میں اُس کو پڑھنے لگا۔

اِس پر لوگوں کے درمیان اختلافات ہوئے۔ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک لہجے میں قرآن کو سنتے تھے اور صحابہ اس کو دہراتے تو وہ مختلف لہجات (accents) میں اُس کو دہراتے۔ یہ اختلاف بعض اوقات شدت اختیار کر لیتے، یہاں تک کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک بار ایک صحابی کو اپنے سے مختلف لہجے میں قرآن کو پڑھتے ہوئے سنا تو انھوں نے کہا كَذَبْتَ (تم نے جھوٹ کہا)۔ جب یہ اختلاف بڑھا تو لوگ اس مسئلے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے۔ آپ نے ہر ایک کے قرآن کو پڑھوا کر سنا اور پھر ہر ایک کے لہجے کی تصویب فرمائی (هَكَذَا أُنْزِلَتْ)۔ آپ نے کہا کہ تم جس طرح پڑھتے ہو، اسی طرح پڑھو، کیوں کہ قرآن سات لہجوں میں اتارا گیا ہے۔ إِنَّ الْقُرْآنَ أُنْزِلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ (مسند احمد، حدیث نمبر 158)۔

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے ایک دوسرے صحابی سے کہا: إِنَّ هَذَا الْقُرْآنَ نَزَلَ عَلَى سَبْعَةِ أَحْرُفٍ، فَأَيُّ ذَلِكَ قَرَأْتُمْ أَصَبْتُمْ، فَلَا تَمَارَوْا فِي الْقُرْآنِ، فَإِنَّ مِرَاءً فِيهِ كَفَرٌ (فضائل القرآن لابی عبید، صفحہ 337)۔ بیشک قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، پس تم جس طریقے سے قرأت کرو گے، تم نے درستگی کو پالیا۔ تم لوگ قرآن میں جھگڑا نہ کرو، کیوں کہ قرآن میں جھگڑا کرنا کفر ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری لابن حجر العسقلانی، جلد 8، صفحہ 639۔

اِس سلسلے کی مختلف روایات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سات قرأت کا

مطلب، سات مطلوب قرأت نہیں ہے، بلکہ سات رعایتی قرأت ہے۔ قرآن کی مطلوب قرأت صرف وہی ہے جو قبیلۂ قریش کے لہجے کے مطابق ہے۔ کیوں کہ عرب میں قریش کا لہجہ ہی اسٹینڈرڈ لہجہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ زبان کا لہجہ ابتدائی عمر میں بن جاتا ہے۔ کوئی آدمی بعد کی عمر میں اپنے لہجے کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا۔

اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ جہاں تک قرآن کی کتابت کا معاملہ ہے، اُس کو قریش کے اسٹینڈرڈ لہجے کے مطابق لکھا جائے گا، البتہ رعایتی طور پر لوگوں کو اجازت ہوگی کہ لوگ اپنے اپنے قبیلے کے لہجے کے مطابق، قرآن کو پڑھیں۔ اس حقیقت کو ایک دوسری روایت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ (موطا امام مالک، حدیث نمبر 242)۔ یعنی، اس میں سے جو آسان ہو، وہ پڑھو۔

سوال

ایک بڑی جماعت ہے جس کا نام "جماعت المسلمین" ہے۔ مسلمانوں کی یہ جماعت اس بات پر بہت زور دیتی ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی نہیں بلکہ فرقہ بندی شرک ہے، لعنت ہے، کفر ہے اور عذاب ہے بلکہ فرقہ بندی حرام بھی ہے: وَّلَا تَفَرَّقُوْا (3:103)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری امت کے 72 فرقے جہنم میں جائیں گے اور ایک فرقہ جنتی ہے، اور وہ "الجماعۃ" ہے (مسند احمد، حدیث نمبر 16937)۔ کتاب اللہ اور فرمانِ رسول کے مطابق، تمام مسلمانوں کو جماعت المسلمین سے جُڑنا چاہیے اور اُس کے امیر کی اطاعت کرنی چاہیے اور تمام فرقوں سے علیٰحدہ رہنا چاہیے: تَلْزَمُ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِينَ وَإِمَامَهُمْ ... فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا (صحیح البخاری، حدیث نمبر 3606؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 3606)۔ مزید برآں جماعت المسلمین کہتی ہے کہ اسلام نے اجتماعیت کو

فرض قرار دیا ہے: عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ وَإِيَّاكُمْ وَالْفُرْقَةَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2165)، اور یہ کہ امیر کی بیعت نہ کرنے والا جاہلیت (کفر) کی موت مرتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلم کو جماعت المسلمین کے امیر کے ہاتھ پر بیعت کرنی چاہیے: وَمَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِي عُنُقِهِ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً (صحیح مسلم، حدیث نمبر 1851)۔

لہٰذا حکم رسول کے بموجب، جماعت المسلمین کے علاوہ تمام فرقوں سے دینی معاملات میں علیٰحدگی اختیار کرنی چاہیے۔ تا کہ ہر مسلم کی موت اسلام پر ہو، نہ کہ فرقہ وارانہ مذاہب پر۔ مزید براں کہ جماعت المسلمین کے افراد اپنی جماعت کے علاوہ کسی مسلمان کو مسلم نہیں سمجھتی اور تمام دینی امور مثلاً صلوٰۃ، نمازِ جنازہ، شادی بیاہ اور رویت ہلال وغیرہ میں امت سے الگ رہتی ہے۔ براہِ کرم آپ کتاب وسنت کی روشنی میں وضاحت کریں کہ آیا اس قسم کا عقیدہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے یا یہ عقیدہ غُلو میں داخل ہے جس سے قرآن (4:171) نے سختی سے روکا ہے (لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ)۔ عبداللطیف، کراچی۔

جواب

مجھ کو قرآن وحدیث کا جو علم ہے اس کی روشنی میں، میں کہوں گا کہ یہ خود سب سے بڑا گناہ ہے کہ کچھ لوگ بطور خود ایک جماعت بنائیں اور اس کا نام ''الجماعت'' رکھ کر یہ کہیں کہ یہی وہ ''الجماعت'' ہے جس کا ذکر حدیثِ رسول میں آیا ہے۔ جو شخص ہماری جماعت میں شامل ہو وہ حق پر ہے اور جو اس میں شامل نہ ہو وہ باطل پر ہے۔ اس قسم کا فعل جماعت بندی یا فرقہ بندی ہے، اور یہی وہ تفرق ہے جس سے قرآن وحدیث میں منع کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں مختلف حدیثوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں یہ مطلوب ہے کہ لوگ ہمیشہ اُمت کے مجموعے سے جُڑے رہیں، وہ امت کے مجموعے کو مختلف ٹکڑوں میں تقسیم نہ کریں۔ میرے نزدیک امت سے وابستہ رہنے کی تاکید جو حدیث میں کی گئی ہے وہ

دُنیوی اتحاد کے اعتبار سے ہے۔ دنیا میں مسلمان ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بحیثیت امت کمزور نہ ہوجائیں، اِس کے لیے ضروری ہے کہ لوگ اختلاف کے باوجود متحد ہوکر رہیں۔ اختلاف کی حالت میں اُس کے اوپر کوئی دینی فتویٰ نہ لگائیں بلکہ اجتماعیت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے معاملے کو خدا کے اوپر ڈال دیں۔

اسی لیے علما نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ — لَا نُكَفِّرُ أَحَدًا مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ (الکبائر للذہبی، صفحہ 156)۔ یعنی جو شخص قبلے کی طرف رُخ کر کے نماز ادا کرے اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ جہاں تک اُس "الجماعت" کی بات ہے جو آخرت میں جہنم سے محفوظ رہے گی اور جنت میں جگہ پائے گی، اُس کا تعلق کسی خود ساختہ جماعت یا فرقے سے نہیں بلکہ اس کا تعلق ایک ایسے گروہِ افراد سے ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک "الجماعۃ" قرار پائے۔

مذکورہ حدیث میں جس "الجماعۃ" کا ذکر ہے اس سے مراد معروف معنوں میں کوئی تنظیم نہیں ہے۔ کسی خود ساختہ جماعت کو "الجماعۃ" کہنا اپنے آپ کو اِس خطرے میں ڈالنا ہے کہ ایسے لوگ کبھی "الجماعت" (فرقہ ناجیہ) میں شامل نہ کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس حدیث میں الجماعت سے مراد متفرق افراد کا گروہ ہے، نہ کہ کوئی منظّم جماعت، جو صدر اور سکریٹری کے تحت وجود میں آتی ہے۔ اس مطلوب الجماعت کی پہچان یہ ہے کہ وہ اس حدیثِ رسول: مَنْ كَانَ عَلَى مَا أَنَا عَلَيْهِ، وَأَصْحَابِي (المعجم الکبیر للطبرانی، جلد 8، صفحہ 152) کا مصداق ہو۔ یعنی، وہ اس راستہ پر رہے جس میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔

یعنی وہ پوری سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ رسول اور اصحاب رسول کو اپنا اُسوہ بنائے۔ وہ ہر معاملے میں یہ دیکھے کہ دورِ اوّل میں جب اس قسم کی صورت حال پیدا ہوئی تو رسول اور اصحابِ رسول نے اُس موقع پر کس قسم کی روش اختیار کی اور پھر رسول اور اصحابِ رسول کے یہاں جو روش ملے اُس کو کسی تاویل کے بغیر اختیار کر لے۔ آپ نے اپنے خط میں جس جماعت کا ذکر

کیا ہے وہ بلاشبہ اُس برائی کا شکار ہے جس کو قرآن اور حدیث میں غُلو کہا گیا ہے۔

جب آپ کسی کو ایسی حالت میں دیکھیں جو آپ کے نزدیک بُرائی ہے تو آپ کو صرف یہ حق ہے کہ پوری خیر خواہی اور دل سوزی کے ساتھ اس کو نصیحت کریں، اور اپنی تنہائیوں میں اس کے لیے رو کر دعا کریں۔ ضروری دلائل کے ساتھ اس کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں تاکہ وہ اپنی بری روش کو چھوڑ دے۔

اس قسم کی پُرامن اور خیر خواہانہ نصیحت کا حق ہر شخص کو ہے۔ لیکن جب کوئی شخص نصیحت سے آگے بڑھ کر یہ کرے کہ وہ برائی کرنے والے پر حُکم لگانے لگے، وہ برائی کرنے والے کا بائیکاٹ کرے، وہ برائی کرنے والے کے خلاف تشدد کو جائز سمجھے تو یہ دوسری صورت غلو کی صورت ہوگی اور غلو بلاشبہ اسلام میں جائز نہیں۔

سوال

نصاب زکوٰۃ کے تعلق سے قرآن و حدیث کی روشنی میں علما کرام و ائمہ دین کے فتویٰ سے مندرجہ ذیل سوال کی عامۃ المسلمین کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تصریح فرما کر مشکور فرمائیں:

1۔ نصاب زکوٰۃ کا تعین 7.5 تولہ سونا یا 52.5 تولہ چاندی یا ان کی مالیت کے بقدر کیش (cash) سے کیا جاتا ہے۔

عین ممکن ہے کہ گذشتہ زمانے میں 7.5 تولہ سونا کی قیمت 52.5 تولہ چاندی کے مساوی رہی ہو، لیکن فی زمانہ ان دھاتوں کی قیمت میں تقریباً 1:5 کا تناسب ہے۔

یعنی 7.5 تولہ سونا کی قیمت :1,57,500 = 7.5 x 21,000 روپئے

اور 52.5 تولہ چاندی کی قیمت :31,500 = 52.5X600 روپئے

اب تک علما کرام 52.5 چاندی یا اس کی قیمت کو ہی نصاب زکوٰۃ مقرر کرتے رہے ہیں۔ موجودہ حالات میں—

الف: 7.5 تولہ سونا کی قیمت کو نصاب کیوں نہ مانا جائے۔

ب: 7.5 تولہ سونا اور 52.5 تولہ چاندی کی قیمت کے اوسط (تقریباً 90 ہزار روپئے) کو کیوں نہ معیار تسلیم کیا جائے۔

2۔ شافعی مسلک میں استعمالی زیورات زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں، جب کہ حنفی مسلک میں استعمالی زیورات پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ موجودہ دور میں عام مسلمان کو نہ تو مسالک کا علم ہے اور نہ ہی وہ اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے شافعی مسلک کو اختیار کرنے میں کیا قباحت ہے۔

3۔ لڑکی کو بوقت نکاح اس کے والدین اور شوہر کی طرف سے زیورات جہیز یا تحفہ میں دیے جاتے ہیں اور وہ صاحب نصاب ہو جاتی ہے۔ لیکن زکوٰۃ کی ادئیگی کے لیے کسی آمدنی کے ذریعے کا مالک نہیں بنایا جاتا۔ شوہر بیوی کے سرمایہ کی زکوٰۃ کیوں دے۔ اور اگر شوہر کی آمدنی زکوٰۃ ادا کرنے کی متحمل ہو تو ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

نوٹ: متوسط کلاس میں زیور پشت در پشت چلتا ہے۔ اگر زیور فروخت کر کے زکوٰۃ دی جاتی ہے تو وہ روپیہ ایک سال میں ہی خرچ ہو جائے گا اور فیملی مفلس ہو جائے گی، نیز اپنے بچوں کی شادی کے وقت مقروض۔ ان حالت میں شرعی احکامات کیا ہیں۔

4۔ متوسط طبقہ میں مشترکہ خاندانی نظام قائم ہے۔ شادی شدہ جوڑے کے پاس نصاب کے مطابق زیور ہے، لیکن آمدنی بہت قلیل ہے۔ ضروریات زندگی کا بار بھی والدین کے ذمہ ہے۔ اس صورت میں کفالت کرنے والے ان کی زکوٰۃ بھی ادا کریں یا یہ جوڑا زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔

5۔ علی کے پاس نصاب کے مطابق کیش تھا اس نے قسط اسکیم کے تحت مکان، زمین، کار خرید لی اور کئی سال کے لیے زکوٰۃ سے بَری ہو گیا۔ دوسری طرف حسین کے پاس بھی روپیہ

ہے،لیکن وہ ایک مشت قیمت دے کر مکان، زمین، کار خریدنا چاہتا ہے۔اس کے لیے وہ ہر سال کچھ رقم پس انداز کرتا ہے۔ کیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا وہ علی کی طرح زکوٰۃ سے بَری۔(شجاع الدین،علی گڑھ)

جواب

عرض ہے کہ مذکورہ قسم کے مسائل میں محتاط طریقہ یہ ہے کہ آپ کو مروّجہ مسالک میں سے جس مسلک پر اطمینان ہو، آپ اُس پر عمل کریں۔ بالفرض آپ کو کسی مسلک پر اطمینان نہ ہو تو صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ ذاتی طور پر اپنی دریافت کے مطابق عمل کریں۔اس معاملے کو بحث کا موضوع بنانا صرف اختلاف میں اضافہ کرے گا،اور اسلام میں ہر وہ اقدام غلط ہے جو اختلاف میں اضافے کا سبب بنے (اَلْخِلاَفُ شَرٌّ)۔وہ اصلاح، اصلاح نہیں جس کا نتیجہ مزید اختلاف کی صورت میں نکلنے والا ہو۔

سوال

ہمارا ایک سوال ہے۔ وہ یہ کہ ملک کی ایک مشہور تنظیم اس وقت اتحاد مہم چلا رہی ہے۔یعنی پسماندہ طبقات کو ساتھ لے کر اور ان سے اتحاد پیدا کر کے حالات کا رخ موڑا جائے، کیا صرف پسماندہ طبقات کو ساتھ لے کر کامیابی مل سکتی ہے؟ اس سلسلہ میں آپ کی رائے جاننا چاہتے ہیں۔(عبدالعلیم قاسمی،امتیاز احمد خاں مفتاحی،عادل آباد)

جواب

اس قسم کے اتحاد کی بات بار بار کی گئی ہے اور ہر بار وہ ناکام ہوئی ہے۔اگر آپ کو تفصیل معلوم ہو تو یہ کوشش پہلے ہی دن خود اپنے اسٹیج پر ناکام ہو چکی ہے۔آپ کو معلوم ہوگا کہ عین اسٹیج کے اوپر مسلم ارکان آپس میں ٹکرا گئے۔ پھر جب خود مسلمان آپس میں متحد نہ ہوں تو دوسروں کو اتحاد کا پیغام دینا کیسے مؤثر ہو سکتا ہے۔

پچھلے سو سال کے اندر مسلمانوں نے بار بار اتحاد کانفرنسیں کی ہیں۔ مگر وہ سب کی سب بے نتیجہ رہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اتحاد جلسوں اور تقریروں سے قائم نہیں ہوتا۔ اُس کے لیے کچھ اور زیادہ گہرے اسباب درکار ہیں۔ مثلاً مسلمانوں میں اختلاف کو برداشت کرنے کا مزاج، دوسرے طبقات میں یہ احساس کہ مسلمانوں کے ساتھ متحد ہو کر انہیں کوئی بڑا فائدہ مل سکتا ہے۔ اتحاد کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اُس کے حق میں گراؤنڈ ورک، وغیرہ۔

اتحاد کے حق میں ابھی تک اس قسم کے موافق اسباب موجود نہیں۔ ایسی حالت میں اتحاد کی بات اُسی طرح ایک خیالی شاعری ہے جیسا کہ اس سے بہت پہلے اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے　　　　نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

سوال

میں الرسالہ مشن سے وابستہ ہوں اور اُس سے پورا اتفاق رکھتا ہوں۔ اِس موضوع پر اکثر لوگوں سے بحث ہوتی رہتی ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اِس قسم کا بیان درست ہے کہ ”الرسالہ مشن کے لوگ حق پر ہیں اور مثلاً جماعت اسلامی کے لوگ باطل پر۔“ براہِ کرم، اِس کی وضاحت فرمائیں۔ (عبداللطیف، پاکستان)

جواب

یہ کہنا کہ فلاں شخص یا فلاں گروہ حق پر ہے اور فلاں باطل پر، یہ ہمارے مشن کی زبان نہیں۔ یہ ویلوججمنٹ (value judgement) کا طریقہ ہے، یعنی لوگوں پر شرعی حکم لگانا۔ کسی پر شرعی حکم لگانا ہمارا طریقہ نہیں۔ ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے نقطۂ نظر کو قرآن وحدیث کے حوالوں سے پیش کرتے ہیں۔ اگر کسی کو ہمارے نقطۂ نظر سے اختلاف ہے تو وہ قرآن و حدیث کے دلائل سے اِس کو رد کرسکتا ہے۔ لوگوں کے اوپر شرعی حکم لگانے کا حکم نہ ہم کو

ہے اور نہ دوسروں کو۔ بدقسمتی سے امت کے درمیان ویلوججمنٹ کا طریقہ بہت عام ہے۔

اختلاف کے بعد فوراً ہی لوگ کافر، منافق، بدنیت جیسے الفاظ بولنے لگتے ہیں۔ اِس اسلوب کا نقصان تو یقینی ہے، لیکن اِس کا فائدہ کچھ بھی نہیں۔ اِس سے لوگوں کے اندر منفی ذہن پیدا ہوتا ہے۔ امت میں اختلاف اور انتشار کا ماحول بنتا ہے۔ لوگوں کو چاہیے کہ ویلوججمنٹ کا طریقہ وہ مکمل طور پر ترک کردیں۔ انسان کے اندر سب سے زیادہ اعلیٰ صفت وہ ہے جس کو صفتِ تفکیر (thinking quality) کہا جاتا ہے۔ ہر انسان مکمل معنوں میں آزادانہ فکر کا حامل ہوتا ہے۔ انسان کی اِسی تخلیقی صفت سے اختلافِ رائے کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ انسانوں کے اندر اختلافِ رائے ہمیشہ رہا ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا، وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔

ایسی حالت میں یہ سوال ہے کہ انسان کے لیے محفوظ موقف کیا ہے، یعنی وہ موقف جس کی بنا پر وہ اللہ کے سامنے گرفت سے بچ جائے۔ میرے مطالعے کے مطابق، اِس معاملے میں محفوظ موقف یہ ہے کہ ہر آدمی اپنی فہم کی نسبت سے آزاد ہو، لیکن حکم لگانے کا حق کسی کو حاصل نہ ہو۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان کو یہ آزادی ہو کہ وہ دیانت داری (honesty) کے ساتھ جس چیز کو حق سمجھے، اُس پر قائم رہے۔ دوسرے شخص کے بارے میں اگر وہ محسوس کرے کہ اس کی رائے غلط ہے تو اِس اختلاف کی بنا پر وہ دوسرے شخص کے بارے میں حکم نہ لگائے۔ وہ اختلاف کو صرف ذہنی اختلاف کے درجے میں رکھے، وہ اس کو فیصلہ (judgement) کے درجے تک نہ لے جائے۔ یہ وہی بات ہے جس کو سیکولر علما اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> Everyone has the right to dissent, but no one has the right to pass value judgement.

سوال

مسلمان اپنے آپ کو ہندو کہلانا کیوں ناپسند کرتے ہیں؟ ہندو کوئی مذہبی شبد نہیں۔ یہ ایک جغرافی شبد ہے۔ بھارت کے جغرافیہ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ سب ہندو ہیں، ٹھیک اسی طرح جس طرح جرمنی کے جغرافیہ میں رہنے والے سب جرمن ہیں۔ اس دیش میں ہندو اور مسلمان دونوں ہندو ہیں۔ مسلمان اگر اس بات کو مان لیں تو ہمارے دیش کا سارا جھگڑا ختم ہوجائے اور یہاں سماجی امن قائم ہوجائے۔ (ایم. ایس. شرما، نئی دہلی)

جواب

جرمنی میں رہنے والے تمام لوگ اس لیے جرمن کہے جاتے ہیں کہ ان کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا لکھا ہوا ہے۔ مگر انڈیا کے کانسٹی ٹیوشن میں ایسا نہیں۔ اس کے مطابق اس ملک میں رہنے والے سب لوگ انڈین یا بھارتی ہیں۔ لہٰذا جرمن اور ہندو کے معاملہ کو یکساں کیسے بتایا جاسکتا ہے۔ اس معاملہ کی دوسری نظریاتی بنیاد یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کی قدیم کتابوں میں ایسا لکھا ہوا ہو۔ مگر جیسا کہ معلوم ہے، وید یا پُران یا گیتا میں یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ اس دیش میں رہنے والے سب کے سب ہندو ہیں۔ بلکہ ہندو کا شبد تو ان کتابوں میں موجود ہی نہیں۔ پھر آخر وہ کون سی نظریاتی دلیل ہے جس کی بنیاد پر ایسا کہا جائے۔

محض کسی کا دعویٰ اس تصور کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ ورنہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی دعویٰ کرسکتے ہیں۔ مثلاً عیسائی لوگ کہہ سکتے ہیں کہ عیسائی ان کا مذہبی نام نہیں ہے۔ ان کا اپنا اختیار کردہ نام مسیحی یا کرسچین ہے۔ عیسائی دراصل ایک جغرافی شبد ہے اور اس ملک کے رہنے والے سب کے سب عیسائی ہیں۔ اگر محض دعویٰ کافی ہو تو ہر گروہ اس قسم کا دعویٰ کرسکتا ہے۔

جہاں تک سماجی امن کا تعلق ہے، اس کا ہندونظریہ سے کوئی تعلق نہیں۔ محض کسی لفظ کے ادل بدل سے سماجی جھگڑے کا خاتمہ نہیں ہوسکتا۔ مہاتما گاندھی (وفات 1948) اور گوڈسے (وفات 1949)، دونوں اپنے کو ہندو کہتے تھے، اس کے باوجود گوڈسے نے گاندھی کو مارڈالا۔ بہار کے اونچی ذات کے ہندو اور نیچی ذات کے ہندو دونوں اپنے کو ہندو کہتے ہیں۔اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ اس قسم کے کلچرل اختلاف کو مٹانے کے بجائے اس معاملہ میں ہر ایک کوآزادی دے دی جائے۔ گروگولوالکر نے درست طور پر کہا تھا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے:

Nature abhors uniformity.

اور جب خود فطرت ہی میں فرق اور تنوع موجود ہے تو اس کو مٹانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی امن کا راز کلچرل یکسانیت میں نہیں ہے بلکہ کلچرل تنوع کوتسلیم کرنے میں ہے۔اس مسئلہ کے حل کا درست اور قابل عمل فارمولا صرف یہ ہے—ایک کی پیروی اور سب کا احترام:

Follow one and respect all.

سوال

مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے سماج میں ہم آہنگی کیسے لائی جائے؟

جواب

مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے سماج میں ہم آہنگی کیسے لائی جائے۔اس کا ایک فارمولا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے اختلافات کو بلڈوز کرکے پورے سماج کو ایک مذہب اور

ایک کلچر کا سماج بنایا جائے۔ مگر یہ کوئی فارمولا نہیں۔ کیوں کہ ایسا ہونا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ فطرت کا نظام جو خالق نے بنایا ہے وہ یکسانیت کے اصول پر نہیں بنایا بلکہ تعدد اور تنوع کے اصول پر بنایا ہے۔ یہی تعدد اور تنوع مذہبی اور تہذیبی دنیا میں بھی موجود ہے۔

یہ خالق کے تخلیقی نقشہ کا ایک حصہ ہے اور جو چیز خود خالق کے تخلیقی نقشہ کا حصہ ہو، اُس کو مٹانا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں انسانی دنیا میں مذہبی یکسانیت یا کلچرل یکسانیت کی بات کرنا اتنا ہی بے معنٰی ہے جتنا کہ مادّی دنیا کے تنوع کو ختم کر کے یکساں مادّی نظام قائم کرنے کا منصوبہ بنانا۔ اس سلسلے میں دوسرا فارمولا یہ پیش کیا جاتا ہے کہ تمام مذاہب یکساں ہیں۔ اس نظریہ کے حاملین، لوگوں کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ مختلف مذاہب میں کوئی اختلاف ہی نہیں۔ اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ وہ فرق اور اختلاف کے ذہن کو ختم کر دیں، اس طرح اپنے آپ اتحاد قائم ہو جائے گا۔ یہ بات بھی سراسر بے معنٰی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مختلف مذہبوں اور مختلف تہذیبوں میں فرق اور اختلاف اتنا زیادہ حتمی صورت میں موجود ہے کہ کسی بھی دلیل سے اس کو غیر موجود ثابت کرنا ممکن نہیں۔ یہ فارمولا یقینی طور پر ایک غیر حقیقی فارمولا ہے۔ وہ عملی طور پر نہ کبھی ممکن ہوا اور نہ آئندہ وہ کبھی ممکن ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ فرق کوئی عیب نہیں، بلکہ وہ ایک خوبی ہے۔ وہ مذہبی فکر میں ارتقا کا ذریعہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ میں صرف ایک ہی فارمولا ہے جو مفید اور قابل عمل ہے، اور وہ فارمولا وہ ہے جو رواداری (tolerance) کے اصول پر مبنی ہے۔ اس اصول کا خلاصہ یہ ہے — ایک کی پیروی کرو اور سب کا احترام کرو:

Follow one and respect all.

سوال

میں نے کئی مذہبوں کو پڑھا ہے۔ میرا ماننا یہ ہے کہ سب مذاہب ایک ہیں۔ سب مذاہب ایک ہی سچائی کی طرف جاتے ہیں۔ آج کل لوگوں میں یہ سوچ آ گئی ہے کہ میرا ہی مذہب اچھا اور سچا ہے۔ اس کی وجہ سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سب مذاہب یکساں ہیں تو تمام جھگڑے اپنے آپ مٹ جائیں گے۔ اِس بارے میں اپنی رائے دیں۔ (گوپال شرما، نئی دہلی)

جواب

سب مذہب ایک ہیں کا نظریہ ایک غیر علمی اور غیر واقعی نظریہ ہے۔ کیوں کہ مذہبوں کے درمیان اختلاف ایک واضح حقیقت ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں خالق اور مخلوق کی علیحدگی کا تصور ہے، جب کہ ہندو دھرم میں دونوں کو ایک مانا جاتا ہے، اسی کا نام ادویت واد ہے۔

اسی طرح اسلام میں پیغمبر کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں خدائی اوتار کا تصور۔ اسلام میں موت کے بعد سزا اور جزا کا تصور ہے اور ہندو دھرم میں آواگمن کا تصور، وغیرہ۔ جہاں تک سماجی اتحاد کا معاملہ ہے، اس کا کوئی تعلق مذہبی اتحاد سے نہیں۔

ساری تاریخ بتاتی ہے کہ بار بار ایک مذہب کے لوگ آپس میں لڑتے رہے ہیں مثلاً کورو اور پانڈو دونوں ہندو تھے۔ اس کے باوجود ان میں زبردست جنگ ہوئی۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں عیسائی قومیں ایک دوسرے کے خلاف لڑیں۔

پاکستان اور بنگلہ دیش کی 1971 کی جنگ یا افغانستان کی موجودہ جنگ میں دونوں فریق مسلمان ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اختلاف ایک فطری چیز ہے، وہ زندگی کا لازمی حصہ ہے۔

اختلاف انسانوں کے درمیان ہر حال میں باقی رہتا ہے، وہ کسی بھی صورت میں ختم نہیں ہوتا۔ ایسی حالت میں اتحاد اور امن کی حقیقی بنیاد صرف ایک ہے، اور وہ ہے اسپرٹ آف ٹالرینس۔

ہمیں لوگوں کے اندر ٹالرنس اور باہمی احترام کا مزاج پیدا کرنا چاہیے۔ نہ کہ بے فائدہ طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں کہ تمام مذاہب ایک ہیں۔ انسانوں کے درمیان اتحاد کا تعلق خود انسان کے اپنے مزاج سے ہے، نہ کہ کسی قسم کے خارجی نظریہ سے۔

سوال

میں تقریباً بیس سال سے الرسالہ کا قاری تھا۔ میں اس کو بہت پسند کرتا تھا اور اپنے دوستوں کو پڑھواتا تھا۔ مگر اب میں نے الرسالہ کو پڑھنا چھوڑ دیا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ حال میں اردو اخبارات میں، میں نے آپ کے بارے میں کچھ مضامین پڑھے۔ ان مضامین اور رپورٹوں میں آپ کے بارے میں ایسی باتیں بتائی گئی تھیں جو درست نہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ بی جے پی کی حمایت کرتے ہیں، آپ پردہ کو ضروری نہیں سمجھتے، وغیرہ۔

آپ کو میں نے کئی خط لکھے مگر آپ کا عجیب حال ہے کہ آپ لمبے خط کا جواب چند سطروں میں دیتے ہیں۔ اگر کئی سوال ہیں تو آپ ایک شاطرانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ یعنی کمزور اعتراض کا جواب دینا اور طاقتور اعتراض کو چھوڑ دینا۔

آپ کے اخلاص پر مجھ کو شک ہو گیا ہے۔ آپ کی نیت مشتبہ نظر آتی ہے۔ آپ دین کے نام پر دنیا کمانا چاہتے ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ آپ میری ان باتوں کا جواب دیں گے۔ مگر الرسالہ کو پڑھنا تو میں نے بند کر دیا ہے۔ (ایک قاری الرسالہ، اکتوبر 2004)

جواب

اس طرح کے کئی خط ہم کو ملے ہیں۔ یہ ایک خطرناک علامت ہے۔ اختلاف ایک فطری

چیز ہے۔مگر قرآن کے الفاظ میں، اختلاف خواہ کتنا ہی شدید ہو آدمی کو عدل سے ہر گز نہیں ہٹنا چاہیے اور اختلاف کے معاملہ میں عدل یہ ہے کہ صرف ثابت شدہ بات پر تنقید کی جائے۔ ناقد جب تک کامل تحقیق کے بغیر پوری بات نہ جان لے اس کو ہر گز تنقید نہیں کرنی چاہیے۔

مثلاً اخباری مضامین اور رپورٹوں کی بنیاد پر میرے خلاف رائے قائم کرنا سراسر عدل کے خلاف ہے۔ میرے بارے میں کوئی رائے میری خود اپنی تحریروں کی بنیاد پر قائم کرنا چاہیے، نہ کہ اخباری رپورٹوں کی بنیاد پر۔ کیوں کہ یہ ایک معلوم بات ہے کہ اخبارات عام طور پر کسی کی بات کو بگڑی ہوئی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔مثلاً اخبارات اور میڈیا عام طور پر یہ بتاتے ہیں کہ مدرسہ اور مسجد متشددانہ تعلیم کا مرکز ہیں، حالانکہ یہ درست نہیں۔ کوئی بھی شخص جو میرے بارے میں اخبار کی بنیاد پر رائے قائم کرے وہ بلاشبہ عدل کے راستہ سے ہٹ گیا اور غیر عادلانہ تنقید خود ناقد کے لیے ایک خطرناک کھیل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ناقد کو صرف خارجی معلومات کی بنیاد پر علمی تجزیہ کرنا چاہیے۔ کسی بھی حال میں کسی ناقد کے لیے جائز نہیں کہ وہ زیر تنقید شخص کی نیت پر حملہ کرنے لگے۔ حدیث میں منافق کی پہچان یہ بتائی گئی ہے: وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 34)۔یعنی، جب اختلاف ہو تو وہ تجاوز کرنے لگے۔

اس کے مطابق، یہ منافقت کی ایک پہچان ہے کہ کسی مسئلہ پر اختلاف ہو تو آدمی علمی دلیل کی حد پر نہ ٹھہرے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ زیر تنقید شخص کی نیت اور اخلاص پر حملہ کرنے لگے۔ اس قسم کا فعل زیر تنقید شخص سے زیادہ خود ناقد کو اکسپوز کرتا ہے۔ علمی تنقید بلاشبہ ایک جائز فعل ہے، مگر تنقیص اور کردارکشی بلاشبہ حرام ہے۔

سوال

آپ اپنی تحریروں اور تقریروں میں ہمیشہ ایڈجسٹمنٹ (adjustment) کی بات کرتے ہیں، آپ دوسروں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ نزاع کے موقع پر ایڈ جسٹ (adjust) کرکے رہیں۔ مگر آپ کا اپنا عمل اس کے خلاف ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اسلامی شخصیتوں سے جب آپ کا کوئی اختلاف ہوتا ہے تو آپ فوراً ان کے خلاف تنقید شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ایڈ جسٹمنٹ کے فلسفہ کے مطابق، آپ کو ان کی تنقید یا مخالفت نہیں کرنا چاہیے۔ (ظہیر احمد صدیقی ندوی، لکھنؤ)

جواب

ایڈجسٹمنٹ (adjustment) کا تعلق عمل سے ہے، نہ کہ قول سے۔ یعنی دو آدمیوں کے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو تو اس کی وجہ سے انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے لڑنے لگیں۔ انہیں قول کے دائرہ میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے سامنے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرنا چاہیے۔ اختلاف کو عملی ٹکراؤ تک نہیں لے جانا چاہیے۔ عملی ٹکراؤ سے ہمیشہ طرح طرح کے نقصانات پیدا ہوتے ہیں۔ مگر سنجیدہ قولی اختلاف غیر معمولی فائدوں کا باعث ہے۔

اگر کسی سماج میں قولی اختلاف یا تنقید کو ختم کر دیا جائے تو ایسے لوگوں کا ذہنی ارتقا رک جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں ظالم حکمراں کے خلاف قولی اعلان کو افضل جہاد بتایا گیا ہے۔ مگر اسی ظالم حکمراں کے خلاف عملی خروج یا پُر تشدد مخالفانہ کارروائی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

اختلاف ایک آزمائش

اختلاف ایک پرچۂ امتحان ہے۔ کسی سے آپ کا اختلاف پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجیے کہ اللہ نے آپ کو ایک نازک آزمائش میں ڈال دیا تا کہ یہ جانے کہ آپ سچے مومن ہیں یا سچے مومن نہیں ہیں۔ اختلاف کو اختلاف کے دائرے میں رکھنا سچے اہل ایمان کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری کے درجے تک پہنچا دیں وہ بلاشبہ ایمان واسلام کے دائرے سے نکل گئے۔

آدمی جب اختلاف کو اختلاف کے دائرے میں رکھے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ تبادلۂ خیال کے دوران دونوں میں سے کسی کے اوپر سچائی کھل جائے اور اس طرح جو بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند تھا وہ دوبارہ صحیح راستہ پر آ جائے۔ مگر جب ایک آدمی اختلاف کو تخریب کاری تک پہنچا دے تو اس کے بعد گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے سوا کوئی انجام اس کے لیے باقی نہیں رہتا۔ ایسے آدمی کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ وہ دلیل اور الزام تراشی کے فرق کو سمجھنے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ وہ منصفانہ اختلاف کی حد سے گزر کر ظالمانہ اختلاف کے دائرے میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی پکڑ کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی انا (ego) کو رہنما بنا لیتا ہے۔ اب اس کا مقصد حق کو قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی ذات کو قائم کرنا اس کا اول وآخر مقصد بن جاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر پوری طرح شیطان کی گرفت میں آ جاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اختلاف کو تخریب کاری بنانا سراسر ظالمانہ فعل

ہے۔ جولوگ اختلاف کو تخریب کاری بنائیں ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آجائیں۔ عین ممکن ہے کہ آخرت میں ان سے کہہ دیا جائے کہ آج تم نے دنیا کی زندگی میں شیطان کو اپنا رہنما بنایا۔ اب آخرت کی خدائی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔

اختلاف کے وقت عدل پر قائم رہنا آدمی کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے، اور اختلاف کے وقت عدل وانصاف سے ہٹ جانا آدمی کو جہنم کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔

حکمتِ اختلاف

اختلاف کو انسانی زندگی سے ختم کرنا ممکن نہیں۔ اس دنیا میں کوئی بھی سماج فرق و اختلاف سے خالی سماج نہیں۔ پیدائش کے اعتبار سے، ہر مرد مسٹر ڈفرنٹ ہوتا ہے اور ہر عورت مس ڈفرنٹ۔ یہ فرق و اختلاف خود خدا کے تخلیقی نقشہ کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ایسی حالت میں قابلِ عمل صورت صرف یہ ہے کہ اختلاف کے ساتھ ایڈجسٹمنٹ کا اصول اختیار کیا جائے، نہ کہ اس کو مٹانے کا۔ فطرت کے اس اصول کا تعلق مذہبی معاملہ سے بھی ہے اور سیکولر معاملہ سے بھی۔ یہ فرق و اختلاف کوئی برائی نہیں، بلکہ وہ ترقی کے لیے زینے کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کے مطابق، صلح بہتر ہے۔ صلح کیا ہے — اختلاف کو مٹانے پر زور نہ دینا بلکہ اختلاف کو گوارا کرتے ہوئے بہتر تعلقات کو برقرار رکھنے کی کوشش کرنا۔ دوسرے الفاظ میں ”اختلاف کے باوجود اتحاد“۔ یعنی رائے کی سطح پر اختلاف، سماج کی سطح پر خوش گوار تعلق۔ یہی اس دنیا میں منصوبہ تخلیق کے مطابق، ترقی کا راز ہے۔

PDF

Buy

ISBN 978-93-89766-69-1

9 789389 766691

Goodword Books
CPS International